سوانح

مولانا سید محمد الحسنی رحمۃ اللہ علیہ

مؤلف

مولانا محمد ثانی حسنیؒ

اضافہ و تکمیل

محمود حسن حسنی ندوی

(نواسۂ مؤلف)

ناشر

سید احمد شہید اکیڈمی

دارِ عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

طبع اول
محرم الحرام ۱۴۳۵ھ مطابق دسمبر ۲۰۱۳ء

نام کتاب	:	**سوانح مولانا سید محمد الحسنیؒ**
نام مؤلف	:	مولانا محمد ثانی حسنیؒ
اضافہ و تکمیل	:	محمود حسن حسنی ندوی
صفحات	:	۳۴۴
کمپوزنگ	:	محمد اسحٰق ندوی
قیمت	:	

باہتمام: محمد نفیس خاں ندوی

ملنے کے پتے :

☆ ابراہیم بک ڈپو، مدرسہ ضیاء العلوم میدان پور رائے بریلی
☆ مکتبہ ندویہ، دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ ☆ الفرقان بکڈپو، نظیر آباد، لکھنؤ
☆ مکتبۃ الشباب العلمیۃ الجدیدۃ، ندوہ روڈ لکھنؤ

ناشر :

سید احمد شہیدؒ اکیڈمی

دارِ عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی (یوپی)

فہرس

عرض ناشر ۱۱
مقدمہ ۱۳
تعارف ۲۰

باب اول
خاندان اور سلسلۂ نسب

دادھیال ۳۲
مولانا سید عبد العلی نصیر آبادی ۳۵
مولانا سید فخر الدین ۳۷
مولانا حکیم سید عبد الحی (سابق ناظم ندوۃ العلماء) ۳۸
والد ماجد مولانا ڈاکٹر سید عبد العلی حسنیؒ ۴۳
عم مکرم مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندوی ۴۸
نانیہال ۵۵
مولانا سید ابو القاسم ۵۶
مولانا شاہ عبد السلام ہنسوی ۵۶
مولانا سید سراج الدین ۵۷
مولانا سید عبد العزیز ۵۸
مولانا سید ابو القاسم حسینی واسطی ۵۸
والدہ ماجدہ ۶۲

باب دوم
ولادت سے علمی فضیلت تک

ولادت ۶۴
ماں باپ کی توجہ اور تربیت کا آغاز ۶۷
بچپن کے تفریحی مشاغل ۶۸

علماء ومشائخ کی خدمت میں ۶۹
نشو ونما ۷۱
حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی نظر شفقت والتفات ۷۳
تسمیہ خوانی ۷۵
ایک بڑا حادثہ ۷۵
تعلیمی دور ۷۷
حروف شناسی ۷۷
ابتدائی تعلیم ۷۷
حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی زیارت وخدمت اور عقیدت ومحبت ۷۸
ترجمہ قرآن مجید ۷۹
بنیادی نصاب تعلیم ودرس ۸۰
ترجمہ ریاض الصالحین ۸۲
انشاء اور تعبیر ۸۳
ادب ونحو وصرف اور فقہ ۸۳
اردو وانگریزی ۸۵
علمی وادبی سرگرمیوں کا نقطہ آغاز ۸۵
اعلیٰ تعلیم اور حدیث کی تکمیل ۸۷
فکری ادبی اور تاریخی کتابوں کا مطالعہ ۸۸
مولانا محمد اویس صاحب نگرامی ندوی کا ایک صائب مشورہ ۸۸
غیر مرتب نظام درس اور صرف ونحو سے استغناء کے باوجود علمی فضیلت ۸۹
رسائل وجرائد کا مطالعہ اور مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی کے بعض رسائل کا ترجمہ . . . ۹۴
اردو تعلیم اور مطالعہ کتب ۹۸
رسالے اور ماہنامے ۱۰۱
مختلف علوم کی کتابیں ۱۰۲
شعر وسخن ۱۰۳
اسلوب اور فکر ونظر میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے ثنی ۱۰۴

باب سوم

تکمیل علوم سے وفات تک

تکمیل علوم کے بعد.. ۱۰۵
ایک اولوالعزمانہ اقدام.. ۱۰۶
مشائخ عصر کی خدمت میں.. ۱۱۰
شادی.. ۱۱۰
ماہنامہ ''رضوان'' اور محمد میاں کا کردار.. ۱۱۲
بچہ کی ولادت.. ۱۱۳
ایک سخت مرض کا حملہ.. ۱۱۴
عظیم خاندانی حادثہ.. ۱۱۴
دیوبند کا سفر اور حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی خدمت میں.. ۱۱۶
عام الحزن.. ۱۱۸
تبلیغی کام سے دلچسپی اور علمی مشغولیتیں.. ۱۱۸
ایک مجلس کا انعقاد اور تنظیمی کام کا آغاز.. ۱۲۱
چند دن مطب میں.. ۱۲۱
والد ماجد ڈاکٹر سید عبد العلی صاحبؒ کا انتقال.. ۱۲۴
مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کا اظہار تعلق.. ۱۲۶
تنہائی کی ایک رات.. ۱۲۷
جائیداد کی دیکھ بھال، مطب اور دواخانہ کی ذمہ داری.. ۱۲۸
حضرت مولانا عبد القادر رائے پوری سے تعلق اور آخری حاضری.. ۱۳۰
''تعمیر حیات'' کا اجراء.. ۱۳۲
پہلی تصنیف ''سیرت مولانا محمد علی مونگیریؒ''.. ۱۳۵
گجرات کا ایک سفر.. ۱۳۶
سفر حجاز.. ۱۳۷
حج.. ۱۴۰
سیدہ خیر النساء بہتر صاحبہ کا سانحۂ وفات.. ۱۴۱

دوسرا سفر حجاز.................... ۱۴۱
مدرسہ ضیاء العلوم کی نظامت.................... ۱۴۲
حجاز مقدس کا تیسرا اور آخری سفر.................... ۱۴۳
ندوۃ العلماء کا پچاسی سالہ جشن تعلیمی.................... ۱۴۵
ایک خاندانی صدمہ.................... ۱۴۷
پہلی عربی تصنیف "الاسلام الممتحن".................... ۱۴۸
"السیرۃ النبویۃ" کا ترجمہ "نبی رحمت".................... ۱۵۰
پاکستان کا دوسرا سفر اور ایشیائی کانفرنس میں شرکت.................... ۱۵۱
مشہور محدث شیخ عبد الفتاح ابوغدہ کی ندوۃ العلماء تشریف آوری اور محاضرات. . ۱۵۴
انابت الی اللہ.................... ۱۵۵
ایک یادگار مکتوب.................... ۱۵۶
دو اہم سفروں سے معذرت.................... ۱۵۹
ایک قلمی شاہکار اور آخری یادگار.................... ۱۶۰
وفات.................... ۱۶۲
مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا ایک نادر اطلاعی مکتوب.................... ۱۶۷

باب چہارم

انداز نگارش، علمی وفکری ذوق اور قلمی جہاد

البعث الاسلامی اور اس کی ادارت.................... ۱۷۲
ندوۃ العلماء کا ترجمان اور تحریک ندوۃ العلماء کا آرگن.................... ۱۷۷
قلمی جہاد اور غیرت ایمانی، حق گوئی و بیباکی.................... ۱۸۰
عربوں کا احتساب.................... ۱۸۱
اکابرین ومعاصرین کا اعتراف.................... ۱۸۴
جدید افکار ونظریات کا مقابلہ.................... ۱۹۰
حقیقت پسند کون؟.................... ۱۹۱
عرب قومیت کی دعوت پر تنقید.................... ۱۹۶
مغربی فکر وتہذیب پر تنقید.................... ۱۹۹

جدید تہذیب اور اسلامی تہذیب کا فرق ۲۰۱
سیرت نبوی کی لامحدود نافعیت ۲۰۲

باب پنجم

دینی، علمی، سیاسی اور رفاہی تحریکات سے وابستگی

تحریک دعوت وتبلیغ ۲۰۴
ایک پر کیف تبلیغی سفر ۲۰۷
مولانا محمد یوسف کاندھلوی سے تعلق اور ایک مؤثر تحریر ۲۰۹
رابطہ عالم اسلامی ۲۱۵
"جامعة البعث الاسلامی" کا تصور ۲۱۸
تحریک پیام انسانیت سے وابستگی ۲۲۰
دینی تعلیمی کونسل ۲۲۱

باب ششم

تحریک ندوۃ العلماء

تحریک ندوۃ العلماء کی ترجمانی ۲۲۶
ندوہ کا نصاب ونظام تعلیم ۲۲۹
نشر وتحقیق کے ادارے اور ان کا کام اور مقصد ۲۳۲
مجلس تحقیقات شرعیہ ۲۳۳
مجلس تحقیقات ونشریات اسلام ۲۳۴
البعث الاسلامی اور تعمیر حیات کا اجراء ۲۳۴
ترانہ ندوہ ۲۳۵
جشن ندوۃ العلماء ۲۳۷

باب هفتم

تصنیفات، رسائل اور ترجمے

کتب ورسائل کا ایک جائزہ ۲۴۵
عربی مؤلفات ۲۴۵

الاسلام الممتحن.......... ۲۴۵
المنهج الاسلامی السلیم.......... ۲۴۷
اضواء علی الطریق.......... ۲۴۸
الی القیادة العالمیة.......... ۲۴۸
مصر تتنفس.......... ۲۴۸
همسات الی جزیرة العرب.......... ۲۴۸
الاسلام بین لا ونعم.......... ۲۴۹
ندوة العلماء تواجه التحدی الکبیر.......... ۲۴۹
صور واوضاع.......... ۲۴۹
عربی ترجمے.......... ۲۴۹
بین الصورة والحقیقه.......... ۲۴۹
فضل البعثة المحمدیه علی الانسانیه.......... ۲۴۹
العالم الاسلامی بین التبعیة والذاتیة.......... ۲۵۰
شهداء بالاکوت یتکلمون.......... ۲۵۰
مکانة الصلوٰة فی الاسلام.......... ۲۵۰
اردو تصانیف.......... ۲۵۰
سیرت مولانا محمد علی مونگیریؒ.......... ۲۵۰
تذکرہ حضرت سید شاہ علم اللہ حسنی رائے بریلویؒ.......... ۲۵۱
روداد چمن.......... ۲۵۲
سوانح حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ.......... ۲۵۵
قرآن آپ سے مخاطب ہے.......... ۲۵۵
جادۂ فکر وعمل.......... ۲۵۵
مرتب کردہ کتابیں.......... ۲۵۶
پاجا سراغ زندگی.......... ۲۵۶
حدیث پاکستان.......... ۲۵۶
اردو تراجم.......... ۲۵۷

نبی رحمت ۲۵۷
ارکان اربعہ ۲۵۸
تزکیہ واحسان یا تصوف وسلوک ۲۵۹
جب ایمان کی باد بہاری چلی ۲۵۹
عالم عربی کا المیہ ۲۵۹
تحقیق وانصاف کی عدالت میں ایک مظلوم مصلح کا مقدمہ ۲۶۰
طوفان سے ساحل تک ۲۶۱

باب ہشتم

امتیازات وخصوصیات، اوصاف وکمالات

تزکیہ ۲۶۲
حسن اخلاق ۲۶۳
تواضع ۲۶۳
حمیت وغیرت ۲۶۴
معاملہ فہمی ۲۶۴
محبوبیت ۲۶۵
اخلاص وتقویٰ ۲۶۵
ایمانی فراست ۲۶۶
ہمدردی وخیر خواہی ۲۶۷
دل سوزی اور بے باکی ۲۶۷
شرافت ومروّت ۲۶۸
ایک منظوم تأثر ۲۷۰

باب نہم

منتخبات واقتباسات کے آئینہ میں

تصحیح نیت ۲۷۴
تعلق مع اللہ اور اعتماد ویقین ۲۷۴
ایمان اور دعوت ۲۷۵

قربانی ۲۷۵

احسان.. ۲۷۶

اسلام کیا ہے؟.. ۲۷۶

سدا ایمانی ۲۷۷

مکمل اعتماد ۲۷۸

نفاذ شریعت ۲۷۸

فتح وکامرانی کی شرط اولیں ۲۷۹

مجاہدات کا میدان.. ۲۷۹

سب سے بڑا کمال ۲۸۰

باب دھم

اکابر ومعاصرین کی نظر میں

رجل موہوب ۲۸۱

. . . . حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ

جواں مرگ محمد الحسنیؒ ۲۸۶

. . . . حضرت مولانا عبدالسلام قدوائی ندویؒ

مولانا محمد میاں مرحوم.. ۲۹۱

. . . . مولانا محمد واضح رشید حسنی ندوی

صاحب تذکرہ - ایک فرشتہ نما شخصیت ۳۰۲

. . . . مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی

کچھ یادیں، کچھ باتیں ۳۱۵

. . . . مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی اعظمی

ضمیمہ

مختصر تذکرہ مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ

برادر معظم مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ ۳۲۳

. . . . بلال عبدالحی حسنی ندوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض ناشر

والد ماجد مولانا سید محمد الحسنیؒ کی وفات کو تین دہائیاں گذر چکیں، انہوں نے زندگی کی صرف چوالیس بہاریں دیکھیں، مگر ان کے اشہب قلم نے کہنہ مشق مفکرین و اہل قلم کی یاد تازہ کردی تھی، بہت سے اہل نظر کو ان کی تحریریں پڑھ کر ان کے نامور چچا مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی تحریر کا دھوکہ ہوتا تھا، اور بعض تو یہاں تک کہہ دیا کرتے تھے کہ چچا لکھتے ہیں اور بھتیجے کے نام سے چھپتا ہے۔ اللہ نے ان کو بڑا احساس اور دردمند دل عطا فرمایا تھا، امت کے مسائل پر ان کا قلم سیل رواں کی طرح چلتا تھا، نہ جانے کتنے خرمن باطل خس وخاشاک کی طرح اس میں بہہ گئے۔

اہل فکر ونظر کو ان سے بڑی توقعات وابستہ تھیں کہ اچانک ان کی وفات کا حادثہ پیش آیا جس نے سب کو ہلا کر رکھ دیا۔ (۱)

ان کی وفات کے بعد مختلف پرچوں میں مضامین لکھے گئے، مفکرین وعلماء نے اپنے اپنے درد کا اظہار کیا، جن میں تعمیر حیات کا خصوصی نمبر ایک امتیاز رکھتا ہے، جس میں منتخب مضامین شامل کیے گئے اور وہ ایک دستاویز بن گیا۔

مولانا محمد الحسنیؒ اپنے والد کے اکلوتے فرزند تھے، لیکن ان کے پھوپھی زاد بھائیوں (مولانا سید محمد ثانی حسنی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت

---

(۱) عجیب بات ہے کہ بعینہ یہی صورتحال ان کے فرزند اکبر داعی اسلام مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ کے ساتھ پیش آئی، دعوت واصلاح کے میدان میں ہردم رواں اس قافلہ کا میر کارواں چلتے چلتے اچانک رک گیا، ۱۷/ ربیع الاول ۱۴۳۴ھ کو ان کا حادثۂ وفات پیش آیا۔

برکاتہم، مولانا سید محمد واضح رشید حسنی مدظلہ) سے ان کا تعلق سگے بھائیوں سے ہرگز کم نہ تھا، اور معاملہ طرفین سے تھا، ان کی وفات سے طبعی طور پر ان کے بھائیوں کو سخت صدمہ سے دوچار ہونا پڑا، مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ چونکہ سب سے بڑے تھے اور ان کی طبیعت بھی بڑی حساس تھی، اس لیے انھوں نے سے اس حادثہ کو بہت محسوس کیا، اور اس کے بعد ہی انہوں نے والد صاحب کا تذکرہ قلمبند کرنا شروع کیا، وہ کام بڑی حد تک مکمل ہو چکا تھا، اور شاید جلد ہی منظر عام پر آتا کہ اچانک ان کی بھی وفات کا حادثہ پیش آیا۔

یہ مسودہ ان کے مخطوطات میں عرصہ تک محفوظ رہا، اس کے بعد ان کے فرزند ارجمند برادر محترم مولانا سید محمد حمزہ حسنی صاحب نے اس کو نکال کر راقم سطور کے حوالہ کیا تاکہ وہ اشاعت کے قابل بنایا جاسکے، راقم کے پاس وہ کئی سال تک محفوظ رہا، بالآخر وہ عزیز القدر مولوی سید محمود حسن حسنی ندوی کے حوالہ کیا گیا جن کو سوانح نگاری کا ذوق اپنے نانا (صاحب سوانح) سے ملا ہے۔ عزیز موصوف نے بڑی محنت سے اس کو مکمل کیا، اہم اضافے کیے، اور اس کو اشاعت کے قابل بنایا۔

میں ذاتی طور پر برادر محترم مولانا سید محمد حمزہ حسنی صاحب کا مشکور ہوں، انہوں نے یہ مسودہ اس عاجز کے حوالہ کیا، اور عزیز القدر مولوی سید محمود حسن حسنی کا بھی شکر گذار اور ان کے لیے دعا گو ہوں کہ انہوں اپنے نانا کی وراثت سنبھالی اور اس کا حق ادا کیا، عم محترم حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی کی ذات شکریہ سے بالاتر ہے جن کے مقدمہ نے کتاب کی اہمیت بڑھائی، اللہ ان کو سلامت رکھے اور صحت وعافیت کے ساتھ عمر طویل عطا فرمائے۔

ہمارے جن عزیزوں نے اس سلسلہ سے محنت کی وہ سب شکریہ کے مستحق ہیں، ان میں خاص طور پر عزیزی مولوی محمد نفیس خاں ندوی قابل ذکر ہیں، جنہوں نے ہمیشہ کی طرح کتاب کی تصحیح کا کام کیا، اور اشاعت کا بیڑا اٹھایا، اللہ تعالیٰ سب کو جزائے خیر عطا فرمائے، اور کتاب کو نافع ومقبول فرمائے۔

بلال عبدالحی حسنی ندوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی
(ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

الحمد لله رب العالمين ، و الصلاة و السلام على سيد المرسلين خاتم النبيين سيدنا محمد ، و علىٰ آله و صحبه و علىٰ من تبعهم بإحسان و دعا بدعوتهم إلى يوم الدين ، أما بعد :

مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی صاحبؒ جو ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب حسنیؒ اور مولانا سید ابوالحسن علی صاحب حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہم کے والد ماجد تھے، اپنی سنجیدہ اور عملی زندگی کے طرز میں امتیازی حیثیت رکھتے تھے، اور انہوں نے اپنے والد اور دادا سے علمی و دینی مزاج ورثہ میں پایا تھا، ان کے والد مولانا حکیم سید فخر الدین حسنیؒ ایک بزرگ شخصیت ہونے کے ساتھ ساتھ تاریخ نویسی کے موضوع پر اور اپنے ادبی ذوق کے لحاظ سے اپنے ہمسروں میں ممتاز تھے، ان کی تربیت میں مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب کی تعلیم و تربیت ہوئی تھی، اور وسعت ذہنی کی بنیاد پر انہوں نے اپنے عہد کے کبار علماء سے فیض اٹھایا تھا، اور پیشہ کے لحاظ سے طب کو اختیار کیا تھا، اس طرح ان کی زندگی میں ان کے تین پہلو نمایاں ہوئے تھے، ایک تو تاریخ نویسی اور ادبی ذوق کا محتاط مزاج، دوسرے دینی خصوصیات میں بزرگانہ صفات اور تیسرے طب میں تشخیص و

علاج میں امتیاز۔ ان تینوں پہلوؤں کو انہوں نے جمع کیا تھا اور مزاج میں سنجیدگی، ہمدردی اور نرم خوئی تھی، اس کے سبب ان کو اپنے ہمسر علماء میں اعتماد حاصل ہوا، اور امت کے عملی و انتظامی معاملات میں بھی ان کو اہمیت دی گئی، اور انہوں نے اس اہمیت کا حق بھی ادا کیا۔

ندوۃ العلماء کی تحریک ان کے شباب کے زمانہ میں شروع ہوئی تھی، اور ملک کے اس وقت کے مقتدر علماء اور ملت کے خیر خواہان نے ندوۃ العلماء کی تعلیمی تحریک کو پسند کیا اور تائید کی، اس کو عمل میں لانے کے سلسلہ میں کوشش شروع ہوئی، اس میں مولانا سید عبدالحی صاحب کو بھی نمایاں حصہ ملا، اور وہ اس ادارہ کے مددگار ناظم اور پھر ناظم منتخب ہوئے۔ ان کی نظامت کے زمانہ کر رہا ہے۔

مولانا سید عبدالحی صاحب نے اپنے متوازن اور معتدل مزاج اور طریقۂ کار کے مطابق اپنے خاندانی تعلق والوں کی اصلاح و تربیت کے معاملہ میں بھی جو بہتر رویہ ہوسکتا ہے وہ اختیار کیا، اور اولاد کے سلسلہ میں دین و دنیا کی جامعیت کا خصوصی رجحان پیدا کیا، اور اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کے اخلاف میں ایک طرف تو ادب کا ستھرا ذوق قائم ہوا اور دوسری طرف تاریخی مطالعہ اور شریعت کی پابندی کا پختہ مزاج بنا۔ ان کو ادب، تاریخ اور حدیث کے موضوعات سے بڑا اشتغال تھا، چنانچہ ان کی تصنیفات میں ان تینوں دائروں کے لحاظ سے ان کی خصوصیت ظاہر ہوئی۔ توازن اور دینی پختگی کا مزاج عملی شکل میں ان کے بڑے بیٹے ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب کے یہاں پوری طرح ظاہر ہوا، انہوں نے علوم دینیہ کے حصول میں ان کے عہد میں جو بہتر سے بہتر نظام تھا، اس سے فائدہ اٹھایا، اور ان کو دینی علوم میں علامہ انور شاہ کشمیریؒ سے شرف تلمذ بھی حاصل ہوا تھا، اور اس سے انہوں نے پورا فائدہ اٹھایا، پھر طب و حکمت کی لائن میں جس کو اختیار کرنا اس زمانہ کے علماء کا عام طریقہ تھا، اپنے کو بڑھایا اور طب جدید (ایلوپیتھک) کو بھی اختیار کیا، اور اس کی اعلیٰ ڈگری یونیورسٹی سے حاصل کی۔

ان کی خصوصیت یہ رہی کہ میڈیکل لائن میں یونیورسٹی کے زمانۂ طالب علمی میں علماء ہی کے لباس اور وضع قطع میں اور نمازوں کی پوری پابندی کے ساتھ وقت گزارا، جو اس ماحول میں ایک بڑے تعجب کی بات سمجھی جاتی تھی۔ نصف ساق تک پائجامہ اور نری کا جوتا استعمال کیا، اور اس پر تاحیات قائم رہے۔ جدید صفت کا جوتا انہوں نے کبھی استعمال نہیں کیا، اور طبیعت میں متانت، کم گوئی اور دینی تعلیمات کی پابندی ان کی سیرت کا نمایاں پہلو تھا۔ ان کو مولانا عبدالباری صاحب ندوی جو حضرت تھانوی کے خلیفہ بھی تھے اور حضرت تھانویؒ کے طریقۂ تربیت و اصول زندگی کے سخت داعی اور پابند تھے، اور ریٹائرڈ ہونے کے بعد حیدرآباد سے لکھنؤ واپس آکر لکھنؤ میں مکین ہوگئے تھے، اور ایک ہی شہر میں ہونے کے تعلق سے ڈاکٹر صاحب سے ان کا ربط وضبط ہوگیا تھا، وہ ڈاکٹر صاحب کو انسانوں میں ''فرشتہ'' قرار دیتے تھے اور ان کی خوبیوں کے بہت زیادہ قائل تھے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے چھوٹے بھائی کے سلسلہ میں تربیت کا اپنا وہی مخصوص طریقہ اختیار کیا، ان کے یہ بھائی مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی تھے جو ان سے ۲۱ سال چھوٹے تھے، اور اس فرق کی بنا پر والد کے انتقال کے بعد ان کے لئے والد کی جگہ پر تھے، ڈاکٹر صاحب نے ان کی بڑی فکر رکھی، اور دوسری طرف مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب کی والدہ بڑی بزرگ اور دین کے معاملہ میں سخت رویہ رکھنے والی تھیں، مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کو ان دونوں کی تربیت ملی جس کے اثرات بعد میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی زندگی میں ان کے حالات سے واقفیت رکھنے والے سمجھ سکتے ہیں۔

مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب کی اولاد میں شروع میں ایک بیٹا پیدا ہوا تھا جس کا انتقال بچپنے میں ہی ہوگیا تھا، اس کے بعد پندرہ بیس سال تک ان کی اولاد میں صاحبزادیاں پیدا ہوئیں جن کو انہوں نے گھر کے دائرہ میں تعلیم دی اور پھر پندرہ سولہ

سال کے بعد ان کے یہاں ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نام نامی کی برکت کے حصول کے لئے ''محمد'' رکھا، ان کی تربیت اور تعلیم میں بھی انہوں نے اپنا ہی طریقہ اختیار کیا، اور رواجی رسمی طریقوں کو نہیں اپنایا، اس طریقہ سے وہ اپنے والد کے تربیتی قالب میں ڈھلے اور بڑھے، اور ان میں بھی متانت، علم سے اشتغال، ادبی ذوق اور دینی فکر وخیال کی بہتر صفات پیدا ہوئیں۔

ڈاکٹر صاحب نے ان کو کہیں امتحان نہیں دلوایا، اور نہ ہی کسی اسکول و کالج میں داخلہ دلا کر دنیاوی معیشت کی لائن ڈاکٹر یا انجینئر یا اسی طرح کے دوسرے کام کے لئے تیار کیا، بلکہ دینی اور وقت کے تقاضے کے لحاظ سے جو علمی وادبی صلاحیت ضروری سمجھی صرف اسی پر اکتفا کیا۔ علوم دینیہ اور ادب عربی کی صلاحیت پیدا کرنے اور اس کو بہتر بنانے کے لئے جن تدابیر کی ضرورت تھی ان کو اختیار کیا، چنانچہ اس تربیت کا یہ نتیجہ سامنے آیا کہ وہ ایمان کے تقاضوں کو سمجھنے والے اور امت کو درپیش مسائل اور معاملات کی سمجھ رکھنے والے، اور اپنی ادبی وتحریری صلاحیتوں سے امت کی تقویت اور اس کو خطرات سے بچانے کے لئے جو ان کی صلاحیت میں تھا وہ کرتے رہے۔ وہ اپنے چچا مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی علمی خصوصیات وطریقۂ دعوت سے متاثر تھے، اور ان ہی کی راہ کو اپنانے کی کوشش کی، اور ان ہی کے طرز پر کام کیا، اور انہوں نے ان کے کام میں شرکت کی۔

انہوں نے ندوۃ العلماء سے خصوصی فائدہ اٹھایا، اور پھر با صلاحیت بننے پر ندوۃ العلماء کو بھی اپنی صلاحیتوں سے فائدہ پہونچایا، لیکن مدت حیات جس کی بھی ہو، اللہ تعالیٰ کے یہاں سے پہلے ہی سے مقدر ہوتی ہے، جس کی مصلحتیں خالق کون ومکان ہی کو معلوم ہوتی ہیں، محمد میاں حسنی کی عمر کم ہوئی، انہوں نے ۱۹۷۹ء کے وسط میں انتقال کیا جب کہ ان کی عمر کے صرف ۴۴ سال گذرے تھے، جس میں انہوں نے جو کام انجام دیئے وہ اس عمر سے زیادہ کے تھے۔ ان کے کام اور طریقۂ کار اور افادیت کو دیکھتے

ہوئے ان کے انتقال کو بڑا خسارہ سمجھا گیا اور خاص طور پر ان کے چچا مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو ان کو جانشیں ہونے کا خیال کیا تھا، اور وہ ان کے بڑے اچھے نائب بلکہ ہم مزاج تھے، بہت صدمہ محسوس کیا، وہ خاندان میں بھی بہت مقبول تھے، اس طرح سب نے ہی ان کی وفات کو بڑا نقصان محسوس کیا۔

مرحوم نے اپنے پیچھے تین صاحبزادے چھوڑے جنہوں نے اپنے والد ہی کے نقش قدم پر اپنے کو آگے بڑھایا اور اپنے کو علمی و دعوتی کام کے ساتھ وابستہ کیا، اور اس سلسلہ کی اپنی صلاحیتوں کو ترقی دی، اور اس طرح دین و امت کی نصرت کو مقصد عمل بنا کر کام کر رہے ہیں، جو ان کے والد رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے آتے تو ان کو بڑی مسرت ہوتی اور امت کی تقویت کی جو ان کی فکر تھی، اور اس کے لئے وہ جو کوشش کرتے تھے، اس کے عین مطابق محسوس کر کے بہت انشراح محسوس کرتے۔ ان کے یہ صاحبزادگان جن میں بڑے عزیزی مولوی سید عبداللہ محمد الحسنی ندوی، پھر عزیزی مولوی حافظ عمار محمد عبدالعلی حسنی اور عزیزی مولوی سید بلال عبدالحی حسنی ندوی ہیں، دینی، فکری اور دعوتی مقاصد کی انجام دہی میں اچھے طریقہ پر خدمت انجام دے رہے ہیں۔

ان میں مولوی سید عبداللہ حسنی ندوی سلمہ اللہ نے دعوتی مقصد میں زیادہ مشغولیت اختیار کی ہے، اور دار العلوم ندوۃ العلماء میں حدیث کی تدریس کی خدمت بھی انجام دے رہے ہیں۔ اور مولوی سید بلال عبدالحی حسنی فکری اور علمی کاموں کو آگے بڑھانے میں اپنی صلاحیت صرف کر رہے ہیں، اور ضیاء العلوم رائے بریلی میں حدیث شریف کی تدریس کا کام بھی کر رہے ہیں۔ انہوں نے رائے بریلی کے قیام کے تعلق سے مولانا سید ابوالحسن علی ندی کے آخری دور میں ان سے بہت زیادہ وابستہ رہنے کا التزام کیا اور پھر ان کی وفات کے بعد ان ہی کے رجحانات کو تقویت پہونچانے اور ان کی اشاعت کی طرف خصوصی توجہ دے رہے ہیں، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے نام پر ایک تربیتی سینٹر بھی قائم کیا ہے جس سے مدارس کے فارغین کو فائدہ

پہونچ رہا ہے، اللہ تعالیٰ ان کے کاموں کو قبول فرمائے اور کوششوں کو مفید سے مفید تر بنائے۔ اور وہی سید احمد شہید اکیڈمی دار عرفات رائے بریلی سے اس کتاب کی اشاعت کا نظم کررہے ہیں۔

درمیانی بھائی مولوی حافظ عمار محمد عبد العلی بھی دینی و تعلیمی کام انجام دے رہے ہیں، اور ندوۃ العلماء کی لکھنؤ میں شاخ مدرسہ مظہر الاسلام بلوچ پورہ میں استاد اور ناظر و منتظم ہیں۔ بارك الله فيهم و وفقهم لما يحب و يرضى۔

مولانا سید محمد الحسنی علیہ الرحمۃ نے اپنی مختصر عمر میں جو کارہائے نمایاں انجام دئے، ان سے طالبان علم اور مدارس کے کارگزار حضرات اور دعوت و تعلیم کے کام سے وابستہ لوگ اچھا سبق حاصل کرسکتے ہیں، اس لئے ضرورت تھی کہ ان کی سوانح حیات ان کے کسی واقف کار کے قلم سے اشاعت پذیر ہوجاتی، خوشی کی بات یہ ہے کہ ان کے پھوپھی زاد بڑے بھائی مولانا سید محمد ثانی حسنی ان سے ۱۰ سال بڑے تھے، اور اسی ماحول کے تربیت یافتہ تھے، اور اچھے صاحب علم، داعی و مصلح ہونے کے ساتھ اچھے سوانح نگار تھے، ان کی وفات سے خاصے ملول و متأثر ہوئے اور اسی تأثر کے نتیجہ میں خود سے ان کی سوانح نویسی کے کام کو انجام دینے لگے، اور ان کا کیا ہوا یہ کام ان کی وفات بھی ہوجانے پر مسودہ کی شکل میں ان کے صاحبزادے جو مولانا سید محمد الحسنی مرحوم کے بھانجے بھی ہیں، مولوی سید محمد حمزہ حسنی کے پاس رکھا ہوا تھا جس کو منظر عام پر لانا ضروری سمجھا گیا۔ مسودہ کو مبیضہ کی شکل میں لانے اور مراجعت کا کام عزیزی مولوی سید محمود حسن حسنی ندوی کے سپرد کیا گیا جو مصنف کے نواسے ہیں، اور صاحب سوانح کے بھی نواسے و پوتے ہوتے ہیں کہ ان کی دادی اور نانی دونوں صاحب سوانح کی بہنیں ہیں۔

مصنف سوانح صاحب سوانح سے ایک گھر میں سے ہونے کا تعلق رکھتے تھے، چنانچہ ان کے حالات سے جو زیادہ سے زیادہ واقفیت ہوسکتی ہے ان کو حاصل تھی، اور ساتھ رہنے کی وجہ سے ان کے ساتھ شفقت بھی رکھتے تھے، اور ان سے مشورہ لیتے اور

ان کو مشورہ دیتے بھی تھے۔ عمر میں دس سال کا فرق تھا، اور عجیب بات یہ ہے کہ ان کی عمر بھی زیادہ نہ ہو سکی، ان کے انتقال سے صرف ڈھائی سال بعد ان کا بھی انتقال ہو گیا ،لیکن انہوں نے جو علمی وادبی کام کیا تھا وہ ان کے قائم مقام کے طور پر استفادہ کے لئے موجود ہے، اللہ تعالیٰ سے دعاء ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ مولانا سید محمد الحسنی رحمۃ اللہ علیہ کے یہ حالات بہت سے لوگوں کے لئے رہنما ثابت ہوں گے، اور ان کے پھوپھی زاد بڑے بھائی مولانا سید محمد ثانی حسنی جو میرے بھی بڑے اور مشفق بھائی تھے ان کی تحریری وعلمی صلاحیت سے اس سوانح کی پیشکش میں جو خوبی پیدا ہوئی ہے وہ بھی ہم سب کے لئے مفید ہوگی۔

محمد رابع حسنی ندوی
(ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

۱۸/۱۰/۱۴۲۹ھ
۱۹/۱۰/۲۰۰۸ء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تعارف☆

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على سيد المرسلين محمد وعلى آله وصحبه أجمعين ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين. أما بعد.

ایک عرصہ تک مجھے برادرزادۂ عزیز محمد الحسنی کی کتاب "الإسلام الممتحن" (۱) پر مقدمہ لکھنے کے بارے میں تردد و پریشانی رہی، حالانکہ مشہور و غیر مشہور مصنفین و ادباء کے کسی مجموعۂ مضامین یا تصنیف پر مقدمہ لکھنا میرے لیے کوئی نئی بات نہ تھی، یہاں تک کہ اس کا اندیشہ پیدا ہو گیا کہ میری مقدمہ نویسی، میری مقالہ نگاری اور تصنیف و تالیف سے بازی نہ لے جائے اور مجھے کتابوں پر مقدمہ لکھنے کے بارے میں ضرورت سے زیادہ فیاضی اور فراخ دلی کا الزام نہ دیا جانے لگے، یہ دوراز کار خدشات میرے

(☆) یہ مضمون مولانا سید محمد الحسنی مرحوم کی معرکۃ الآراء کتاب "الإسلام الممتحن" کے اس مقدمہ کا ترجمہ ہے جو اس کے پہلے ایڈیشن کے لیے ان کے چچا مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے بڑے تردد و تذبذب کے بعد کتاب کی قدر و قیمت اور اس کے اثر و طاقت سے متاثر ہو کر ادائے شہادت اور اظہار حقیقت کے طور پر سپرد قلم کیا، اردو میں اس کو مولانا صدر الحسن ندوی نے منتقل کیا، مولانا نے اس پر نظر ثانی کی اور اس کو اپنی زبان و پیرایۂ بیان میں اسی طرح ڈھالنے کی کوشش کی جس طرح ان کے عربی مضامین کا ترجمہ مولانا محمد الحسنی مرحوم کیا کرتے تھے، اب یہ ان کی شخصیت اور ان کی فکری اور تحریری خصوصیات کا ایک اچھا تعارف بن گیا ہے۔ (ناشر)

(۱) رسالہ "البعث الاسلامی" کے افتتاحیوں اور مختلف عربی مقالات کا وہ مجموعہ جس کے متعدد ایڈیشن لکھنؤ اور قاہرہ سے شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔

ذہن میں صرف اس وجہ سے پیدا ہو رہے تھے کہ میرا اور صاحب کتاب کا رشتہ ایک طرح سے باپ بیٹے اور استاذ وشاگرد کا سا ہے، اس کتاب کا مقدمہ لکھتے وقت مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا میں اپنی ہی کسی تصنیف کا مقدمہ لکھنے جارہا ہوں، جس کا یہ نتیجہ ہو سکتا ہے کہ لوگ اس کو ''اپنے منہ کی تعریف'' اظہار کمال اور خود پسندی پر محمول کریں اور یہ ایسی کمزوری ہے جس کو دین وشریعت اور اخلاق وتہذیب نے کبھی پسند نہیں کیا، اور میں خود بھی امکانی حد تک اس سے بچنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔

لیکن جب میں نے اپنے اس احساس کا حقیقت پسندانہ اور غیر جانبدارانہ جائزہ لیا اور اس کا تجزیہ کیا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں درحقیقت لوگوں کے تبصرے اور قیل و قال سے ڈر رہا ہوں، اس خوف واحساس نے اس مسئلہ کو غیر شعوری طور پر ایک اخلاقی رنگ دے دیا ہے، میں طبیعت کی اس کمزوری کو ایک اخلاقی کمزوری سمجھ رہا ہوں، میں نے محسوس کیا کہ اگر میں نے اس جذبہ واحساس کے سامنے سپر ڈال دی اور اس خوف سے ایک قابل قدر کتاب کا مقدمہ لکھنے سے باز رہا کہ وہ میرے ایک خورد اور عزیز کی کتاب ہے، تو میں ایک خیالی اخلاقی کمزوری سے بچنے کے لیے ایک حقیقی اخلاقی کمزوری اور کوتاہی کا ارتکاب کروں گا، اس لیے کہ قرآن کی اخلاقی تعلیمات جہاں اعزہ واقارب (اگر وہ برسر باطل ہوں) کے خلاف شہادت دینے کو ضروری قرار دیتی ہیں، وہیں ان اعزہ واقارب کے حق میں (اگر وہ برسر حق ہوں) شہادتِ دینے کو بھی واجب گردانتی ہیں، قرآن مجید میں جہاں یہ فرمایا گیا ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَى أَنْفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ﴾ (النساء/ ۱۳۵) (اے ایمان والو! انصاف کے علمبردار بنے رہو اور اللہ کے گواہی دینے والے بنو، خواہ یہ گواہی تمہاری اپنی ذات، ماں باپ اور عزیزوں کے خلاف پڑے)، وہیں اللہ تعالیٰ کا یہ بھی ارشاد موجود ہے: ﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَى أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ، إِنَّ

اللّٰہَ نِعِمَّا یَعِظُکُمْ بِہٖ، اِنَّ اللّٰہَ کَانَ سَمِیْعاً م بَصِیْراً﴾ (النساء/۵۸) (اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کی امانتیں ان کے حوالے کردیا کرو اور جب لوگوں میں فیصلہ کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو، اللہ تمہیں بہت خوب نصیحتیں کرتا ہے، بیشک اللہ خوب سنتا اور خوب دیکھتا ہے)۔

اس تربیتی گہوارہ کی کہانی جس میں صاحب کتاب کی شخصیت کے فکری وتخلیقی عناصر پروان چڑھے، وہ تہذیبی، تمدنی اور نفسیاتی رنگارنگی جو انہیں خاندان اور معاشرہ سے ملی، وہ ہمت شکن اور روح فرسا واقعات جن سے عالم اسلام دوچار ہوا اور جن کی آنچ مصنف کو بھی پہنچی اور عالم اسلام کی مسرت وغم کا حصۂ رسدی اس کو بھی ملا، ان کے اثرات کا پورا اندازہ اور مصنف کی ذہنی پرداخت میں ان کا تاریخی عمل وہی سمجھ سکتا ہے اور اس کہانی کو امانت ودرایت کے ساتھ وہی بیان کرسکتا ہے جس کے سامنے یہ واقعات ہوں، اور مصنف کے ماحول، تعلیم وتربیت اور اندرونی جذبات ومحرکات سے زیادہ سے زیادہ اور ذاتی طور پر واقف ہو۔

صاحب کتاب کی پیدائش ایسے ماحول میں ہوئی جو اس بات پر یقین کامل رکھتا تھا کہ اسلام اللہ کا آخری اور ابدی پیغام ہے، سعادت وکامرانی کا یہی واحد ذریعہ ہے اور اس کے علاوہ جتنے راستے ہیں وہ منزل تک پہنچانے والے نہیں ہیں، اس دین کی حیثیت انسانیت کے لیے وہی ہے جو سفینۂ نوح کی اس وقت کی نسل انسانی کے لیے تھی کہ صرف وہی ہلاکت سے بچ سکتا تھا جو اس کشتی پر پناہ لے، باقی جس نے اس سے بے نیازی ظاہر کی اور کسی پہاڑ کا سہارا لیا اس کا انجام پسر نوحؑ کا انجام تھا، جس نے کہا کہ "سَاٰوِیْ اِلٰی جَبَلٍ یَّعْصِمُنِیْ مِنَ الْمَآءِ" (میں ایسے پہاڑ کی پناہ لوں گا جو مجھے اس طوفان سے بچالے گا) حضرت نوح علیہ السلام کا جواب تھا "لَا عَاصِمَ الْیَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰہِ" (آج اللہ کے اس حکم سے کوئی بچانے والا نہیں) نتیجہ یہی نکلا کہ وہ اس غضب ناک طوفان کی نذر ہوگیا۔

اس ماحول کا ایمان تھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ''دانائے سبل، مولائے کل، ختم الرسل'' ہیں، عربوں کا مستقبل اسلام اور صرف اسلام کے مستقبل سے وابستہ ہے، دنیا کی کوئی سعادت اور خوش بختی ان کے پرچم اسلام کے نیچے جمع ہونے، اس کی تعلیمات کے سانچے میں ڈھلنے اور اس کی راہ میں جان کی بازی لگا دینے کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی، ان کا بدترین دشمن وہ ہے جو جاہلیت کا راگ الاپتا ہے، قوم و نسل، وطن واشتراکیت کا دم بھرتا ہے، اور ان کو کسی ملحدانہ فلسفہ کی دعوت دیتا ہے اور اس طرح عرب و اسلام کا رشتہ توڑنے یا کمزور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اس ماحول کا ایمان تھا کہ اسلام ایک اکائی ہے جس کو مزید اکائیوں پر تقسیم نہیں کیا جاسکتا، وہ زندگی کا ایک مکمل اور ہمہ گیر نظام ہے، وہ عقیدہ بھی ہے، اخلاق بھی، سیاست بھی ہے، علم بھی، عقل بھی ہے، جذبہ بھی، تہذیب بھی ہے ثقافت بھی، اس کے مخصوص پیمانے ہیں اور معین قدریں، اس کو کسی پیوندکاری یا کسی ''ضمیمہ'' کی ضرورت نہیں، وہ کسی مول تول یا اپنے کسی اصول سے دست برداری کے لیے تیار نہیں۔

صاحب کتاب کا نشو ونما دعوت اسلامی کی تاریخ کے سایہ میں ہوا، اور ایک ایسے گھرانہ میں جہاں راہ خدا میں سرفروشی و جاں بازی کی داستانیں، سیرت نبویؐ و اسلامی فتوحات کی منظوم تاریخ اور وہ شاہنامے پڑھے جاتے تھے جو اس خاندان کے بعض بزرگوں نے نظم کیے تھے (۱)، جس کی بنا پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام اور عربوں کی محبت ان کے رگ و جان میں رچ بس گئی اور وہی احساسات ان کے کمند ہمت کے لیے مہمیز اور ساز قلم کے لیے مضراب ثابت ہوئے۔

ان کی پیدائش ایسے خانوادہ میں ہوئی جس کا مدتوں سے یہ شعار تھا کہ ٹھیٹھ

---

(۱) سید عبدالرزاق صاحب حسنی کلامی مرحوم کی کتاب ''گوہر مخزون'' ''حسام الاسلام'' اور ''صمصام الاسلام'' کی طرف اشارہ ہے، پہلی کتاب ابن سید الناس کی سیرت کی کتاب کا منظوم ترجمہ اور دوسری کتاب غزوات نبوی پر مشتمل ہے، تیسری کتاب واقدی کی ''فتوح الشام'' کا اردو ترجمہ پچیس ہزار اشعار میں ترجمہ ہے، جو مطبع نول کشور لکھنؤ کی طرف سے شائع ہوا، سید عبدالرزاق صاحب اسی خاندان کے ایک بزرگ تھے۔

اسلامی عقائد اور صحیح تزکیہ نفس و روحانیت، پاکیزہ جذبات اور ادب و شعر کے صحیح ذوق اور مختلف النوع علوم کے سرچشمہ سے سیراب ہونے کے درمیان کوئی تضاد نہیں، اسی بنا پر صاحب کتاب خشک مزاجی، جذبات لطیف کی ناقدری اور تزکیہ نفس کی تنقیص و تحقیر سے محفوظ رہے، وہ کمزوری جس سے عصر حاضر کے بعض وہ نامور مصنفین تک نہ بچ سکے جن کا نشو ونما اس ہمہ گیر ماحول اور اس دوآتشہ تربیت سے الگ ہوا۔

صاحب کتاب نے شعور کی منزلیں اس وقت طے کیں جب کہ در و دیوار سے علامہ اقبالؒ کے اشعار گونج رہے تھے، اور ہر جگہ اسی کی فرماں روائی تھی، وہ اشعار جو محبت و الفت، ایمان و یقین، اسلامی کی صلاحیت پر یقین کامل اور اس کی ہدایت پر ایمان سے بھرے ہوئے تھے، انھیں جذبات کو انھوں نے اپنی آئندہ زندگی میں اپنے افکار کی اساس بنایا۔

ان کا نشو ونما ایسے والد کی آغوش میں ہوا جو عقائد کی صحت و پختگی، قوت ایمانی، قلب و دماغ کی وسعت، جدید مطالعہ اور حقیقت پسندی میں ممتاز تھے، وہاں مذہب و سائنس اور قدیم و جدید میں کوئی تضاد نہ تھا، وہ مشرقی و مغربی علوم کے چشموں سے یکساں طریقہ پر بہرہ ور ہوئے تھے، اور انھوں نے ان دونوں کے بہترین و حسین ترین اجزاء کو جذب کر کے ان کے درمیان ایک حسین و دل آویز امتزاج پیدا کر لیا تھا، اور اس طرح وہ ایسا ''مجمع البحرین'' بن گئے تھے جس کی مثال اس عصر میں ملنی مشکل ہے، خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں سرشار، اللہ اور اس کے محبوب رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے خاندان، زبان اور وطن سے گہری محبت رکھنے والے، ان تمام عقائد و اعمال، فلسفوں اور نظاموں اور تحریکات سے بیزار، جو اسلام کے مخالف اور متوازی ہوں، اسلام کے بارے میں ان کا علم و مطالعہ گہرا تھا، وہ اس کے علمی و فکری سرچشموں سے براہ راست واقف اور ان سے استفادہ کی صلاحیت رکھتے تھے، وہ اسلام کے بارے میں بڑے غیور واقع ہوئے تھے، ان کو جزیرۃ العرب و مقامات

مقدسہ سے جذباتی لگاؤ تھا، اپنی نجی زندگی میں تقشّف کی حد تک سادہ اور زاہد، علمی اور دینی مسائل کے فہم میں وسیع النظر اور فراخ دل، فرائض و منصوصات کے بارے میں بے لچک، جدید علوم و تجربات سے استفادہ کرنے کے بارے میں بڑے وسیع القلب اور روشن دماغ، یہ میرے محترم بھائی، میرے استاذ و مربی اور صاحب کتاب کے والد ماجد ڈاکٹر عبد العلیؒ کی شخصیت تھی۔

پھر جب اس نوخیز مصنف و انشا پرداز نے عقل و شعور کی آنکھیں کھولیں تو ایسا معاشرہ سامنے آیا جو اسلام و جاہلیت اور مذہب و الحاد کی کشمکش سے دوچار تھا، ارباب سیاست تذبذب و اضطراب کا شکار تھے، ان میں سے اکثر منافقانہ سیرت و کردار کے حامل تھے، جو دین کو سیاسی اغراض کے تحت استعمال کر رہے تھے، اور مسلم عوام کو اپنی سیاسی بازی گری کے دام میں پھانسنے کی کوشش کرتے تھے، وہ مسلم عوام جو قرآن و سنت اور محبت و الفت کی زبان کے علاوہ کسی زبان سے آشنا نہیں، جن میں صحابہ کرام و مجاہدین اسلام کے واقعات اور جہاد و شہادت کے فضائل کے علاوہ کسی اور ذریعہ سے جوش و گرمی نہیں پیدا کی جاسکتی۔

ان میں اس ماحول کے اثر سے بچپن ہی سے عربی زبان سیکھنے کا شوق پیدا ہوگیا، اور اس کی محبت ان کے جسم و جان میں پیوست ہوگئی، اور ان کو نہ صرف اس زبان سے بلکہ اس زبان سے تعلق رکھنے والی ہر چیز سے دلی لگاؤ پیدا ہوگیا، وہ اسلام کے دور اول کے داعیوں اور مجاہدوں کی شکل میں عربوں کا تصور کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ سب عرب ایسے ہی ہوتے ہیں، اور یہ قوم اب بھی اسی راستہ پر گامزن ہے، جس پر محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو لگایا تھا، وہ کسی انسان کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر درجہ دینے اور قائد و امام سمجھنے، اسلام کے مقابلہ میں کسی دین، مسلک حیات اور قومیت اسلامی کے مقابلہ میں کسی قومیت کو خاطر میں لانے کے لیے تیار نہیں۔

لیکن جب وہ عقل و شعور کی منزل میں پہنچے اور عرب ادباء و اہل قلم کی تحریریں

پڑھنا شروع کیں تو ان کی نظر بہت سے ایسے مضامین اور تحریروں پر پڑی کہ اگر ان کے نیچے ان عرب اہل قلم کی جگہ مغربی مصنفین، مستشرقین اور مخالف اسلام ادیبوں اور فلسفیوں کے نام لکھ دیئے جائیں تو پڑھنے والے کو اس بارے میں کوئی الجھن محسوس نہیں ہوگی۔

انھوں نے دیکھا کہ اکثر عرب مصنفین کا ذہن اسلام کے بارے میں صاف نہیں ہے، وہ اسلام کے بارے میں یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ وہ تاریخ انسانی میں اپنا برا بھلا رول ادا کر چکا، وہ ایسی ٹارچ ہے جس کا مسالہ (سل) ختم ہو چکا ہے، اب اس کا دم بھرے جانا اور اس کی دعوت دینا کوئی عقل و دانشمندی کی بات نہیں، ان میں سب سے غنیمت وہ لوگ ہیں جو اسلام کو دنیا کے بہت سے مذاہب میں سے ایک مذہب اور زندگی کے نظاموں میں سے ایک نظام سمجھنے کے لیے تیار ہیں، جس کو ایک محدود تنگ دائرہ اور ایک فرد کی پر امن و بے ضرر زندگی میں باقی رہنے کی اجازت دی جاسکتی ہے۔

انھوں نے ایک ایسے ماحول میں پرورش پائی تھی جس کا عقیدہ تھا کہ اسلام ایک زندہ جاوید دین ہے جس میں نوع انسانی کی قیادت و سیادت کی پوری صلاحیت ہے اور عرب ساری دنیا میں اس دعوت کے علم بردار اول ہیں، صورت حال کا یہ جدید انکشاف ان کے لیے ایک ذہنی صدمہ اور قطعاً ایک خلاف توقع واقعہ تھا۔

پھر وہ تاریک دور آیا جب (۱۹۵۲ء کے بعد) مصر میں قومیت عربیہ کی تیز و تند آندھی اٹھی، اور اس نے دیکھتے دیکھتے عرب نوجوانوں کی اکثریت کو اور پختہ کار عربوں کی بھی ایک بڑی تعداد کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، اس قیادت (لیڈرشپ) کا عقیدہ تھا کہ عربوں کے دل و دماغ اور حیات اجتماعی و سیاسی کو اسلام کے فرسودہ اثرات سے آزاد کرانا صیہونیت (Zionism) سے جنگ کرنے اور مقامات مقدسہ (بیت المقدس و فلسطین) کو آزاد کرانے سے زیادہ اہم ہے۔

خود اسی کی زبان و اصطلاح میں اس ''ملبہ'' کو صاف کیے بغیر تعمیر جدید اور دشمن

کی دست درازی کے اثرات کا ازالہ ممکن نہیں، اس جدید لیڈر شپ کے منشور میں ''قومیت عربیہ'' اور ''اشتراکیت علمیہ'' (۱) اسلامی عقیدہ اور اسلامی دعوت کا صحیح بدل ہے، ان کے لیے ان کے علم برداروں کے دل میں وہی یقین، جوش اور وہی تعصب اور حمیت پائی جاتی تھی جو ایک دین کے پیروؤں میں پائی جاتی ہے، مصر کی یہ قیادت جدید اسلحہ، جنگی تیاری، اندر کی کیفیات اور ایمان و یقین سے زیادہ کھوکھلے نعروں، بلند بانگ دعاوی اور فسوں کار پروپیگنڈہ پر یقین رکھتی تھی، یہ ایک ایسا طوفان بلاخیز تھا جو دل و دماغ پر ''سحر سامری'' کی طرح چھا گیا، اور شرق اوسط کے ادب وصحافت اور تعلیمی مراکز کو اپنی رو میں بہا لے گیا، اس کے مقابلہ میں معدودے چند افراد ثابت قدم رہ سکے (۲)، کیونکہ اس سے نبرد آزمائی اور اس پر علمی تنقید جابر و مستبد بادشاہ کے روبرو اعلان حق سے کم نہ تھی۔

ان پرفتن حالات اور تیرہ و تاریک ماحول میں صاحب کتاب نے مجلّہ ''البعث الاسلامی'' کی ادارت سنبھالی اور مقالات کا ایک سلسلہ شروع کیا تاکہ اپنے مجروح جذبات اور سوختہ جگر کی ترجمانی کے ذریعہ عربوں کو ان کی تاریخ، ان کا ابدی اور ہمہ گیر پیغام اور دنیا میں ان کی مرکزیت کا بھولا ہوا سبق یاد دلائیں اور ان کے اندر یہ شعور پیدا کریں کہ اس نازک گھڑی میں وہ کیا قائدانہ کردار ادا کرسکتے ہیں؟ اس وقت عالمی اسٹیج سیاسی بازی گروں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا اور عالم اسلام اس غیر صحت مند قیادت کے

---

(۱) یہ الفاظ صدر جمال عبدالناصر کے چلائے ہوئے تھے، جو سکۂ رائج الوقت کی طرح اس وقت عرب ممالک میں چل رہے تھے۔

(۲) اس میں ندوۃ العلماء کا عربی رسالہ ''البعث الاسلامی'' جو کمسن مصنف کی ادارت میں نکلتا تھا، پیش پیش تھا، مصنف کے پرزور افتتاحیوں نے جو عام طور پر مصر کی اس نئی لیڈر شپ کے خلاف ہوتے تھے عالم عربی میں ایک دھوم مچا رکھی تھی، ہندوستان کے مصری سفارت خانوں نے حکومت ہند سے اس کے خلاف احتجاج کیا، اور ایڈیٹر سے جواب طلبی بھی ہوئی لیکن وہ اپنی روش پر قائم رہے، راقم سطور سے مشہور عرب رہنما اور مجاہد شیخ محمد محمود الصواف نے خود کہا کہ ''البعث الاسلامی'' نے ناصر کو بے نقاب کرنے کے سلسلہ میں جو کردار ادا کیا وہ پورے عالم عربی میں کسی رسالہ یا اخبار سے نہیں ہوسکا۔

پیچھے بے تحاشہ دوڑ رہا تھا، بڑے بڑے ادیب، صاحب قلم اور صاحب فکر اس جذبانیت اور ضمیر فروشی کے چکر میں کٹھ پتلی کی طرح ناچ رہے تھے، ایسے ماحول میں صاحب کتاب نے اس بات کا بیڑا اٹھایا کہ وہ مسلمانوں کو ایسے اسلام کی دعوت دے جو ہر صاحب حق کو اس کا حق ادا کرتا ہے، عقل کو روشنی اور شعلۂ جگر کو تابناکی بخشتا ہے، اخلاق کو سنوارتا ہے، زندگی کو ایک نظام عطا کرتا ہے، قوموں کو آوارہ اور شتر بے مہار بننے سے بچاتا ہے، تہذیب وتمدن کو صحیح راہ پر لگاتا ہے، دبی ہوئی صلاحیتوں کو ابھارتا ہے، مردان کار کو میدان میں لاتا ہے، قائدین ملت اور عبقری (Jenius) انسانوں کو پیدا کرتا ہے، ایسا اسلام جو نہ ''چوب خشک'' کی مانند بے لوچ ہے، نہ سیماب کی طرح سیال ورقیق، نہ وہ رہبانیت اور ترک دنیا کا پیغام ہے نہ مادہ پرستی اور زندگی کی حد سے بڑھی ہوئی ہوس کا نام، بلکہ وہ دین کامل ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا اور ان صحابہ کرام اور تابعین کی زندگی میں مکمل طور پر ظہور پذیر ہوا جو عقل وقلب، عقیدہ وعمل اور جہاد وروحانیت کے جامع تھے۔

اس خاندانی ماحول میں صاحب کتاب نے قدرتی طور پر مجدد کبیر، مجاہد عظیم حضرت سید احمد شہیدؒ (جو ان کے خاندان ہی کے بزرگ تھے) کی سیرت اور دعوت سے گہرا اثر قبول کیا، جن کے کارناموں کا تذکرہ وہ خاندان کے بزرگوں سے برابر سنا کرتے تھے، خصوصیت سے ان کے والد ماجد ان کی عقیدت ومحبت سے سرشار تھے اور ان کے چچا (راقم سطور) نے ان کی مبسوط سیرت لکھی تھی، جو ان کے گھر کی چیز تھی، اسی کے ساتھ وہ مصر کی ''الاخوان المسلمون'' کی زبردست تحریک اور اس کے سرخیل امام حسن البنا شہیدؒ کی ذات سے بھی متعارف ہوئے اور ان کو اپنے چچا کے ذریعہ (جس کے اس تحریک اور اس کے رہنماؤں سے ذاتی روابط تھے) اس دل آویز شخصیت اور اس انقلاب انگیز تحریک سے خصوصی عقیدت ومحبت پیدا ہوئی۔

ان متضاد پہلوؤں اور طاقتوں نے (ایک طرف وہ ماحول وتربیت جس میں ان

کا نشو ونما ہوا، دوسری طرف عالم اسلام اور عالم عربی کی وہ صورت حال جو ان کے سامنے تھے) ان کی طبیعت کے اندر ایک شدید کشمکش پیدا کر دی جس نے ان کے قلم کو ایک آبشار میں تبدیل کر دیا، جو چٹانوں سے ٹکرانے کی وجہ سے بڑی طاقت سے ابلتا ہے، اور بڑے جوش وشور کے ساتھ گرتا ہے، اس کے نتیجہ میں ایسے مضامین ان کے قلم سے نکلے جن میں آبشار کا شور اور طوفان کا زور ہے، یہ شدت وحدّت ہمیشہ اندرونی کشمکش کا نتیجہ ہوتی ہے، قسمت سے جب ایسے شخص کو بیان پر قدرت، قلم کی روانی، زبان وادب کی ہم زبانی اور خلوص وصداقت کی دولت فراوانی سے حاصل ہو جاتی ہے تو اس میں تلواروں کی کاٹ اور سیلابوں کی طغیانی پیدا ہو جاتی ہے، یہ اسلوب نگارش قوموں کے شعور کو بیدار کرنے، دماغوں اور دلوں کی کائی کے چھانٹنے، احساس کمتری کو دور کرنے اور کھوئے ہوئے اعتماد کو بحال کرنے میں جادو کا کام دیتا ہے، خاص طور پر جب وہ نری خطابت اور الفاظ کی جادوگری نہ ہو، اس کو علم ومعلومات، دلائل ووثائق اور شواہد وتجارت کی تائید بھی حاصل ہو، اس اسلوب نگارش کو محض ایک نوجوان کی طبیعت کی تیزی اور ایک نومشق قلم کی روانی کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، دنیا کی ہر بڑی اصلاحی تحریک وانقلاب کے لیے اس نے زمین تیار کی ہے، اور ہر بیداری وترقی کے لیے اس نے راستہ ہموار کیا ہے، یہی وہ اسلوب نگارش تھا جس کے عہد اول کے خطیب اور داعی منت کش ہوئے، دور آخر میں سید جمال الدین افغانی اور ان کے رفیق کار شیخ محمد عبدہ نے اپنے شہرۂ آفاق رسالہ ''العروۃ الوثقیٰ'' کے مضامین میں اسی اسلوب کا سہارا لیا اور اس کے ذریعہ عالم اسلام میں زندگی کی ایک لہر پیدا کر دی، اسلامی شعور بیدار کرنے اور افسردہ جذبات اور سرد قویٰ کو جھنجھوڑنے میں اس نے وہ کارنامہ انجام دیا جو خالص علمی وفلسفیانہ مضامین انجام نہیں دے سکتے تھے، اسی وجہ سے اس رسالہ سے جو پیرس سے نکلتا تھا مغربی حکومتوں کی نیند اڑ گئی اور انھوں نے اپنے زیر نگیں اسلامی ممالک میں اس کا داخلہ بند کر دیا۔

پیش نظر کتاب کے مقالات ان خصوصیات کے حامل ہونے کے ساتھ دعوت غور وفکر دیتے ہیں اور اسلامی طرز تفکیر کے نئے گوشے کھولتے ہیں، اور دعوتی میدان میں کام کرنے والے حضرات کے لیے بعض جدید معلومات مہیا کرتے ہیں، وہ مادّی فلسفۂ حیات کی بے مائیگی، مغربی تہذیب کے کھوکھلے پن اور اس کے افلاس کا پردہ چاک کرتے ہیں، مصنف نے ایک ایسے ملک میں آنکھ کھولی جو مغرب کی ''آتش نمرود'' میں داخل ہو کر نکلا، اس ملک میں عالم اسلام کا سب سے بڑا فکری، تمدنی، سیاسی معرکہ پیش آیا، جس سے اس تحتی براعظم کی مسلم ملت بہت کچھ محفوظ اور بڑی حد تک اپنی تہذیب و اقدار کے ساتھ ہم کنار ہو کر نکلی، اس کو مغربی تہذیب کی کمزوریوں، اس کی ناکامی اور اس کے دیوالیہ پن کا دوسرے مسلم ممالک سے زیادہ تجربہ ہوا، اس تجربہ نے ان مضامین کے لکھنے والے میں ایک نیا اعتماد، ایک نئی قوت تحریر اور ایک نئی قدر و قیمت پیدا کر دی۔

صاحب کتاب کے ذہنی، فکری، ادبی اور دینی نشو ونما وارتقا میں ان کے مخصوص ماحول، خاندان، والد ماجد کی یگانہ شخصیت، تعلیم وتربیت اور اس لٹریچر کا جو ان کے گرد و پیش موجود ہے، جو فیض شامل ہے، اس کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ آچکا ہے، آخر میں اس واقعہ کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کا زور تحریر، جوش بیان، ہندوستان سے قدم باہر نکالے بغیر عربی تحریر وانشا پر ایسی قدرت جو ان کے بزرگوں اور معاصرین سب کے لیے موجب حیرت بلکہ ایک طرح کا حیرت انگیز انکشاف ہے، بڑے سے بڑے اہم موضوع پر قلم برداشتہ اور برجستہ لکھنے کی صلاحیت، تحریر کی تاثیر اور دل آویزی، تنہا اس ماحول اور تعلیم وتربیت کا نتیجہ نہیں ہے اور نہ ان کی باقاعدہ تعلیم و درسیات کو (جو نا قابل قیاس حد تک مختصر، محدود اور ان کے والد کے مجتہدانہ طرز تعلیم پر مبنی ہے) اس سے کوئی مناسبت ہے، ان کا معاملہ بالکل وہبی اور خداداد ہے، ان کے مضامین میں جو آمد (اور آمد ہی آمد) اور ان کی تحریر میں جو تاثیر ہے وہ محض زور قلم اور حسن بیان کا نتیجہ نہیں، بلاد عربیہ خصوصاً مصر و شام میں بڑے بڑے اہل قلم اور اہل فکر

موجود ہیں جن کی زبان عربی اور تحریر وانشا ان کا شب و روز کا مشغلہ ہے، لیکن ان کی تحریر میں وہ حلاوت و ملاحت اور قوت و حرارت نہیں جو اس ہندی نژاد نوخیز داعی اور انشاپرداز کے قلم میں ہے، یہ اس کے سوز دروں اور جذب اندروں کا نتیجہ ہے، اور اس کو اقبال کے الفاظ میں یہ کہنے کا حق ہے ؎

خون دل و جگر سے ہے میری نوا کی پرورش
ہے رگ ساز میں رواں صاحب ساز کا لہو

ابوالحسن علی ندوی
(دارالعلوم ندوۃ العلماء)

۸/جون ۱۹۷۹ء

باب اول

خاندان اور سلسلۂ نسب

دادھیال

ساتویں صدی ہجری میں حضرت امیر کبیر شیخ الاسلام سید قطب الدین محمد المدنی الحسنی (م-۶۷۷ھ) مدینہ منورہ سے برائے جہاد اپنے خاندان کے افراد اور سادات وشیوخ کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ ہندوستان تشریف لائے اور جہاد کرتے ہوئے ہندوستان کے شمال مشرق میں ''کڑا'' نامی قصبہ کو اپنا مستقر بنایا اور اس ظلمت کدہ کو اسلام کے نور سے منور کیا، ۶۷۷ھ میں وہیں انتقال کیا، اور آبادی سے دور مدفون ہوئے، ان کی اولاد میں بہ کثرت اولیاء ومشائخ گزرے ہیں، خدا نے ان کی نسل میں بڑی برکت عطا فرمائی اور ہندوستان کے مختلف حصوں میں وہ آباد ہوئی، وہ خود بھی ایک شیخ طریقت اور صاحب سلسلہ تھے، اس لیے ان کا سلسلہ بھی بہت مقبول اور مشہور ہوا۔

امیر کبیر کی اولاد میں ایک شاخ وہ تھی جس کے مورث اعلیٰ امیر سید قطب الدین محمد ثانی تھے وہ کڑا سے منتقل ہوکر جائس ضلع رائے بریلی میں بسے، اور ان کے پوتے قاضی سید محمود جائس سے چار میل جنوب میں نصیر آباد کے علاقہ کے قاضی ہوکر نصیر آباد منتقل ہوئے اور وہاں ٹیلہ پر فروکش ہوئے، ایک مسجد تعمیر کی اور ایک محلّہ جس کو قضیانہ کہتے ہیں آباد کیا، ان کے دو بیٹے ہوئے: ۱- قاضی سید محمد، ۲- قاضی سید

احمد۔ دونوں اپنے وقت کے قاضی رہے ہیں، خصوصاً قاضی سید احمد بڑے فاضل اور عالم اور مرد غیور تھے، ایک بار انھوں نے مقدمہ کے سلسلہ میں شرعی فیصلہ سنایا تو ایک فریق نے یہ کہہ دیا کہ ہم شریعت کے فیصلہ کو تسلیم نہیں کرتے ہیں، ہم رواج کے پابند ہیں، اس نامعقول بات پر قاضی صاحب اتنے برداشتہ خاطر ہوئے کہ استعفیٰ دے کر اور یہ کہہ کر کہ میں اس جگہ رہنے کا روادار نہیں جہاں خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کا احترام نہ کیا جائے- رائے بریلی شہر ہجرت کر آئے، مگر ان کا خاندان نصیر آباد ہی میں رہا۔

قاضی سید احمد کے دو پوتے تھے، وہ دونوں صاحب علم وفضیلت تھے، ایک کا نام سید محمد فضیل، دوسرے کا نام مولانا سید محمد اسحٰق تھا، مولانا سید محمد اسحٰق کو تصنیف وتالیف کا بھی ذوق تھا، ان کی علمی قلمی کاوشیں ابھی تک نادر ونایاب مخطوطات میں موجود ومحفوظ ہیں۔

سید محمد فضیل مدینہ منورہ ہجرت کر گئے تھے، وہ مدینہ منورہ ہی میں ۱۰۳۲ھ میں انتقال کر گئے، اسی درمیان نصیر آباد ہندوستان میں ان کے گھر ایک فرزند تولد ہوا جس کا نام علم اللہ رکھا گیا (۱)، وہ بچہ بڑا ہو کر ایک بڑا عالم، ایک عظیم القدر شیخ ہوا، جن کی اتباع سنت اور زہد وورع پر سارے ہم عصر علماء اور بادشاہ وقت اورنگ زیب عالمگیر تک متفق تھے (۲)، ان کی اولاد میں بے شمار اولیاء، علماء اور اہل سیف وقلم گزرے ہیں جن میں حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی ہستی ایسی ہستی ہے جن کے انفاس قدسیہ سے مسلمانوں کو جو فائدہ پہنچا، اس کی نظیر نہیں ملتی، ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں ان کے متبعین پہنچے اور ان کے ذریعہ کروڑوں انسانوں کو اصلاح نصیب ہوئی، اور تبلیغ

---

(۱) حضرت شاہ علم اللہ حسنی رائے بریلوی کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو "تذکرہ حضرت شاہ علم اللہ حسنی رحمۃ اللہ علیہ" از مولانا سید محمد الحسنی"۔

(۲) شاہ صاحب نے ۱۳ سال کی عمر میں ظاہر وباطن میں کمال پیدا کرلیا اور رائے بریلی میں دریائے سئی کے کنارے ۱۰۵۰ھ میں قیام کیا، اور ایک بستی بسائی جس کا نام دائرہ شاہ علم اللہ اور مرور زمانہ سے تکیہ کلاں پڑ گیا، شاہ صاحب کی اولاد اسی بستی میں اس وقت مقیم ہے، اور اس کی کچھ شاخیں روزگار اور دعوت وتبلیغ کی خاطر مختلف علاقوں میں آباد ہوگئیں، شاہ صاحب کا انتقال ۱۰۹۶ھ میں ہوا۔

دین اور جہاد فی سبیل اللہ کی مردہ سنت زندہ ہوئی۔

ان کے علاوہ اس خاندان میں جو علماء ہوئے، ان میں حسب ذیل حضرات اپنے علم وفضل اور صلاح وتقویٰ میں مثالی حیثیت رکھتے ہیں:

مولانا سید محمد حکم (م-۱۱۵۰ھ)، حضرت مولانا سید محمد بن علم اللہ (م-۱۱۵۶ھ)، مولانا محمد صابر (م-۱۱۶۳ھ)، حضرت شاہ لعل (م-۱۱۹۲ھ)، حضرت شاہ ابوسعید (م-۱۱۹۳ھ)، مولانا محمد واضح (م-۱۲۰۱ھ)، شاہ ابواللیث (م-۱۲۰۸ھ)، مولانا سید قطب الہدیٰ محدث (م-۱۲۲۶ھ)، مولانا سید محمد اسحٰق برادر حضرت سید احمد شہید (م-۱۲۳۴ھ)، مولانا سید محمد ظاہر (م-۱۲۷۷ھ)، حضرت مولانا سید خواجہ احمد نصیرآبادی (م-۱۲۸۹ھ)، مولانا شاہ ضیاء النبی حسنی (م-۱۳۲۴ھ)، مولانا سید فخرالدین خیالی (م-۱۳۲۶ھ)، مولانا سید محمد عرفان نبیرہ حضرت سید احمد شہید (م-۱۳۳۲ھ) مولانا سید محمد امین نصیرآبادی (م-۱۳۵۱ھ)؛ یہ سارے حضرات اہل سلسلہ، اصحاب درس اور اپنے اپنے وقت کے مشہور مشائخ اور مرجع خاص وعام تھے، مولانا حکیم سید فخرالدین خیالی، ان کے صاحبزادے مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی اور ان کی اولاد کا تذکرہ تفصیل سے آگے آرہا ہے۔

حضرت شاہ علم اللہ کے عم مکرم مولانا سید محمد اسحٰق کے دو جلیل القدر صاحبزادے تھے، ان میں ایک ذات علامہ ہدایت اللہ کی ہے جو عہد شاہجہانی میں ممتاز عہدہ دار اور تصنیف وتالیف اور درس وتدریس میں ملکہ رکھتے تھے، دوسرے صاحبزادے مولانا دیوان خواجہ احمد تھے، جو حضرت شاہ علم اللہ کے استاد اور حضرت سید آدم بنوری کے خلیفہ تھے، جن کے علم وفضل، زہد وتقویٰ کا ایک زمانہ قائل تھا، ان دونوں بھائیوں کی اولاد صدیوں تک نصیرآباد میں مقیم رہی، جن میں ان کے صاحبزادے سید ابراہیم ایک صاحب حال بزرگ اور خواجہ سید احمد نصیرآبادی (م-۱۲۸۹ھ) ایک صاحب نسبت اور صاحب سلسلہ بزرگ تھے، جن کے باطنی اور ظاہری فیوض سے ایک عالم مستفید

ہوا، اور کثیر تعداد میں ان کے خلفاء ہوئے؛ جن میں حضرت شاہ ضیاء النبی اور مولانا فخر الدین خیالی ممتاز درجہ رکھتے تھے، ان کے علاوہ مولانا محمد یٰسین نصیر آبادی، مولانا احمد حسن نصیر آبادی، مولانا محمد حسین نصیر آبادی وغیرہ علماء ومشائخ گزرے ہیں۔

علامہ ہدایت اللہ کے صاحبزادے سید عبدالرحیم جو ایک معرکہ حق وباطل میں شہید ہوئے تھے' اپنے چچا حضرت شاہ علم اللہ کے داماد ہوئے، ان کے صاحبزادے سید محمد تقی اپنے قابل فخر دادا علامہ سید ہدایت اللہ اور یگانہ روزگار نانا حضرت شاہ علم اللہ کے علم وفضیلت کے سنگم، اور دونوں بزرگوں کے صفات وکمالات کے وارث وامین تھے، سید محمد تقی کی اولاد میں کئی شاخیں ہوئیں، اور ہر شاخ میں علماء ومشائخ ہوئے، مثال کے طور پر دادا ابوالحسن شہید بالاکوٹ ان کے بیٹے مولانا حکیم اسلم شہید صاحب قرابادین، قاضی امام الدین، مولانا محمد تقی، مولانا سید محمد بن اعلیٰ نصیر آبادی خلیفہ حضرت سید احمد شہیدؒ، مولانا محمد طٰہٰ اور آخر میں حضرت مولانا سید محمد امین نصیر آبادی (۱) علامہ ہدایت اللہ کے صاحبزادے سید امین اللہ کی اولاد میں بھی اہل علم گزرے ہیں، ان میں ممتاز ترین لوگ مولانا سید محمد امین عرف اچھا میاں (نانا حضرت مولانا سید محمد امین نصیر آبادی) مولانا سید محمد معین المتخلص بہ حسنؔ (خلیفہ مولانا سید محمد ظاہر حسنیؒ) اور آخر میں مولانا سید عزیز الرحمٰن حسنی ہوئے، اس شاخ میں بکثرت ایسے حضرات بھی گزرے ہیں جو حکومت وقت کے قاضی رہے ہیں۔ (۲)

مولانا سید عبدالعلی نصیر آبادی

سید محمد تقی کی پانچویں پشت میں مولانا سید عبدالعلی نصیر آبادی ہوئے، جو ایک

---

(۱) ان کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو "خانوادۂ علم اللّٰہی" از مصنف۔

(۲) ایضاً۔ مولانا عزیز الرحمٰن حسنی نے تعلیم وتربیت کے کام سے دلچسپی رکھی، اور ندوۃ العلماء کے شعبۂ نظامت سے بھی کچھ عرصہ وابستہ رہے، ذاکر وشاغل شخص تھے، ان کے صاحبزادے مولانا سید ابوبکر حسنی ایم. اے. نے اعلیٰ تعلیمی لیاقت پیدا کی اور جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی میں اسسٹنٹ پروفیسر ہو کر ریٹائر ہوئے، اور ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ کے رکن بھی ہوئے۔ (م)

درویش صفت اور عالم و فاضل بزرگ تھے، ۱۲۲۰ھ میں نصیرآباد میں پیدا ہوئے، درسیات کی تکمیل مولانا سید محمد علی رامپوری سے کی، ان کی شادی حضرت مولانا سید محمد ظاہر صاحب خلیفۂ اجل حضرت سید احمد شہیدؒ کی دو صاحبزادیوں سے یکے بعد دیگرے ہوئی، اور اس تعلق سے وہ ترک سکونت کر کے دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی منتقل ہوئے، جہاں پہلے سے ان کے خاندان کی ایک مقتدر شاخ اور ان کے بنی اعمام سکونت پذیر تھے۔

مولانا سید عبدالعلی صاحب عبادت، ریاضت، صلہ رحمی، خشیت الٰہی میں امتیازی شان، اور نقاشی و خوش خطی میں ملکہ رکھتے تھے، حضرت سید احمد شہیدؒ کے مرید و مجاز تھے، آپ کے اخلاق کریمانہ کا گھر گھر چرچا تھا، شعر و سخن کا ذوق تھا، عربی میں علی اور فارسی میں ہجر تخلص کرتے تھے، ان کے سیرت نگار حسب ذیل الفاظ میں ان کا نقشہ کھینچتے ہیں:

> ''اپنے دور کے بہت بڑے زاہد و متقی انسان تھے، تعلقات دنیوی اور سلسلہ ملازمت کے باوجود باہمہ و بے ہمہ ''دل بیار و دست بکار'' کا نمونہ تھے، اور ''ہوش در دم، سفر در وطن اور نظر بر قدم'' پر عامل تھے، تلاوت قرآن اور نوافل کے پابند تھے، ہاتھ میں تسبیح، زبان دعا و ذکر میں مشغول رہتی، ان کی برکت سے دین داری کی فضا قائم رہتی، بہ تمام آگہی اتباع احکام شرعی اور فقر و زہد میں زندگی گذار دی، اور دم واپسیں تک اس حالت پر قائم رہے، وفات سے پہلے آخری کلام جو زبان سے ادا ہوا، وہ ''ھو الرفیق الاعلیٰ'' تھا جو ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر ارتحال کے وقت جاری تھا، انتقال مرض فالج میں ہوا، ۱۲۶۹ھ کو ناگود میں ۴۸ رسال کی مختصر زندگی گزار کر انتقال کیا، اور وہیں مسجد عبدالسبحان کے باہر احاطہ میں مدفون

ہوئے، اپنے پیچھے ایک فرزند سید فخر الدین (جن کی عمر اس وقت صرف تیرہ سال تھی) اور پانچ صاحبزادیاں چھوڑیں۔" (۱)

مولانا سید فخر الدین

مولانا سید فخر الدین تکیہ شاہ علم اللہ رائے بریلی میں ۶ ۱۲۵ھ کو پیدا ہوئے، فارسی وعربی کی ابتدائی کتابیں ناگور (مدھیہ پردیش) میں پڑھیں، والد کے انتقال کے بعد اپنے فاضل نانا مولانا سید محمد طاہر حسنی (خلیفہ حضرت سید احمد شہیدؒ) کے دامن تربیت میں پرورش پائی، نانا کے انتقال کے بعد مولانا محمد نعیم فرنگی محلی سے درسیات کی تعلیم حاصل کی، اور طب کی کتابیں حکیم محمد یعقوب لکھنوی سے پڑھیں، شعر وسخن کا ذوق رکھتے تھے، اور اس سلسلہ میں شیخ امیر اللہ تسلیم کے شاگرد ہوئے، فراغت اور تکمیل علوم کے بعد معاش کی خاطر مختلف مقامات اور شہروں کا سفر کیا، اور ملازمت اختیار کی، مزاج میں خاموشی، متانت، حلم وبردباری، عزلت پسندی بہت تھی، صبر وقناعت کی صفت سے متصف تھے، تصنیفات میں تارخ بگھیل کھنڈ (اردو)، چمنستان اردو، جوش دل، پریم ناگ، رقعات فخریہ، دیوان خیالی، مثنوی بہار تسلیم، جان فخر، فغان فخر، آئے دن کے سیلاب میں ضائع ہوگئیں، جو ضائع ہونے سے بچیں ان میں "مہر جہاں تاب" فارسی زبان میں فل اسکیپ کی تقطیع پر ہے پہلی جلد تیرہ سو صفحوں پر مکمل ہوئی، دوسری نصف لکھی تھی کہ عمر نے وفا نہیں کی، یہ کتاب سیرت، تاریخ، علوم وفنون کا انسائیکلو پیڈیا ہے، دوسری کتاب "سیرت السادات" فارسی میں ہے، تیسری "سیرت علمیہ"، چوتھی عربی میں "سبیل النجاۃ"، پانچویں "مجربات خیالی"، شعر وسخن کے فن میں

---

(۱) بڑی صاحبزادی مولوی رشید الدین صاحب حسنی کے نکاح میں آئیں جن سے مولوی سید خلیل الدین حسنی جدامجد راقم سطور اور سید امین الدین اور چار صاحبزادیاں ہوئیں جن میں ایک مولانا سید محمد الحسنیؒ کی نانی تھیں) دوسری مولوی عبدالرزاق صاحب ٹونکی کلامی میاں مصنف صمصام الاسلام کو، تیسری والدۂ مولانا سید عزیز الرحمٰن حسنی (والد مولانا سید ابوبکر حسنی) تھیں، چوتھی مولانا سید ابوالقاسم صاحب ہنسوی کی والدہ ماجدہ، پانچویں قصبہ نصیر آباد (ضلع رائے بریلی) میں بیاہی گئیں۔

''دیوان فخر''، ''مناظرۂ شب و روز''، ''مثنوی ماہ وخورشید''، ''واردات خیالی'' ان کی تصنیف ہیں، شروع میں فارسی میں فخر اور بھاشا (ہندی) میں میر تخلص تھا بعد میں خیالی تخلص کیا۔

مولانا فخر الدین بڑے ذہین، طباع، مگر بڑے کم آمیز، کم سخن، اور سادہ مزاج تھے، مولانا خواجہ احمد نصیر آبادی سے بیعت ومجاز تھے، مگر مرید کسی کو بھی نہ کیا، ۱۰ ررمضان المبارک ۱۳۲۶ھ بروز شنبہ اپنے مکان دائرہ شاہ علم اللہ میں انتقال کیا، اور روضہ شاہ محمد صابر میں مدفون ہوئے، اپنی یادگار میں پہلی بیوی (دختر مولانا سید سراج الدین زیدی واسطی) سے ایک فرزند مولانا حکیم سید عبدالحی، اور دوسری بیوی (دختر سید عبدالقادر حسنی) سے حافظ سید محمد صابر (جن کا ۱۳۳۰ھ میں ۱۶ رسال کی عمر میں اچانک انتقال ہوگیا) اور دو صاحبزادیاں چھوڑیں۔''(۱)

مولانا حکیم سید عبدالحیؒ (سابق ناظم ندوۃ العلماء)

مولانا حکیم سید عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ سابق ناظم ندوۃ العلماء ایک مثالی شخصیت کے مالک تھے، وہ عظیم القدر عالم، حاذق طبیب اور نامور مصنف تھے، وہ ایسی مبارک علمی شاخ سے تعلق رکھتے تھے جس کا سرمایہ علم وفضیلت کے سوا کچھ نہ تھا، مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی جو مولانا سید عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند ہیں، اپنے والد ماجد کے حالات لکھتے ہوئے ان کے خاندانی صفات کا حال بیان کرتے ہیں:

> ''مولانا کی پدری شاخ کا امتیاز اور سرمایۂ فخر جائیداد، املاک اور مرفہ الحالی کبھی نہیں رہا، زیادہ تر بزرگوں اور آبائے کرام کی زندگی

---

(۱) بڑی صاحبزادی شمس النساء مولانا سید طلحہ صاحب حسنی ٹونکی کی اہلیہ محترمہ تھیں، ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی، چھوٹی صاحبزادی فاطمہ بی سید محمد یوسف صاحب حسنی کی اہلیہ ہیں جن کے ایک صاحبزادہ سید محمد یامین (م ۱۹۷۷ء) اور ایک صاحبزادی اسماء بی ہوئیں، سید محمد یامین کے ایک صاحبزادہ سید محمد خالد ندوی ہوئے اور اسماء بی کی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ ان کے علاوہ مولانا فخر الدین کی پہلی اہلیہ سے دو بیٹیاں اور ایک بیٹے اور دوسری اہلیہ سے ایک بیٹی اور ایک بیٹے تھے، مگر وہ اپنے والد کی حیات میں ہی وفات پا گئے۔

کفاف اور قوت مالا یموت پر بسر ہوئی، زہد و ایثار اس شاخ پر ثمر کا شیوہ رہا، خاندان میں یہ گھرانہ مولویوں کا گھرانہ کہلاتا تھا، باغات اور جائیداد کے بجائے اس گھر کا سب سے قیمتی اثاثہ اور بزرگوں کا عطیہ وہ کتابی ذخیرہ تھا جو کئی پشتوں سے اس خاندان میں محفوظ چلا آرہا تھا، اور اس کے افراد اس کو سینہ سے لگائے ہوئے تھے۔"(۱)

مولانا حکیم سید عبدالحی خالص دینی تعلیم اور دولت باطنی کے ساتھ ادب و انشاء اور شعر و شاعری کا مذاق بھی رکھتے تھے، زندگی کے ضروری کاموں کے ساتھ تصنیفی اشتغال اور علمی انہماک، سلیس و واضح، شیریں اور شگفتہ اردو و عربی تحریر پر قدرت تھی، دین وملت کی خدمت کا جذبہ اور اجتماعی کاموں کا ذوق و صلاحیت، مطالعہ اور تصنیف کی محویت، ایک بڑی اور ہمہ گیر تحریک وادارہ ندوۃ العلماء اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کی ذمہ داری اپنے ذمہ لی، اور پوری تندہی سے اس کام کو پورا کیا۔

مولانا ۱۸ر رمضان المبارک ۱۲۸۶ھ مطابق ۲۲ر دسمبر ۱۸۶۹ء میں دائرہ شاہ علم اللہ میں بیرون شہر رائے بریلی میں پیدا ہوئے، آپ کا نام سید احمد رکھا گیا، لیکن مشہور عبدالحی کے نام سے ہوئے، خاندان کے بڑے ان کو سید اور چھوٹے سید میاں کے نام سے پکارتے تھے، آپ کا نشو ونما خاندان کے ایسے علمی و دینی ماحول میں ہوا کہ دادھیال دائرہ شاہ علم اللہ میں حضرت شاہ ضیاء النبی اور آپ کے والد ماجد مولانا سید فخر الدین جیسے مشائخ موجود تھے، اور نانیہال ہنسوہ ضلع فتح پور میں حضرت شاہ سید عبدالسلام خلیفۂ اجل شاہ احمد سعید دہلوی نقشبندی کی ذات بابرکات مرجع خاص و عام بنی ہوئی تھی، ان بزرگوں کی قرابت قریبہ اور ان کی توجہات نے نیز آپ کے علمی و دینی شوق، رشد و سعادت نے آپ کو علم وعمل اور ذہانت و ذکاوت میں رسوخ تام عطا کیا تھا۔

ابتدائی تعلیم ہنسوہ اور رائے بریلی میں حاصل کر کے الہ آباد گئے، وہاں دو سال رہ کر مولانا شاہ محمد حسین الہ آبادی اور دوسرے علماء سے علم حاصل کیا، وہاں سے فتح پور

---

(۱) حیات عبدالحی ص/ ۴۷-۴۸ مطبوعہ سید احمد شہید اکیڈمی رائے بریلی

گئے، اور مولانا نور محمد صاحب پنجابی سے فقہ پڑھی، ۱۳۰۱ھ میں جب آپ کی عمر پندرہ سال کی ہوئی تو بھوپال گئے اور وہاں رہ کر مشہور علماء سے علوم عالیہ کی تعلیم حاصل کی، ۱۳۰۳ھ میں وطن واپس ہوئے اور لکھنؤ میں مولانا محمد نعیم فرنگی محلی سے علم حاصل کیا، کچھ عرصہ کانپور میں رہ کر حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے چند کتابیں پڑھیں، مولانا تھانوی اس وقت جامع العلوم کانپور میں مدرس تھے۔

مولانا کے اساتذہ میں مولانا محمد نعیم فرنگی محلی کے علاوہ مولانا امیر علی، مولوی الطاف حسین، مولوی فتح محمد تائب، مولانا احمد شاہ ولایتی، مولانا فضل اللہ فرنگی محلی بھی موجود تھے۔

۱۳۰۹ھ میں آپ کے ماموں مولانا سید عبدالعزیز ہنسوی کی صاحبزادی سے آپ کا نکاح ہوا، نکاح کے بعد دوبارہ بھوپال گئے اور مولانا سید احمد دہلوی سے ریاضی پڑھی، اور مولانا عبدالحق سے بقیہ درسی کتب پڑھیں، اور شیخ محمد عرب اور شیخ حسین بن محسن الیمانی سے حدیث کی تحصیل کی۔ ۱۳۱۱ھ میں لکھنؤ کے مشہور طبیب حکیم عبدالعلی، حکیم عبدالعزیز صاحب سے طب پڑھی۔

۱۳۱۲ھ میں دہلی اور اس کے اطراف کا سفر کیا، اور مولانا سید نذیر حسین محدث کے درس حدیث میں شرکت کی، (اور حدیث کی اجازت لی، اسی سفر میں گنگوہ بھی گئے، اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے حدیث مسلسل بالاولیہ کی اجازت لی) (۱)۔

بیعت وارشاد میں حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ سے بیعت عثمانی کی اور اوایس زمانہ حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ کی زیارت کر کے ان سے شرف بیعت حاصل کیا، اپنے والد ماجد مولانا سید فخر الدین خیالی، حضرت شاہ ضیاء النبی تکیوی، اور حاجی امداداللہ مہاجر مکی سے اجازت حاصل ہوئی۔

۱۳۱۳ھ میں ندوۃ العلماء کے رکن پھر مددگار ناظم مقرر ہوئے۔

---

(۱) اس سفر کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: کتاب ''دہلی اور اس کے اطراف'' از مولانا عبدالحی حسنی، مطبوعہ اردو اکاڈمی دہلی (م)۔

۱۳۳۴ھ میں بکثرت آراء ناظم ہوئے، ان کے دور نظامت میں ندوہ اور دارالعلوم میں بڑی خوش آئند تبدیلیاں ہوئیں، اور ندوہ نے ہر طرح ترقی کی اور نام پیدا کیا، الغرض مولانا ۱۳۱۳ھ سے اپنی وفات ۱۳۴۱ھ تک ربع صدی سے زائد مختلف حیثیتوں سے ندوۃ العلماء سے وابستہ رہے، اور سرد و گرم، عسر و یسر، تنزل و ترقی، اور انتشار و یکجہتی میں یکساں طور پر اس کے ہم سفر اور دم ساز و غم گسار رہے، اور ہر دم ولحظہ اس کی تعمیر و ترقی میں منہمک رہے۔

مولانا نے پہلا نکاح ۱۳۰۹ھ میں کیا تھا، ان سے ایک صاحبزادہ مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی ہوئے، ان کی عمر جب آٹھ سال کی ہوئی تو اہلیہ محترمہ کا انتقال ہو گیا، تقریباً ۱۳ رسال بعد اپنے والد ماجد کے اصرار پر حضرت شاہ ضیاء النبی رحمۃ اللہ علیہ کی صاحبزادی سیدہ خیر النساء (۱) سے دوسرا عقد کیا، جن سے ایک صاحبزادہ مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی اور دو صاحبزادیاں محترمہ سیدہ امۃ العزیز (۲) اور محترمہ سیدہ امۃ اللہ تسنیم (۳) ہوئیں۔

مولانا سید عبدالحی بڑے متوکل تھے، معاش کی خاطر طبابت کی، ان کی حذاقت مسلّم تھی، اور رجوع عام تھا، مگر استغناء اتنا تھا کہ اپنی طبابت کے چمکانے اور اس کے

---

(۱) محترمہ سیدہ خیر النساء بہتر صاحبہ حافظۂ قرآن اور خوش اوقات ذاکر و شاغل بی بی تھیں، شعر و سخن کا ذوق رکھتی تھیں، مگر صرف دعا و مناجات ہی کہتی تھیں، اپنی یادگار میں اولاد کے علاوہ تصنیفات میں باب رحمت، القضاء والقدر، حسن معاشرت چھوڑیں، اگست ۱۹۶۸ء میں ۹۳ سال کی عمر میں انتقال کیا، ان کے حالات میں ''ذکر خیر'' نام کی کتاب مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی تصنیف ہے۔

(۲) محترمہ سیدہ امۃ العزیز بڑی صابر و شاکر بی بی ہیں، ان کی تصنیفات میں حضرت اسماء، کشکول، ملفوظات اور مناجات عزیز ہیں، راقم سطور اور برادران عزیزان مولوی سید محمد رابع حسنی استاد ادب دارالعلوم ندوۃ العلماء اور مولوی سید محمد واضح رشید ندوی مدیر ''الرائد'' و استاد ادب دارالعلوم ندوۃ العلماء کی والدہ ہیں، مدظلہا العالی۔

(۳) محترمہ سیدہ امۃ اللہ تسنیم صاحبہ کا نام عائشہ تھا، انھوں نے باقاعدہ دینی و عربی تعلیم حاصل کی اور شعر و سخن کا ذوق پایا، تسنیم تخلص کرتی تھیں، حدیث کی مشہور کتاب ریاض الصالحین کا اپنے برادر مکرم ڈاکٹر سید عبدالعلی مرحوم کے حکم سے ترجمہ کیا جس کا نام ''زاد سفر'' ہے، دو جلدوں میں ہے، بڑا سلیس اور شگفتہ ترجمہ ہے، اور مختلف مدارس میں داخل درس ہے، اس کے علاوہ حمد و سلام اور ان مناجاتوں کے مجموعے بھی ہیں، جن میں ابر کرم، موج تسنیم، اسمائے حسنیٰ، اور قصص و حکایات میں قصص الانبیاء، حضرت عائشہ ہیں، بڑی ذاکر و شاغل اور ذی علم خاتون تھیں، ۲۸ رجنوری ۱۹۷۶ء کو ۶۸ رسال کی عمر میں انتقال کیا۔

تلخیص الاخبار'' (۱)، تذکرۃ الابرار، کتاب الغناء، قرابادین، شرح سبع معلقہ، ریحانۃ الادب و شمامۃ الطرب، رسالہ دربیان سلاسل خانوادۂ نقشبندیہ، تعلیقات علی سنن أبی داؤد، القانون فی انتفاع المرتهن بالمرهون، الثقافة الاسلامية فی الهند (معارف العوارف) اور ''الهند فی العهد الاسلامی'' (جنة المشرق) بھی آپ کی تصانیف ہیں۔

والد ماجد مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلیؒ

مولانا حکیم سید عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ کے سب سے بڑے صاحبزادہ تھے، صاحب کتاب محمد میاں کے والد ماجد اور ندوۃ العلماء کے ناظم تھے، ان کے چھوٹے بھائی مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی ان کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''وہ اپنی بہت سی خصوصیات و کمالات کی وجہ سے ایک نادرۂ روزگار شخصیت تھے، جس میں قدیم و جدید تہذیب و ثقافت اور مشرقی و مغربی علوم کا نہایت حسین اور دل آویز امتزاج نظر آتا ہے، جو ''مرج البحرين يلتقيان بينهما برزخ لا يبغيان'' کی ایک عملی تفسیر تھا، ان کی زندگی میں مسلمان نوجوان، مدارس دینیہ کے فضلاء، عصری جامعات، یونیورسٹیوں کے فارغین اور ملی اداروں کے سربراہوں کے لیے بہت سے سبق اور قابل تقلید نمونے ہیں۔'' (۲)

ڈاکٹر صاحب ۲۲ رجمادی الاولیٰ ۱۳۱۱ھ کو ہنسوہ (فتح پور) میں پیدا ہوئے، بچپن کا زیادہ تر زمانہ نانیہال ہنسوہ ضلع فتح پور میں اپنے ماموں مولانا سید ابوالقاسم اور دادھیال دائرہ شاہ علم اللہ میں اپنے دادا مولانا حکیم سید فخر الدین کی خدمت میں گزرا،

ذریعہ آمدنی کے اضافہ کی کبھی فکر نہیں کی، بلکہ ملکی، ملّی اور دینی کاموں اور درس و تدریس، تصنیف وتالیف میں زیادہ تر وقت صرف کرتے، ابتدا میں دارالعلوم میں تعلیم ادب و افتاء میں وقت لگایا، مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ سے مقامات حریری پڑھی تھی، اور اس تلمذ پر ان کو ناز تھا، ادب، حدیث، قرآن، طب کا درس مسلسل دیتے رہتے تھے، وعظ کہنے کا بھی معمول تھا، مولانا کا وعظ دل پذیر سادہ اور مؤثر ہوتا تھا۔

دوست اور احباب میں نواب سید نورالحسن صاحب کے علاوہ منشی خلیل نہٹوری، منشی رحمت اللہ، منشی عبدالغنی، مولوی نعیم الدین ہنسوی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، ان میں نواب سید نورالحسن صاحب کا تعلق صرف ان ہی تک محدود نہیں رہا بلکہ ان کی اولاد سے مولانا کی اولاد کا تعلق اسی طرح قائم رہا، ان کے صاحبزادہ سید نجم الحسن کا تعلق ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی اور مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی سے اور سید نجم الحسن کے صاحبزادہ قاری سید رشید الحسن (۱) کا تعلق ڈاکٹر صاحب کے صاحبزادہ مولانا سید محمد الحسنی (محمد میاں) سے بالکل گھر کا سا رہا ہے، اور اسی تعلق کا کرشمہ ہے کہ قاری صاحب موصوف کا عقد مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کی بھانجی سے ہوا۔

مولانا سید عبدالحی صاحب بڑے حلیم، متین، صابر وشاکر، متوکل، خلوت پسند، سخی، حق گو اور متقی تھے، آپ کا انتقال جمادی الاخریٰ ۱۳۴۱ھ فروری ۱۹۲۳ء کو لکھنؤ میں ہوا، اور تدفین حضرت شاہ علم اللہ کے روضہ میں شاہ صاحب موصوف کے پائنتی ہوئی، اپنے پیچھے فرزندوں کے علاوہ بہت سی تصانیف یادگار چھوڑیں، جن میں "نزھۃ الخواطر" کی آٹھ ضخیم جلدیں تاریخ وسیرت میں انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہیں، اس کتاب کے علاوہ "یادِ ایام" (تاریخ گجرات)، "تھذیب الاخلاق" (احادیث مبارکہ کا مجموعہ) اور اس کی شرح (عربی میں) "منتھیٰ الافکار فی شرح

(۱) قاری سید رشید الحسن صاحب نے کچھ عرصہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں قرآن مجید کی تعلیم دی، پھر وہ پاکستان منتقل ہوگئے اور کراچی میں نیوٹاؤن کی جامع مسجد میں امام وخطیب رہے اور وہیں انتقال کیا۔ (م)

علمی وروحانی ماحول کی وجہ سے نیک صحبتوں اور سنجیدہ اور ادب آموز مجلسوں کے بہتر مواقع ملے، ابتدائی تعلیم ہنسوہ میں حاصل کی، اور مکتب نشینی مولانا عبدالحکیم کیرانوی کے پاس ہوئی، آٹھ سال کی عمر تھی کہ والدہ صاحبہ کا انتقال ہوگیا، ہنسوہ میں قرآن مجید ناظرہ ختم کیا، اور پھر عربی شروع کردی، فارسی اپنے فاضل دادا سے پڑھی، ابتدائی تعلیم کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے، اور ادب عربی مولانا سید علی زینبی سے، فقہ و اصول مولانا شبلی جیراجپوری سے علم ہیئت مولانا سلطان محمد کابلی سے، اقلیدس مولانا شیر علی حیدرآبادی سے اور بعض درسیات اپنے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی سے پڑھیں، محدث جلیل شیخ حسین بن محسن انصاری لکھنؤ آئے تو ان کو اوّلیات سنا کر حدیث کی اجازت لی، دارالعلوم دیوبند میں اس وقت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ رونق افروز تھے، ان کی خدمت میں گئے اور مشہور اساتذہ حدیث سے حدیث کی تکمیل کی، وہاں ایک سال قیام کیا، اور بخاری وترمذی مولانا محمود حسن دیوبندی سے، ابوداؤد مولانا انورشاہ کشمیری سے پڑھی۔

۱۳۳۰ھ میں لکھنؤ واپس ہوئے، اور طب کی ساری متداول کتابیں اپنے والد ماجد سے پڑھیں، اور مزید تجربہ اور ملکہ حاصل کرنے کے لیے حکیم اجمل خاں کے پاس گئے، اور چھ ماہ ان کے مطب میں بیٹھے اور ساتھ ساتھ ڈاکٹر مختار احمد انصاری سے ڈاکٹری کی معلومات حاصل کیں۔

۲۱ر سال کی عمر میں وہ جب دینی تعلیم اور طب کے حصول سے فارغ ہوئے تو ان کی شادی ۳۰ر مارچ ۱۹۱۲ء کو مولانا سید ابوالقاسم ہنسوی زیدی واسطی کی صاحبزادی سے ہوئی، شادی کے بعد انگریزی شروع کی، اور اس میں مہارت پیدا کرکے ایلوپیتھک پڑھی، اور M.B.B.S. کیا، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

تلخیص الاخبار"(۱)،تذکرة الابرار، کتاب الغناء،قرابادین،شرح سبع معلقہ، ریحانة الادب و شمامة الطرب، رسالہ دربیان سلاسل خانوادۂ نقشبندیہ، تعلیقات علی سنن أبی داؤد، القانون فی انتفاع المرتهن بالمرهون، الثقافة الاسلامية فی الهند (معارف العوارف)اور"الهند فی العهد الاسلامی" (جنة المشرق) بھی آپ کی تصانیف ہیں۔

والد ماجد مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلیؒ

مولانا حکیم سید عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ کے سب سے بڑے صاحبزادہ تھے، صاحب کتاب محمد میاں کے والد ماجد اور ندوۃ العلماء کے ناظم تھے، ان کے چھوٹے بھائی مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی ان کے متعلق لکھتے ہیں:

> "وہ اپنی بہت سی خصوصیات و کمالات کی وجہ سے ایک نادرۂ روزگار شخصیت تھے، جس میں قدیم وجدید تہذیب وثقافت اور مشرقی ومغربی علوم کا نہایت حسین اور دل آویز امتزاج نظر آتا ہے، جو"مرج البحرين يلتقيان بينهما برزخ لا يبغيان" کی ایک عملی تفسیر تھا، ان کی زندگی میں مسلمان نوجوان، مدارس دینیہ کے فضلاء، عصری جامعات، یونیورسٹیوں کے فارغین اور ملی اداروں کے سربراہوں کے لیے بہت سے سبق اور قابل تقلید نمونے ہیں۔"(۲)

ڈاکٹر صاحب ۲۲/جمادی الاولیٰ ۱۳۱۱ھ کو ہنسوہ (فتح پور) میں پیدا ہوئے، بچپن کا زیادہ تر زمانہ نانیہال ہنسوہ ضلع فتح پور میں اپنے ماموں مولانا سید ابوالقاسم اور دادھیال دائرہ شاہ علم اللہ میں اپنے دادا مولانا حکیم سید فخرالدین کی خدمت میں گزرا،

---

(۱) تلخیص الاخبار حدیث کا مجموعہ ہے جسے انھوں نے کتب صحاح سے مرتب کیا تھا جو تہذیب الاخلاق کے نام سے شائع ہوا، اور اس کی شرح "تنویر الآفاق" کے نام سے زیر طبع ہے۔(م)

(۲) حیات عبدالحی ص/۳۳۲۔

علمی وروحانی ماحول کی وجہ سے نیک صحبتوں اور سنجیدہ اور ادب آموز مجلسوں کے بہتر مواقع ملے، ابتدائی تعلیم ہنسوہ میں حاصل کی، اور مکتب نشینی مولانا عبدالحکیم کیرانوی کے پاس ہوئی، آٹھ سال کی عمر تھی کہ والدہ صاحبہ کا انتقال ہوگیا، ہنسوہ میں قرآن مجید ناظرہ ختم کیا، اور پھر عربی شروع کردی، فارسی اپنے فاضل دادا سے پڑھی، ابتدائی تعلیم کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے، اور ادب عربی مولانا سید علی زینبی سے، فقہ و اصول مولانا شبلی جیراجپوری سے علم ہیئت مولانا سلطان محمد کابلی سے، اقلیدس مولانا شیر علی حیدرآبادی سے اور بعض درسیات اپنے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی سے پڑھیں، محدث جلیل شیخ حسین بن محسن انصاری لکھنؤ آئے تو ان کو اوّلیات سنا کر حدیث کی اجازت لی، دارالعلوم دیوبند میں اس وقت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ رونق افروز تھے، ان کی خدمت میں گئے اور مشہور اساتذۂ حدیث سے حدیث کی تکمیل کی، وہاں ایک سال قیام کیا، اور بخاری وترمذی مولانا محمود حسن دیوبندی سے، ابوداؤد مولانا انور شاہ کشمیری سے پڑھی۔

۱۳۳۰ھ میں لکھنؤ واپس ہوئے، اور طب کی ساری متداول کتابیں اپنے والد ماجد سے پڑھیں، اور مزید تجربہ اور ملکہ حاصل کرنے کے لیے حکیم اجمل خاں کے پاس گئے، اور چھ ماہ ان کے مطب میں بیٹھے اور ساتھ ساتھ ڈاکٹر مختار احمد انصاری سے ڈاکٹری کی معلومات حاصل کیں۔

۲۱ر سال کی عمر میں وہ جب دینی تعلیم اور طب کے حصول سے فارغ ہوئے تو ان کی شادی ۳۰ر مارچ ۱۹۱۲ء کو مولانا سید ابوالقاسم ہنسوی زیدی واسطی کی صاحبزادی سے ہوئی، شادی کے بعد انگریزی شروع کی، اور اس میں مہارت پیدا کرکے ایلوپیتھک پڑھی، اور M.B.B.S. کیا، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

> ''جبکہ اس کا پورا موقع تھا کہ آپ اپنی گزشتہ تعلیم سے جس میں پوری محنت اور بلند ہمتی سے کام لیا اور اس میں کامل استعداد بہم پہنچائی تھی، فائدہ اٹھائیں، اور کوئی تدریسی مشغلہ اختیار کریں،

یا مطب شروع کریں، آپ کا از سر نو تعلیم جدید کے ایک طویل و عریض میدان میں جس کے لیے عمر کا ابتدائی حصہ زیادہ موزوں ہوتا ہے، مردانہ وار قدم رکھنا اور علوم عربیہ کا فاضل، ندوہ اور دیوبند کا فارغ اور طب کا عالم ہونے کے بعد انگریزی کے ابجد سے تعلیم کا آغاز کرنا ایک بڑا دلیرانہ اقدام اور بڑی مردانگی کا کام تھا، آپ نے نہایت خاموشی کے ساتھ انگریزی کی ابتدائی کتابیں بعض انگریزی دانوں سے پڑھ لی تھیں، اور اتنی استعداد پیدا کر لی تھی کہ انگریزی اسکول کے نویں درجہ میں داخلہ ہو سکے۔"(۱)

ڈاکٹر صاحب نے نویں کلاس سے پڑھنا شروع کیا اور ۱۹۱۵ء میں میٹریکولیس کا امتحان نمایاں کامیابی کے ساتھ دیا، اور پھر انگلش لٹریچر، بیالوجی، فزکس، کیمسٹری میں انٹرمیڈیٹ کیا، اس کے بعد .B.S.C کیا اور امتیازی تمغے حاصل کیے، اور پھر ڈاکٹری (.M.B.B.S) کر کے ڈاکٹر ہو گئے، اس پوری مدت میں آپ کے اخلاق و معاشرت اور طرز رہائش کیا رہی، مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کے الفاظ میں پڑھیے:

"آپ اسکول میں داخل ہو گئے اور تعلیم شروع ہو گئی، لیکن آپ نے اپنی وضع، لباس اور معمولات میں ذرہ برابر فرق نہیں آنے دیا، اور یہی حال میڈیکل کالج کی آخری تعلیم تک رہا، پاؤں میں دلی کا سلیم شاہی جوتا، بدن پر گاڑھے کا شرعی کرتا اور پائجامہ، سر پر دو پلی یا کشتی نما ٹوپی، گاڑھے کی اچکن، منہ پر پوری شرعی داڑھی، نمازوں کی پابندی، اس وضع داری اور متانت کی وجہ سے اساتذہ بھی آپ کا لحاظ اور طلبہ بھی احترام کرتے۔"(۲)

---

(۱) حیات عبدالحی ص/۳۵۵۔ (۲) ایضاً ص/۳۵۶۔

میڈیکل کالج کے چوتھے سال جبکہ ڈاکٹر صاحب طلبہ کی ایک پارٹی کے ساتھ مدراس گئے تھے کہ اچانک ان کے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب کا انتقال ہوگیا، ڈاکٹر صاحب کوکئی دن بعد سفر ہی کے دوران وفات کی خبر ملی، بہت افسردہ خاطر ہوکر وطن واپس ہوئے، اور بڑے صبر وتحمل اور ثبات قدمی کے ساتھ ڈاکٹری کی تعلیم مکمل کی، اس پوری مدت میں نواب صدیق حسن خاں حسینی قنوجی کے صاحبزادوں نواب سید نورالحسن اور نواب سید علی حسن کے گھر والوں نے بڑی ہمدردی اور غمگساری کا معاملہ کیا، اور اپنے معزز کنبہ کا ایک فرد بنالیا، یکسوئی اور انہماک کے ساتھ مطالعہ کرنے کے لیے اپنی عالیشان کوٹھی بھوپال ہاؤس کا ایک حصہ حوالہ کردیا، مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی اس دور کا حال لکھتے ہیں:

> ''راقم الحروف کو اس زمانہ میں بھائی صاحب کے ساتھ مسلسل اور طویل قیام کرنے کا موقع ملا، بیگم صاحبہ مرحومہ کی شفقتوں اور ان کے گرامی قدر صاحبزادوں (نواب سید ظہور الحسن صاحب اور نواب سید نجم الحسن صاحب) کی برادرانہ نوازشوں کی یاد ابھی تک دل پر نقش ہے، اور اس کی نظیر اس زمانہ کی بے ثبات دوستیوں اور سطحی تعلقات کے عہد میں نہیں مل سکتی۔''(۱)

ڈاکٹر صاحب نے ۱۳۴۳ھ/ ۱۹۲۵ء میں والد ماجد کی وفات کے دو سال بعد میڈیکل کالج کے آخری سال کا امتحان دیا، اور کامیاب ہوئے، ربیع الثانی ۱۳۴۴ھ نومبر ۱۹۲۵ء کو سند ملی، ۱۳۴۴ھ جنوری ۱۹۲۶ء سے گوئن روڈ لکھنؤ پر والد کے قدیم مطب کے قریب مطب کا آغاز کیا، اور وفات ۱۹۶۱ء تک برابر مطب کرتے رہے، اور شہر کے کامیاب معالجوں، طبیبوں اور ڈاکٹروں میں ان کا شمار ہونے لگا۔

---

(۱) حیات عبدالحی ص/ ۳۶۷۔

اسی سال حج کو تشریف لے گئے اور شاہ ابن سعود سے ملاقات کی، اور علماء و مشائخ سے علمی استفادہ کیا، کتب خانوں کی سیر کی، اور حج کر کے واپس ہوئے۔

۱۱ر جمادی الاولیٰ ۱۳۴۲ھ کو ندوۃ العلماء کے رکن انتظامی منتخب ہوئے، ۱۳۴۷ء / ۱۹۲۸ء میں نائب ناظم مقرر ہوئے، محرم ۱۳۵۰ھ جون ۱۹۳۱ء سے ناظم ندوۃ العلماء کا عہدہ پایا، جس پر آخر دم تک سرفراز رہے۔

ڈاکٹر صاحب کا دور نظامت بڑا کامیاب رہا، ان کے دور نظامت میں نصاب تعلیم کی اصلاح ہوئی، دنیائے عرب کی مشہور شخصیات کی آمد و رفت ہوئی، مسجد کی تعمیر ہوئی، دار العلوم کے طلبہ و فضلاء میں عربی کے متعدد ادیب اور انشاء پرداز پیدا ہوئے، جن کی شہرت ہندوستان کے حدود سے متجاوز ہو کر بلاد عربیہ تک پہنچی، عربی کے مشہور رسالے ندوہ سے نکلے۔

ڈاکٹر صاحب ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے، ان کو گھر سے لے کر ندوہ اور اس ادارے سے لے کر ہندوستان کی درس گاہوں، مسلمان جماعتوں اور تحریکوں، غیر مسلموں میں اسلام کی تبلیغ، بلاد عربیہ کی تعلیمی، دینی اور سیاسی حالات کی فکر دامن گیر رہتی تھی، اور وہ اخبارات کے ذریعہ ہر چیز سے باخبر رہتے تھے۔

۱۹۵۶ء سے ڈاکٹر صاحب علیل رہنے لگے، ضعف و نقاہت بڑھنے لگی، مسلسل ایسے حوادث پیش آئے جنھوں نے صحت و عافیت کو ختم کر دیا؛ اہلیہ کا انتقال، مرشد برحق حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کا انتقال اور دوسرے افکار کی وجہ سے بیمار رہنے لگے۔

۷/مئی ۱۹۶۱ء کو اپنے مکان واقع گوئن روڈ لکھنؤ میں انتقال کیا، اس وقت ان کی عمر ۷۰ر سال کی تھی، نعش رائے بریلی لائی گئی، اور روضہ شاہ علم اللہ تکیہ کلاں رائے بریلی میں حضرت شاہ علم اللہ کے سرہانے مدفون ہوئے، رحمه الله رحمة واسعة.

پسماندگان میں ایک فرزند مولوی سید محمد الحسنی معروف بہ ''محمد میاں'' جن کے حالات پر یہ کتاب پیش خدمت ہے، اور پانچ صاحبزادیاں چھوڑیں، ان سب کی شادیوں سے ڈاکٹر صاحب نے اپنی زندگی اور دور صحت و عافیت میں فراغت پالی تھی،

اور ماشاء اللہ سب صاحب اولاد ہیں۔(۱)

عم مکرم مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی

٭ مولانا سید عبدالحی کے عالی مرتبت چھوٹے فرزند جن کا نام نامی مولانا سید

---

(۱) ۱- سب سے بڑی صاحبزادی (سیدہ حمیراء) کی شادی رشتہ کے خالہ زاد بھائی سید محمد مسلم حسنی (فرزند حافظ سید عبداللہ حسنیؒ) سے ہوئی جن سے دو صاحبزادیاں اور تین صاحبزادے ہوئے، صاحبزادوں میں سب سے بڑے سید حسن حسنی، منجھلے سید حسین حسنی (مرحوم) اور چھوٹے سید احمد حسنی ندوی ہیں۔

۲- دوسری صاحبزادی (سیدہ فاطمہ) کی شادی مولانا سید محمد طاہر منصور پوری سے ہوئی، جن سے تین صاحبزادے اور ایک صاحبزادی ہیں، سب سے بڑے مولوی حافظ سید سلمان ندوی، دوسرے سید محمد اسحق ندوی (مرحوم)، تیسرے حافظ سید محمد صہیب ندوی ہیں۔

۳- تیسری صاحبزادی راقم الحروف محمد ثانی کے عقد میں آئیں، جن سے ایک بیٹی اور ایک بیٹا ہوا، بیٹے کا نام مولوی سید محمد حمزہ حسنی ندوی ہے، جو اس وقت ماہنامہ رضوان کے مدیر و مرتب ہیں۔

۴- چوتھی صاحبزادی کا عقد مولوی سید محمد رابع حسنی ندوی سے ہوا، جن سے تین صاحبزادیاں ہیں۔

۵- پانچویں صاحبزادی کا عقد مولوی سید محمد واضح رشید حسنی ندوی سے ہوا، جن سے ایک فرزند مولوی حافظ سید محمد جعفر ندوی ہوئے۔

۶- محمد میاں کی اولاد کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

(مصنف علیہ الرحمہ نے مولانا محمد الحسنیؒ کی بہنوں اور ان کی اولاد کا تذکرہ کیا ہے، یہ سب بہنیں مصنف علیہ الرحمہ کی حیات میں بقید حیات تھیں پھر سب سے بڑی بہن سیدہ حمیرہ بی (اہلیہ سید محمد مسلم حسنی مرحوم) نے جون ۱۹۹۴ء میں، سیدہ رقیہ بی (اہلیہ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی) نے رمضان ۱۴۱۶ھ فروری ۱۹۹۶ء میں، سیدہ فاطمہ بی والدہ مولانا سید سلمان حسینی ندوی (اہلیہ مولانا سید محمد طاہر منصور پوری مرحوم) نے نومبر ۱۹۹۸ء میں، سیدہ خدیجہ بی والدہ مولانا سید محمد حمزہ حسنی ندوی (اہلیہ مصنف علیہ الرحمہ) نے اگست ۱۹۹۹ء میں، سیدہ سکینہ بی والدہ مولانا سید جعفر مسعود حسنی (اہلیہ مولانا سید واضح حسنی ندوی مدظلہ) نے ۲۰۰۵ء میں وفات پائی، یہ سب بہنیں دین کے علم اور اس پر عمل، ادبی ذوق اور اشاعت اسلام اور انسانوں کی ہدایت کے جذبہ اور مسلمانوں کے مسائل سے دلچسپی اور فکر مندی کی صفات سے متصف تھیں اور مولانا سید محمد الحسنی ان سب کے بڑے محبوب اور قابل فخر بھائی اور ان کی اولاد کے شفیق اور مربی ماموں تھے، افسوس کہ صاحب تذکرہ کے ان بھانجوں اور بھانجیوں میں دو بھانجیاں (سیدہ زہراء بنت سید محمد مسلم حسنی مرحوم و سیدہ امامہ بنت مولانا سید محمد ثانی حسنی مرحوم اور تین بھانجے راقم کے والد ماجد سید حسن حسنی، سید حسین حسنی، اور مولانا سید اسحاق حسینی ندوی بھی ہمارے درمیان نہیں ہیں اور اپنے مالک حقیقی کی دعوت کو لبیک کہہ چکے ہیں، اور صرف یہی نہیں صاحب تذکرہ کے خلف اکبر داعی اسلام مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ بھی راہی ملک بقا ہو کر اپنے رب کے جوار رحمت میں ہیں، رحمہم اللہ تعالی رحمۃ واسعۃ و ادخلہم مع الابرار المتقین فی النعیم۔) (م)

ابوالحسن علی حسنی ندوی ہے، وہ اپنے والد ماجد کی سب سے چھوٹی اولاد ہیں، مولانا ابوالحسن علی ندوی پیدا ہوئے تو ان کے نانا حضرت شاہ ضیاء النبی (م-۱۹۰۶ء) اور دادا مولانا حکیم سید فخر الدین خیالی (م-۱۹۰۸ء) انتقال فرما چکے تھے، والدین کا سایہ سر پر تھا، اور بڑے بھائی زیر تعلیم تھے، اور ان کی شادی ہو چکی تھی، والد ماجد عالم و فاضل شخصیت کے مالک تھے، اور والدہ ماجدہ ایک بڑے شیخ کی بیٹی اور خود عالمہ و فاضلہ اور خوش اوقات خاتون تھیں، جو ایک طرف رابعہ صفت بی بی تھیں تو دوسری طرف شعر و سخن سے واقف تھیں، انھوں نے اپنے بیٹے کی تعلیم و تربیت کا بڑا اہتمام کیا، ذہانت و ذکاوت اور علم سے تعلق اپنے بزرگوں سے ورثہ میں پایا تھا، اور بعض صلاحیتیں خداداد ملی تھیں، اس لیے بہت کم عمری میں علم و عمل کی راہوں کو طے کیا۔

فروری ۱۹۲۳ء (۱۳۴۱ھ) میں ۹/سال کے تھے (۱) کہ والد ماجد کا اچانک انتقال ہو گیا، یہ حادثہ ان کے لیے اور سارے گھر کے لیے نہایت سخت تھا، والد کے انتقال کے بعد اپنے بڑے بھائی کے ساتھ مسکونہ مکان چھوڑ کر گھسیاری منڈی لکھنؤ کے بھوپال ہاؤس میں قیام کیا، اور دو سال تک وہاں رہ کر اپنی تعلیم جاری رکھی، ۱۹۲۶ء میں محمد علی لین گوئن روڈ میں منتقل ہوئے، قریب ہی مکان میں شیخ خلیل عرب مقیم تھے، اس وقت شیخ خلیل عرب لکھنؤ یونیورسٹی میں عربی زبان و ادب کے استاد تھے، یونیورسٹی جانے سے پہلے اور آنے کے بعد خانگی مدرسہ لگاتے تھے، ان سے پڑھنے والوں میں ہر طبقہ اور ہر علم کے لوگ تھے، ڈاکٹر صاحب سے پرانے تعلقات تھے، اس لیے انھوں نے اپنے برخوردار مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی کو ان کے سپرد کیا، مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی نے جن کی عمر اس وقت بارہ سال تھی، ان سے عربی کی بسم اللہ کی، (۲)

(۱) مولانا کی پیدائش ۶/محرم الحرام ۱۳۳۲ھ مطابق ۵/دسمبر ۱۹۱۳ء (جمعہ) کی ہے، ایک روایت ۱۹۱۴ء/۱۳۳۳ھ کی بھی بیان کی جاتی ہے۔ (م)

(۲) تسمیہ خوانی کی رسم چچا مولانا عزیز الرحمٰن صاحب نے ادا کرائی تھی، اور ان سے ہی مولانا نے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی، ماموں زاد بھائیوں مولانا سید ابوالخیر اور حافظ سید حبیب الرحمٰن صاحب نے بھی ان کو تعلیم دی۔

اور تھوڑے ہی دن بعد عربی زبان کی پہلی کتاب "المطالعة العربية" شروع کرادی، اس کے ختم کرنے کے بعد "مدارج القراءة" (بیروت) کا دوسرا حصہ اور "الطريقة المبتكرة" کے تین حصے درساً درساً اور دو حصے مطالعہ کے طور پر پڑھائے، اس کے بعد انھوں نے ابن مقفع کی ''کلیلہ ودمنہ'' شروع کرادی، اور صرف ونحو کی عملی مشق کے لیے شیخ ابوالحسن علی الضریر کی کتاب ''ضریری'' پڑھائی، کلیہ ودمنہ کے بعد "مجموعة من النظم والنثر للحفظ والتسميع" شروع کرادی، اور روزانہ جو سبق دیتے، دوسرے دن زبانی سنتے تھے، اس طرح دو سال تک صرف زبان وادب کی تعلیم حاصل کرتے رہے، اور عرب صاحب کے گھر عربی بولتے، عربی سوچتے اور لکھتے رہے، ادب کی متوسط کتابوں کے ختم کرانے کے بعد عرب صاحب نے قرآن شریف کا وہ حصہ پڑھایا جس کا مرکزی مضمون ''توحید'' ہے، چن کر سورۂ زمر اور اس کے بعد کی چند سورتیں پڑھائیں، اس کے ساتھ ''صحیح مسلم'' میں "كتاب المغازی" پڑھائی، نظم میں حماسہ، لامیۃ العرب، قصیدۂ بانت سعاد، دیوان سقط الزند پڑھایا، اور پھر "خلاصة تاريخ آداب اللغة العربية" پڑھائی، اس کے بعد ''مقامات حریری'' کے چند باب، نہج البلاغۃ، دلائل الاعجاز اور دوسری اہم کتابیں پڑھائیں، تعلیم وتعلم کا یہ سلسلہ ۱۹۲۸ء تک چلتا رہا، ۱۹۲۹ء میں فاضل ادب کا امتحان دیا، اور کامیاب ہوئے۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ سے نیاز مندی ۱۹۲۳ء ہی سے شروع ہوگئی تھی، اور یہ تعلق بڑھتا گیا، حتی کہ ان سے "هداية الحكمة" یا ''ہدیہ سعیدیہ'' بھی پڑھی، ۱۹۲۹ء میں جب حدیث کی اعلیٰ تعلیم شروع کی تو دارالعلوم ندوۃ العلماء کے شیخ الحدیث اور مہتمم مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی (جن کا درس حدیث بڑا مشہور تھا) سے صحیحین (صحیح بخاری ومسلم) اور سنن ابوداؤد وسنن ترمذی پڑھی، کچھ حصہ ''بیضاوی'' کا بھی پڑھا، اور کچھ اسباق منطق کے بھی، مولانا حیدر حسن خاں صاحب سے تعلیم کا یہ سلسلہ دو سال تک چلتا رہا، ۱۹۲۹ء میں اپنے پھوپھا مولانا سید طلحہ صاحب ایم. اے. (جو اورینٹل کالج لاہور میں پروفیسر

تھے) کے ساتھ لاہور گئے، اور ڈاکٹر سر محمد اقبال سے ملے، اس وقت مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی کی عمر ۱۵ رسال کی تھی، مولانا سید محمد طلحہ حسنی نے ہر طبقہ اور ہر خیال کے لوگوں سے ملایا، اور تعارف کرایا، جن میں حضرت مولانا احمد علی لاہوری صاحب، جن کے آپ بعد میں شاگرد بھی ہوئے، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

۱۹۳۱ء میں مستقلاً حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری کی خدمت میں گئے، اور قرآن کی تفسیر اور ''حجۃ اللہ البالغہ'' پڑھی، اسی سال مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ سے بیعت ہونے کی خواہش کی، مولانا نے ان کو اپنے شیخ حضرت خلیفہ غلام محمد صاحب دین پوریؒ کی خدمت میں سندھ بھیجا جن کی عمر تقریباً ۹۰ رسال تھی، انھوں نے اپنے سلسلہ میں داخل کیا، پھر ۱۹۳۲ء میں لاہور جا کر باقاعدہ درس قرآن کی تکمیل کی، اور سند لی، سند حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی نے تقسیم کی، مولانا احمد علی صاحب لاہوری کی خدمت میں رہ کر بڑے مجاہدے کیے، اور ان کی خصوصی تربیت و توجہ اور تعلق و محبت کی دولت سے سرفراز ہو کر اجازت وخلافت حاصل کی۔

۱۹۳۲ء میں دیو بند گئے، اور حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی کے درس حدیث میں شریک ہوئے، اور کئی ماہ قیام کیا۔

یکم اگست ۱۹۳۴ء کو دار العلوم ندوۃ العلماء میں بحیثیت مدرس کے ان کا تقرر رہوا، اور اسی سال نومبر میں شادی کی۔(۱)

نومبر ۱۹۳۷ء کو لاہور گئے اور علامہ اقبال علیہ الرحمہ سے تفصیلی ملاقات کی،

---

(۱) حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا نکاح ان کے بڑے ماموں جناب سید احمد سعید حسنی (متوفی ۱۹۵۴ء) کی چھوٹی صاحب زادی سیدہ طیب النساء (۱۹۱۵ء۔۱۹۸۹ء) سے ہوا اولاد کوئی نہیں ہوئی، مولانا سید محمد الحسنی ان کا بڑا خیال کرتے تھے، اہلیہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے ایک ہی بھائی سید سراج النبی حسنی (م ۱۹۷۰ء) تھے ان کے صرف ایک صاحب زادے سید مصباح النبی حسنی صاحب مرحوم (۱۹۳۶ء۔۲۰۱۲) اور چار صاحب زادیاں ہوئیں۔ سید مصباح النبی حسنی مرحوم (۱۹۳۶-۲۰۱۲ء) مولانا سید محمد الحسنی کے تقریباً ہم عمر تھے اور قریبی رشتہ کی وجہ سے باہم موانست اور محبت وتعلق قائم تھا، اور ایک دوسرے کا بڑا خیال رکھتے تھے چنانچہ اس تعلق کا اثر تھا کہ سید مصباح النبی حسنی مرحوم نے ان کی کتاب ''قرآن آپ سے مخاطب ہے'' کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور اس کو اپنے لیے سعادت کی بات سمجھی، ان کے تین بیٹے سید ضیاء النبی، سید محمد مکی، اور سید احمد مدنی اور ایک بیٹی ہیں۔(م)

۱۹۳۶ء سے ''سیرت سید احمد شہیدؒ'' لکھنا شروع کی اور ۱۹۳۹ء میں تکمیل کی، دسمبر ۱۹۳۹ء کو دینی مراکز کا سفر کیا (حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ سے ملاقات کی، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلویؒ سے بھی نیاز حاصل کیا، اور رائے پور حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ کی خدمت میں بھی تشریف لے گئے، اس سفر میں مولانا محمد منظور صاحب نعمانی ساتھ تھے)۔

۱۹۴۰ء میں ''الندوہ'' کا اجراء ہوا، اور آپ ایڈیٹر مقرر ہوئے، ۱۹۴۳ء اور ۱۹۴۴ء میں پشاور اور بالاکوٹ، پنجتار، لاہور کا دورہ کیا۔

۱۹۴۷ء میں حجاز مقدس کا پہلا سفر اور حج و زیارت کی سعادت حاصل کی، اس سفر میں مولانا کی والدہ ماجدہ، ہمشیرہ اور اہلیہ محترمہ اور ان کے ساتھ راقم سطور بھی تھا۔

۱۹۴۸ء میں ندوۃ العلماء کے رکن انتظامی مقرر ہوئے، ۱۹۵۰ء میں حجاز مقدس کا دوبارہ اور ۱۹۵۱ء میں مصر و سوڈان اور شام کا سفر کیا، ۱۹۵۶ء میں دمشق محاضرات کے لیے گئے، اور ترکی کا بھی سفر کیا۔

۱۹۵۸ء میں لاہور کے اسلامک کلوکیم میں شرکت کی۔

۱۹۵۹ء میں دینی تعلیمی کونسل کا قیام عمل میں آیا، اور آپ اس کے صدر منتخب ہوئے۔ اسی سال مغربی فکر و فلسفہ کے لیے مجلس تحقیقات و نشریات اسلام (ندوۃ العلماء) قائم کی جس کے آپ تاحیات صدر رہے، اور اسی ادارہ سے آپ کی اکثر تصانیف و رسائل شائع ہوئے۔

۱۹۶۰ء میں برما کا دورہ کیا، دسمبر ۱۹۶۱ء میں ندوۃ العلماء کے ناظم مقرر ہوئے، اکتوبر ۱۹۶۳ء میں لندن کا سفر اور اسپین کا دورہ کیا، اور اکتوبر ۱۹۶۴ء میں مغربی جرمنی کا سفر کیا۔

اگست ۱۹۶۴ء میں مسلم مجلس مشاورت کا قیام عمل میں آیا (جس کے آپ بانیوں میں تھے)۔

رابطہ عالم اسلامی اور جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے قیام کے بعد سے حجاز مقدس

کے آپ کے برابر سفر ہوتے رہے، ان کے جلسوں میں بحیثیت ممبر کے آپ شرکت فرماتے تھے، ۱۹۷۳ء میں رابطہ عالم اسلامی کے وفد کی قیادت کرتے ہوئے ایران، افغانستان، لبنان اور عراق کا دورہ کیا۔

۱۹۷۴ء میں "پیام انسانیت" کے کام کو تحریک کی شکل دے کر مختلف مقامات کے دورے کیے اور تقریریں کیں۔

مراکش کا بھی سفر کیا، ۱۹۷۷ء میں امریکہ وکناڈا کا دورہ کیا(۱)، ۱۹۷۸ء میں پاکستان میں ایشیائی کانفرنس میں شرکت کی، ۱۹۷۹ء میں اپنے قابل فخر بھتیجے مولانا محمد الحسنی کی وفات کا صدمہ اٹھانا پڑا، ۱۹۸۰ء میں سعودی حکومت نے آپ کو اسلامی خدمات پر بین الاقوامی فیصل ایوارڈ دیا۔

مولانا کا تعلق سارے مشائخ سے رہا، حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ، حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ، حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ، حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب فتح پوریؒ، حضرت مولانا شاہ محمد یعقوب صاحب مجددیؒ، حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلویؒ، حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ، حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقیؒ اور دوسرے مشائخ سے بھی تعلق رہا، اور سارے مشائخ محبت والفت کا معاملہ کرتے رہے، خصوصی طور پر حضرت رائے پوریؒ سے تعلق رہا، اور ان کی نگاہ میں محبوب رہے، اور اجازت وخلافت سے سرفراز ہوئے، اور اس حلقہ میں مرجع خاص وعام بنے، اسی طرح مشاہیر ہندوستان اور عرب ملکوں کے علماء اور سربراہوں سے سلسلۂ مکاتبت قائم رہا۔

مولانا کثیر التصانیف ہیں، ان کی تصانیف کے اکثر زبانوں میں ترجمے ہوئے اور ہو رہے ہیں، بہت سی کتابیں اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں داخل نصاب ہیں، عربی مقالات اور مضامین بکثرت رسالوں میں چھپتے اور نقل ہوتے ہیں، ان کی اہم

---

(۱) ان کے لیے ملاحظہ ہوں دریائے کابل سے دریائے یرموک تک، دو ہفتے مغرب اقصیٰ مراکش میں اور نئی دنیا امریکہ میں صاف صاف باتیں۔(م)

تصانیف میں سیرت سید احمد شہید، تاریخ دعوت وعزیمت، ارکان اربعہ، المرتضیٰ، انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر، نقوش اقبال، کاروانِ مدینہ ہیں۔

مولانا کو خدا نے علم وفضل، زہد وتقویٰ اور محبوبیت ومقبولیت کی ایسی نعمت عطا کی تھی کہ جدید وقدیم حلقوں کو یکساں طور پر ان کی طلب رہتی، جب حلقہ پیام انسانیت کی تشکیل ہوئی تو اس سلسلہ میں مخلوط اجتماعات میں جس میں بکثرت اہل علم ہندو مسلمان شرکت کرتے تھے، ان کو خطاب کرنا ہوتا اور وہ خطاب بہت مؤثر ہوتا تھا، مشائخ کے حلقوں، علماء کی درس گاہوں، عوام کے جلسوں، خواص کی مجلسوں، اہل دانش کے دانش کدوں اور سلاطین کے درباروں میں ان کو خاص مقام حاصل تھا، اور وہ ان تمام موقعوں پر صرف دعوت اسلامی اور تبلیغ واصلاح کا فریضہ انجام دیتے رہے، اور حق بات کہنے میں کبھی نہیں جھجکے، اس سلسلہ میں مولانا کی تصنیفات جس میں سلاطین اور حکمرانوں کے نام خطوط ہیں، پڑھنے کے قابل ہیں، اسی طرح اس مضمون پر مغرب سے صاف صاف باتیں، حدیث پاکستان، امریکہ کی تقریریں لائق ملاحظہ ہیں۔

مولانا کے مشرق ومغرب کے متواتر سفروں اور ندوۃ العلماء کے ناظم ہونے اور عرب وعجم کے اہل علم طبقوں سے تعارف وتعلق کی بنا پر مصر وشام، حجاز ویمن اور دوسرے مغربی ملکوں کے علماء اور فضلاء کی آمد ورفت بہت رہی ہے، ۱۹۷۵ء کے ''جشن ندوہ'' نے جو مولانا ہی کے دور نظامت میں منعقد ہوا، اس تعارف وتعلق کو اور بڑھایا۔

یہ حسن اتفاق ہے کہ مولانا سید عبدالحی صاحب حسنی کی تربیت وتعلیم ان کے والد ماجد مولانا فخر الدین صاحب خیالی کے زیر سایہ ہوئی، اور ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب حسنی کی تربیت وتعلیم ان کے والد مولانا عبدالحی صاحب حسنی کے زیر دامن ہوئی، اور مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کی تعلیم وتربیت ان کے برادر مکرم ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کے زیر سایہ ہوئی، اور محمد میاں (محمد الحسنی) کی تعلیم وتربیت ان کے والد ماجد سید ڈاکٹر عبدالعلی صاحب اور ان کے چچا مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کی

شفقتوں اور توجہات کے زیر سایہ ہوئی، اس طور پر خانوادۂ شاہ علم اللہی کی یہ شاخ طوبیٰ سرسبز وشاداب رہی، اوراس نے پورے خانوادہ میں امتیازی شان پیدا کی، اور کہنے والا اگر یہ کہے تو بے جا نہ ہوگا۔

ایں سلسلہ طلائے ناب است
ایں خانہ تمام آفتاب است

نانیہال

سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی اولاد میں ایک شاخ ایسی تھی جو مدینہ منورہ سے واسط ہوتی ہوئی ہندوستان آئی، اور حضرت مولانا سید قطب الدین محمد المدنی (م-۶۷۷ھ) کے ہمراہیوں کے ساتھ کڑا مانک پور ضلع الہ آباد میں سکونت پذیر ہوئی، اور پھر قصبہ ہنسوہ ضلع فتح پور میں محلہ درگاہ کو آباد کیا، جہاں سید علاء الدین شہید کا مزار اور ان کی بنوائی ہوئی مسجد ہے، اس شاخ نے علم دین کی خدمت کو اپنا شعار بنایا، اور حضرت شاہ علم اللہ رائے بریلی کے خاندان حسنی سے ازدواجی رشتے قائم کیے جو مسلسل اس وقت تک جاری ہیں، سادات حسینی واسطی کی اس شاخ طوبیٰ کے ایک فرد فرید مولانا سید محمد امجد واسطی تھے، جن کا سلسلۃ الذہب وہ سلسلہ تھا جس میں کبار اولیاء اللہ گزرے ہیں، اس میں حضرت مولانا خواجگی کڑوی (م-۸۹۸ھ) اور سید العارفین سید جیو احمد محی الدین خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مولانا سید محمد امجد گیارہویں صدی ہجری کے ایک بزرگ تھے، جن کو شاہجہاں بادشاہ نے قصبہ ہنسوہ ضلع فتح پور (یوپی) میں جاگیر بھی عطا کی تھی، ان کی اولاد میں بکثرت علماء ومشائخ گزرے ہیں، جن میں مولانا سید محمد مہدی واسطی بھی تھے، جو سلسلۂ چشتیہ کے شیخ تھے، درسیات کی تکمیل لکھنؤ میں ملا حسنؒ سے کی، اور منازل سلوک شیخ علی اکبر چشتی مودودی سے طے کیے، شیخ علی اکبر اپنے ان مجاز وخلیفہ کو "قرۃ عینی وراحۃ قلبی سید السادات" کے الفاظ سے یاد کیا کرتے تھے، رمضان المبارک ۱۲۲۱ھ میں انتقال کیا۔

مولانا سید ابوالقاسم

مولانا سید محمد مہدی کے دو بلند پایہ صاحبزادے ہوئے، بڑے مولانا سید ابوالقاسم اور چھوٹے مولانا سید سراج الدین تھے، مولانا سید ابوالقاسم ۱۲۰٦ھ میں پیدا ہوئے، علم ظاہر حاصل کرنے کے بعد دہلی گئے، اور مولانا شاہ غلام علی سے تکمیل سلوک کر کے اجازت وخلافت سے سرفراز ہوئے، اور پوری زندگی خانہ نشیں ہوکر تربیت و سلوک اور درس وتدریس میں گزاردی، بڑے بلند پایہ بزرگ تھے، ان کی صحبت میں بڑی تاثیر پائی جاتی تھی، کشف اکثر ہوتا تھا، حضوریِ قلب اور انابت الی اللہ ان کا خاص امتیاز تھا، ۱۲٦٦ھ میں انتقال ہوا، ان کے صاحبزادہ مولانا سید عبدالسلام فرماتے ہیں کہ والد ماجد کے انتقال کے بعد گھر کے ہر کونے سے ''خس'' کی خوشبو آرہی تھی، اور غسل کے پانی سے بھی یہی خوشبو آرہی تھی، اور یہ خوشبو مدتوں آتی رہی۔

مولانا شاہ عبدالسلام ہنسویؒ

مولانا سید ابوالقاسم کے صرف ایک فرزند تھے جن کا نام نامی مولانا شاہ سید عبدالسلام تھا، وہ یگانۂ روزگار شخصیت کے مالک تھے، ۱۲۳۴ھ میں ولادت ہوئی، علوم ظاہری کی تکمیل کے بعد والد ماجد سے سلوک حاصل کیا، ان کے انتقال کے بعد دہلی تشریف لے گئے، اور شاہ احمد سعید دہلوی نقشبندی سے تکمیل سلوک کر کے اجازت وخلافت حاصل کی، حجاز کا سفر کیا، اور مشہور علماء ومشائخ سے سند حدیث حاصل کی، مولانا سید عبدالسلام بڑے عابد وزاہد بزرگ تھے، احتیاط وحفظ لسان، کم سخنی اور قناعت وعفاف جیسے محاسن کا مجموعہ تھے، شب وروز ذاکر وشاغل رہتے، کشف اکثر ہوتا، ان سے خلق خدا نے بہت فائدہ اٹھایا، اور بے شمار انسانوں کی اصلاح ہوئی اور خشیت الٰہی اور تقویٰ وطہارت کی نعمت پائی، مولانا سید عبدالحی حسنی کے حقیقی خالو اور رشتہ میں ماموں ہوتے تھے، اور استاد بھی، بڑے کثیر التصانیف تھے، ۱۲۹۹ھ میں انتقال کیا، اپنی یادگار میں ایک فرزند حافظ سید عبدالمغنی چھوڑا، جو علم ظاہر و

باطن سے آراستہ اورفنون سپہ گری سے بخوبی واقف تھے،آواز میں بلا کا سوز تھا،اور نعتیہ کلام اکثر ترنم سے پڑھتے تھے۔(۱)

مولانا سید سراج الدین

مولانا سید محمد مہدی کے دوسرے صاحبزادے مولانا سید سراج الدین تھے، جو ۱۲۱۶ھ کو ہنسوہ میں پیدا ہوئے، پانچ سال کے تھے کہ والد ماجد کا انتقال ہوگیا، بڑے بھائی مولانا سید ابوالقاسم سے تعلیم حاصل کی، اور تکمیل علوم لکھنؤ کے مشہور اساتذۂ وقت سے کی،علوم کی تکمیل کے بعد خاندان حسنی کے مشہور بزرگ امیر المومنین حضرت سید احمد شہیدؒ کی رکاب تھامی، اور منازل سلوک طے کر کے ان سے اجازت وخلافت حاصل کی، شادی سادات حسنی کے ایک بزرگ سید علم الہدیٰ رائے بریلوی کی صاحبزادی سیدہ حمیراء بی سے ہوئی، جو مولانا سید محمد واضح حسنی کی نواسی تھیں،اور بڑی صاحب تقویٰ اور صاحب علم تھیں، حج کا سفر کیا، اور حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ کی صاحبزادی سے موضح قرآن کی روایت کی اجازت حاصل کی، وہ مولانا سید عبدالحی حسنی سابق ناظم ندوۃ العلماء کی نانی تھیں،مولانا فرماتے ہیں کہ ''مجھ کو جب میری نانی سلاتی تھیں تو یہ شعر پڑھتی تھیں ؎

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب　　　　یہ افضل سے افضل عبادت نصیب

مولانا سید سراج الدین بڑے عابد وزاہد، متبع سنت اور صاحب علم وفراست تھے،قرب وجوار میں ان کا بڑا اعزاز واقتدار تھا، ۲۷؍ربیع الآخر ۱۲۷۷ھ میں انتقال کیا،ان کے نواسہ مولانا سید عبدالحی حسنی نے ان کی تاریخ وفات ''رضي اللـه عن عبده'' سے نکالی ہے۔

---

(۱) حافظ سید عبدالمغنی صاحب کے ایک بیٹے اور کئی بیٹیاں تھیں، بیٹے سید محمد یوسف صاحب کا جوانی میں ۱۹۶۰ء میں انتقال ہوا، الحمدللہ ان کی کئی اولادیں ہیں، سید محمد اسامہ، سید محمد یونس، سید نورالاسلام نورمیاں، محمد ادریس، مولوی سید محمد عزیر، اور حافظ سید محمد عبید، مؤخرالذکر دونوں عربی اور دینی علوم سے آراستہ ہیں۔(حافظ مولوی سید عبیداللہ ندوی مولانا سید ارشد مدنی پسر حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے داماد ہیں اور مکہ مکرمہ میں مقیم ہیں۔(م)

اپنے پیچھے ایک فرزند یادگار چھوڑا، جن کا نام سید عبدالعزیز تھا، اور ایک صاحبزادی چھوڑی، جو مولانا حکیم سید فخر الدین حسنی رائے بریلوی کی اہلیہ محترمہ اور مولانا سید عبدالحی حسنی رائے بریلوی کی والدہ ماجدہ تھیں، ایک صاحبزادی نے ان کی زندگی میں ہی وفات پائی، وہ ان کے بھتیجے حضرت مولانا شاہ سید عبدالسلام ہنسوی کو منسوب تھیں۔

مولانا سید عبدالعزیز

۱۲۴۴ھ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد اور چچازاد بھائی مولانا سید عبدالسلام سے حاصل کی، اور دہلی جا کر شاہ عبدالغنی اور مولانا محمد مظہر نقشبندی سے علم حاصل کیا، خدا نے مولانا کو علم ظاہر کے ساتھ ہوش مندی، حسن انتظام، لیاقت و وجاہت، عزت و وقار بھی عطا فرمایا تھا، ۱۳۰۵ھ میں حج کو گئے، حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے بیعت ہوئے، اور ۱۳۰۷ھ میں اپنے وطن ہنسوہ ضلع فتح پور میں انتقال کیا، اپنی یادگار میں اہلیہ محترمہ جو مولانا حکیم سید فخر الدین خیالؔی رائے بریلوی کی ہمشیرہ تھیں اور ایک صاحب علم و فضل صاحبزادہ مولانا سید ابوالقاسم کو چھوڑا، ایک صاحبزادی تھیں جو مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی رحمۃ اللہ علیہ کی والدہ ماجدہ تھیں۔(۱)

مولانا سید ابوالقاسم حسینی واسطی

مولانا سید ابوالقاسم، مولانا سید سراج الدین ہنسوی کے پوتے اور مولانا سید عبدالعلی حسنی نصیر آبادی کے نواسے تھے، ۵ ربیع الاول ۱۲۷۵ھ کو نصیر آباد ضلع رائے بریلی میں پیدا ہوئے، اپنے چچا حضرت مولانا شاہ سید عبدالسلام ہنسوی سے علم حاصل کیا، اور

(۱) سیدہ زینب بی بی نام تھا، مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی سے شادی ہوئی، اور ایک صاحبزادے مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب تولد ہوئے، وہ آٹھ سال کے تھے کہ والدہ ماجدہ نے رحلت فرمائی، اپنے اخلاق وصفات میں وہ ایک ممتاز خاتون تھیں، مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب کو ان کی وفات کا بڑا صدمہ تھا، اور دوسرے نکاح کا ارادہ نہیں رکھتے تھے مگر والد ماجد مولانا فخر الدین صاحبؒ کی خواہش پر دوسرا نکاح کیا۔(م)

انھیں سے بیعت ہوئے، مولانا عبدالرحمٰن پانی پتی سے علم حدیث حاصل کیا، سلوک میں مولانا امین الدین لکھنوی اور حضرت مولانا شاہ سید ضیاء النبی حسنی رائے بریلوی سے اجازت حاصل کی، ان کے علاوہ اس زمانہ کے مشہور علماء ومشائخ سے تعلق قائم کیا، اور مراسلت کا سلسلہ جاری رکھا، ان میں حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی خاص طور پر قابل ذکر ہیں، حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت عثمانی کی اور اجازت وخلافت سے سرفراز ہوئے، ان کے علاوہ اپنے خال مکرم مولانا سید فخر الدین خیالیؔ سے بھی اجازت حاصل کی، مولانا سید ابوالقاسم بڑے ذی علم، علمی اور تاریخی ذوق رکھنے والے بزرگ تھے، ان کا علمی مذاق ان کی یادگار علمی اور تاریخی قلمی کتابوں سے ظاہر ہوتا ہے، اور اس مجموعۂ خطوط سے جھلکتا ہے جس میں انھوں نے مختلف مشائخ، علماء اور اصحاب فضل وکمال کے خطوط اور تحریرات جمع کی ہیں، جس کا نام ''مکتوب المعارف'' ہے، اس کے علاوہ دوسرا مجموعہ ہے جس میں حضرت شاہ عبدالسلام ہنسوی کے فتاویٰ جمع کیے ہیں، نیز کئی کتابیں لکھی ہیں، آپ کی تصنیفات میں "نور علی نور" ترجمہ "سرور المحزون" مصنفہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ، مجموعہ فتاویٰ، برکات احمدیہ، نور العیون، عرض مخلصاں، شعلہ جاں سوز، مآثر السلام بھی ہیں۔

مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی کے حقیقی ماموں زاد بھائی تھے، اور دونوں میں بڑا تعلق اور محبت تھی، حقیقی بھائیوں کی طرح معاملہ رکھتے تھے، وہ جب حکیم صاحب کو خط لکھتے تو ''روح روانم وقوت بازوئے ناتوانم'' کے القاب سے یاد کرتے، اخلاق و حسن معاملہ، خوف وخشیت، تورع واحتیاط، ذکر وشغل، رحم دلی، اور غربا نوازی اور فیاضی وسخاوت کے پیکر تھے، مولانا سید عبدالحی حسنیؒ ان کو حسب ذیل الفاظ سے یاد کرتے ہیں:

"وكان صالحا تقيّا، حليما، متواضعا، بشوشا، نجيب النفس، كريم الأخلاق." (۱)

---

(۱) نزہۃ الخواطر جلد ہشتم۔

(وہ نیک و پاک باز تھے، بردبار، متواضع، خندہ رو، پاکیزہ نفس اور بہترین اخلاق کے مالک تھے)۔

مولانا سید ابوالقاسم کی پہلی شادی مولانا سید رشید الدین حسنی رائے بریلوی کی صاحبزادی سے ہوئی جن سے دو فرزند مولوی سید سراج الدین ندوی (۱) اور حافظ سید محمد زبیر (۲) ہوئے، اور دو صاحبزادیاں: سیدہ خاتون بی (۳) اہلیہ مولانا سید عزیز الرحمٰن حسنی رائے بریلوی (والدہ مولانا سید ابوبکر حسنی ایم.اے.) اور سیدہ زہرہ بی اہلیہ ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی رائے بریلوی (والدہ ماجدہ مولانا سید محمد الحسنی معروف بہ محمد میاں مرحوم)۔

مولانا سید ابوالقاسم ہنسوی کی دوسری اہلیہ مولانا شاہ عبدالسلام ہنسوی کی صاحبزادی تھیں، ان بی بی سے تین صاحبزادے ہوئے: ۱-ڈاکٹر سید محمد (۴) ۲-مولوی سید احمد ندوی (۵) ۳-مولوی سید ابومحمد (۶)، ان تینوں بھائیوں کو اپنی ہمشیرہ والدۂ محمد میاں (محمد الحسنی) اور والدہ مولانا سید ابوبکر حسنی سے بے انتہا تعلق اور انس تھا، اور ان کی وجہ سے لکھنؤ اور رائے بریلی ان کی آمد و رفت رہی (ایک بہن کا قیام لکھنؤ میں

---

(۱) سید سراج الدین صاحب نے دارالعلوم ندوۃ العلماء سے فراغت کی اور بالکل نوجوانی میں انتقال کیا۔

(۲) حافظ سید محمد زبیر حافظ قرآن تھے، اور بڑے سادہ مزاج اور نیک سرشت، ان کے ایک صاحبزادہ سید محمد ابراہیم ہوئے جو دعوت و تبلیغ کے کام سے جڑے رہے اور ۴۰ سال کی عمر میں ۱۹۶۱ء کو کانپور میں انتقال کیا، اور دو صاحبزادیاں (اہلیہ شہاب الدین فریدی اور اہلیہ نجم الدین فریدی) دونوں صاحب اولاد ہیں۔

(۳) خاتون بی سے مولانا سید ابوبکر حسنی کے علاوہ تین صاحبزادیاں بھی ہوئیں، بڑی صاحبزادی لاولد فوت ہوئیں، منجھلی صاحبزادی ڈاکٹر سید حسن مثنی حسنی کی اہلیہ ہیں جن سے دو صاحبزادیاں ہوئیں، بڑی صاحبزادی مولانا سید محمد الحسنی بن ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی کے عقد میں آئیں، اور چھوٹی صاحبزادی سید محمد ابوطاہر بن سید ابومحمد ہنسوی کے نکاح میں ہیں، خاتون بی کی تیسری اور سب سے چھوٹی صاحبزادی سیدہ ولیہ سید محمد یامین بن سید محمد یوسف حسنی مرحوم کی اہلیہ ہیں جن کے ایک صاحبزادہ مولوی سید محمد خالد حسنی ندوی ہوئے۔ (مولانا سید ابوبکر حسنی کی صرف ایک صاحبزادی ہیں جو مولوی خالد صاحب کو منسوب ہیں، ان کی ایک بیٹی ہیں جو مولانا محمد الحسنی کے چھوٹے صاحبزادے مولانا بلال عبدالحی ندوی کو منسوب ہیں۔(م)

(۴) ڈاکٹر سید محمد کی صرف ایک صاحبزادی (اہلیہ سید محمد یوسف مرحوم بن سید عبدالمغنی بن حضرت شاہ عبدالسلام ہنسوی) ہیں جو بحمداللہ صاحب اولاد ہیں۔ (صاحبزادی صغریٰ بی اور ان کے بڑے بیٹے سید محمد یونس داماد مولانا عبدالمومن فاروقیؒ نے بھی دنیا سے رحلت کی، رحمہما اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ۔ باقی پانچ صاحبزادگان اور تین بیٹیاں ہیں بیٹوں میں سید محمد عزیر صاحب اور سید عبیداللہ حسینی نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کی۔ دوسرے بھائیوں میں سید محمد عمر صاحب کے دو بیٹے محمد آصف اور محمد سیف اور سید محمد صابر صاحب مقیم جدہ کے (باقی اگلے صفحہ پر)

تھا اور ایک بہن زیادہ تر رائے بریلی میں رہیں)، ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی کے یہ سب حقیقی ماموں زاد بھائی بھی تھے، اس لیے ڈاکٹر صاحب کو اپنے ان بھائیوں سے اور انھیں ڈاکٹر صاحب سے گہرا تعلق تھا، ان بھائیوں میں دو کا یعنی حافظ سید محمد زبیر کا ۱۹۴۷ء اور مولوی سید ابو محمد کا ۱۹۴۶ء میں لکھنؤ ہی میں انتقال ہوا، اور بقیہ دو بھائیوں مولوی سید احمد ندوی کا ۱۹۵۸ء میں بالکل اچانک اور ڈاکٹر سید محمد کا بعد میں (علیل رہ کر) ۱۹۵۹ء میں انتقال ہوا، اللہ تعالیٰ ان سب کی مغفرت فرمائے، اور ان کو اپنی خالص رحمت میں لے۔

یہ ہے محمد میاں (سید محمد الحسنی) کا نانیہال، جن سے ان کو اور ان کے والدین کو قلبی تعلق تھا، محمد میاں کے رشتے اپنے نانیہال سے صرف اپنی والدہ ماجدہ کی طرف سے ہی نہ تھے، بلکہ گوناگوں رشتے تھے، یعنی حقیقی نانا مولانا ابوالقاسم ہنسوی اسی شاخ کے چشم و چراغ تھے، دادی بھی اسی شاخ سے تعلق رکھتی تھیں، پردادی بھی اسی شاخ سے منسلک تھیں، اسی طرح والد ماجد اور جد امجد دونوں رائے بریلی کے حسنی سادات کے سلسلہ سے وابستہ تھے، نانی اور نانا کی والدہ دونوں اس حسنی سلسلہ سے نسبی تعلق رکھتی تھیں، اس طرح دونوں سلسلے یعنی دادھیال اور نانیہال ایک دوسرے سے اس طرح ازدواجی رشتے رکھتے تھے کہ کہکشاں کی صورت اختیار کر گئے تھے، اور دونوں خاندان "ہنسوہ کا زیدی واسطی اور رائے بریلی کا حسنی قطبی" ایک دوسرے میں پیوست ہو کر ایک خاندان کی شکل اختیار کر گئے، محمد میاں ان دونوں خاندانوں کے صفات و کمالات کے وارث و امین ہوئے۔

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ) تین بیٹے محمد رضوان، حسن، اور حسین اور ایک بیٹی ہیں حافظ سید محمد عارف صاحب کے ایک بیٹے محمود اور پانچ بیٹیاں ہیں۔ (م)

(۵) مولوی سید احمد ندوی کے کئی صاحبزادے ہوئے جو مختلف البطن ہیں، سب سے بڑے مولوی سید محمد عامر ندوی ہیں جن کے لڑکے حافظ سید محمد عرفان، سید محمد سہیل، سید محمد فضیل اور دو صاحبزادیاں ہیں، دوسرے صاحبزادہ سید محمد عمران کے نعمان، حسان اور دو صاحبزادیاں ہیں، دیگر صاحبزادگان سید ابوذر، سید محمد عمر، سید محمد صابر اور سید محمد عارف ہیں۔ (افسوس کہ مولانا سید محمد عامر ندوی بھی انتقال فرما گئے، رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ۔ (م)

(۶) مولوی سید ابو محمد کے تین صاحبزادے مولوی سید محمد سالم، ابوطاہر، محمد عاصم اور دو صاحبزادیاں ہیں، سید محمد سالم کے ابوالقاسم، عبدالسلام حارث، محمد یاسر، محمد ظاہر، بشریٰ (اور صبا) ہیں، سید ابوطاہر کے محمد عمیر، محمد زہیر، محمد زبیر اور ماریہ (اور ناجیہ) ہیں، سید محمد عاصم کا ایک لڑکا معاذ اور دو بیٹیاں شیماء اور سعدیہ ہیں۔ (افسوس کہ مولوی سید محمد سالم صاحب بھی وفات پاگئے، رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ) (م)

والدہ ماجدہ

محمد میاں (محمد الحسنی) کی والدہ ماجدہ ایک رابعہ سیرت بی بی تھیں، وہ اپنی ہمعصر خواتین میں بعض خصوصیات میں امتیازی شان رکھتی تھیں، ان کی شادی ۱۹۱۲ء میں ہوئی تھی، اس وقت سے لے کر وفات ۱۹۵۷ء تک ۴۵ رسال اپنے شوہر کے ساتھ اس طرح رہیں جس کی مثال کم ملتی ہے، بڑی عبادت گزار، بڑی اطاعت شعار، بڑی سادہ مزاج، نام ونمود سے دور اور بے عملی سے نفور تھیں، ان کو علم دین کا اتنا زیادہ شوق تھا کہ اکثر اوقات دینی کتابوں کا مطالعہ کرتی تھیں، خصوصاً ان کو مشکوٰۃ شریف کے ترجمہ ''طریق النجاۃ'' سے بہت تعلق تھا، وہ ہر وقت اپنے پاس رکھتیں اور برابر اس کا مطالعہ کرتیں، طریق النجاۃ مولانا محمد ابراہیم آرویؒ کی لکھی ہوئی ہے، جو ایک اہل حدیث عالم اور بڑے خوش اوقات بزرگ تھے، ان کا بیعت واجازت کا تعلق مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کے جد مادری حضرت مولانا شاہ سید ضیاء النبی رحمۃ اللہ علیہ سے تھا۔

زہرہ بی بی والدۂ محمد میاں کو اپنے بیٹے سے انتہائی تعلق اور بے پایاں محبت تھی، وہ ہر وقت ان کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتیں، اور ان کے لیے سراپا دعا بنی رہتیں، مگر یہ محبت تعلیم وتربیت کی راہ میں رکاوٹ نہ بنتی تھی، ان کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ ان کا بیٹا دین کا داعی اور مقرر وخطیب ہو، وہ اکثر کہا کرتیں کہ محمد! تم تقریر کیا کرو جیسے علی کرتے ہیں، وہ چاہتی تھیں کہ ان کا لخت جگر اپنے چچا مولانا ابوالحسن علی ندوی جیسا بنے، محمد میاں نے جب ''البعث الاسلامی'' کا اجراء کیا تو وہ بقید حیات تھیں، وہ اس کے اجراء سے بہت زیادہ خوش ہوئیں، اور اس مبارک موقع پر ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی، اسی طرح ۱۹۵۲ء میں محمد میاں نے علوم دینیہ سے تکمیل کی اور میدان صحافت میں اپنا نام پیدا کرنے لگے، کچھ کتابوں کے ترجمے کیے، اور عربی میں مقالات لکھنے لگے تو ان کی والدہ ماجدہ کی تمناؤں کے دن بر آئے، ۱۹۵۵ء میں اپنے لخت جگر کی شادی کی اور ایک سال بعد خدا نے ایک پوتا دیا، وہ سراپا شکر بن گئیں، اور زبان حال وقال سے شام وسحر اپنے مالک کا شکر ادا کرنے لگیں، بڑی پابند صوم وصلوٰۃ تھیں، غیبت، چغلی،

حسد اور سخت کلامی سے نفرت کرتی تھیں، صلہ رحمی اور غریب نوازی ان کا خاص شعار تھا، محلہ کی عورتیں اور خاندان کی بیبیاں ان سے اتنی مانوس تھیں کہ پاس بیٹھنے میں لطف آتا تھا، کسی عورت یا بچے، بڑے بوڑھے، اپنے یا غیر کو ان کی زبان اور ان کے طرز عمل سے کوئی تکلیف نہیں پہنچی، ان کا انتقال ستمبر ۱۹۵۷ء میں ہوا، اس وقت ان کے پوتے سید محمد عبداللہ سلمہ کی عمر سات ماہ تھی، وہ اکثر اس بچے کو گود میں لیتیں اور کمال محبت سے پیار کرتیں، اور صحت و عافیت اور ترقی وخوش حالی کی دعائیں دیتیں، اور بلائیں لیتیں، ان کے انتقال پر محمد میاں پر بڑا اثر پڑا، چونکہ والدہ کا انتقال بالکل اچانک ہوا تھا اور انتقال کے گھنٹوں بعد تک کسی کو یقین نہیں آتا تھا، اس لیے محمد میاں جن کی عمر اس وقت ۲۲ رسال کی تھی بے قابو سے ہو گئے تھے، اور جب والدہ ماجدہ کی تدفین کا مسئلہ آیا کہ لکھنؤ میں کی جائے یا وطن تکیہ کلاں رائے بریلی میں تو بہت زیادہ اشکبار ہو کر صرف ایک جملہ کہہ سکے کہ تکیہ پر، اور پھر وہ بہت دنوں تک ماں کی یاد میں بے چین سے رہے، کچھ دنوں کے بعد انھوں نے ایک خواب دیکھا، اس خواب کو دیکھ کر وہ بہت مسرور نظر آئے، راقم سطور سے کہنے لگے: ہم نے آج ایک خواب دیکھا ہے وہ یہ کہ:

''بوا (اپنی والدہ کو اسی نام سے پکارتے تھے) تشریف لائی ہیں، بہترین کپڑوں میں ملبوس، چہرہ کھلا ہوا، اور شاداب، ہم سے رہا نہ گیا، بڑھ کر پوچھ ہی بیٹھے، بوا! پہلے یہ بتایئے کہ آپ پر کیا گزری؟ وہ ہنس کر بولیں: بہت اچھی گزری، اللہ نے اپنی رحمت سے بہت اچھی جگہ عنایت فرمائی۔''

اس خواب کے بعد وہ بڑے خوش اور مطمئن سے رہنے لگے، اور ان کا رنج و غم کافور ہو گیا۔

محمد میاں کی والدہ ماجدہ کے انتقال پر خاندان کے ایک بزرگ مولانا سید محمد طلحہ حسنی نے جو تعزیتی خط محمد میاں کو لکھا وہ خود اس کا ثبوت ہے، وہ لکھتے ہیں:

''تمہاری والدہ کو میں مصداق ''المؤمنات الغافلات'' کا کہتا ہوں، وہ ان چند عورتوں میں تھیں جو غیبت نہیں کرتی تھیں، بڑی نصیب والی، بڑی خوبیوں والی خاتون تھیں۔''

باب دوم

ولادت سے علمی فضیلت تک

ولادت

انیسویں صدی عیسوی کی دوسری دہائی کی بات ہے کہ ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی کے گھر ایک بچہ کی ولادت ہوئی، اس وقت اس کے صاحب علم وفضیلت دادا مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی بقید حیات تھے، وہ اپنے پوتے کی ولادت سے بہت مسرور ہوئے، اور اس کا نام حسن رکھا، اپنی کسی قیمتی کتاب کے پہلے صفحہ پر اپنے ہاتھ سے اس کی تاریخ پیدائش، اس کا نام، اور اس کی زندگی اور صحت وعافیت کی دعا لکھی، لیکن کچھ ہی عرصہ بعد وہ داغ مفارقت دے گیا، جس کا سب کو صدمہ ہوا، لیکن خدا کے فیصلے پر راضی ہوتے ہوئے اس کے نعم البدل کے حق میں سراپا دعا بن گئے، اور ڈاکٹر صاحب کی زبان حال گویا ہوئی: "رَبِّ لَا تَذَرْنِي فَرْداً وَّأَنْتَ خَيْرُ الْوَارِثِيْنَ" خدا نے صدق واخلاق کی اس زبان کی دعا سنی اور بے چین دل کی خواہش وتمنا کو قبول کیا، مگر ایک لمبے عرصہ کے بعد حسن کی وفات کے بعد مسلسل لڑکیاں ہوئیں جو الحمد للہ سب کی سب بقید حیات ہیں، خدا ان کو زندہ رکھے اور مسرت وشادمانی سے ہمکنار کرتا رہے۔(۱)

۱۹۳۵ء مطابق ۱۳۵۴ھ کا مبارک سال آیا، ۱۷ر رجب المرجب مطابق ۱۵ر

---

(۱) حضرت مصنف علیہ الرحمہ کی حیات میں سبھی باحیات رہیں اور پھر ایک ایک کرکے ۱۹۹۴ء سے ۲۰۰۴ء تک یہ سب صاحبزادیاں اپنے مالک حقیقی سے جاملیں، رحمهنّ الله تعالىٰ رحمة واسعة.(م)

اکتوبر کی تاریخ نمودار ہوئی، دوشنبہ کا مبارک دن گزرا، اور سہ شنبہ کی شب کا آخر وقت ہوا کہ برسوں سے تمنا کرنے والے باپ کے گھر ایک فرزند پیدا ہوا، جس کی پیدائش پر سب نے خوشی سے زیادہ اس کی حیات، اس کی صحت و عافیت، اس کی علمی، دینی اور دنیاوی ترقی کی دعائیں مانگیں، اس فرزند کے نام محمد اور اس کے پردادا، صاحبِ ''مہر جہاں تاب'' مولانا فخر الدین خیالی کے نام پر فخر الدین رکھے گئے، ساتویں دن عقیقہ کی مسنون سنت کے ادا کرتے وقت بعض قریبی اعزہ کو اتنی زیادہ خوشی ہوئی کہ انھوں نے بندوق داغی اور اس سے اپنی خوشی کا مظاہرہ کیا، اس موقع پر اس نومولود کے دادا بقید حیات نہ تھے، بلکہ ان کو انتقال کیے ہوئے تیرہ سال گزر چکے تھے، اور اس کے چاہنے والے چچا مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی بمبئی میں تھے، جو تبلیغ اسلام کے ایک اہم کام کے لیے اپنے برادر مکرم ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کے فرستادہ بن کر گئے تھے، وہ ولادت کے تقریباً دس دن بعد لکھنؤ پہنچے، اور اپنے مبارک اور پیارے بھتیجے کو دیکھا اور اس کی درازیِ عمر اور خیر و برکت کی دعا کی، بچے کی دادی محترمہ خیر النساء صاحبہ بہتر جو بہتر مناجاتیں کہتی تھیں اپنے نومولود پوتے کے حق میں یوں گویا ہوئیں:

صدقہ احمد کا محمد ہو مرے گھر کا چراغ
دیکھ کر اس کو الٰہی سب کے دل ہوں باغ باغ
خوب پیدا کر الٰہی تو محمد میں کمال
ہو محمد یا الٰہی جد امجد کی مثال
خوش ہوں اس کو دیکھ کر اس کے عزیز و والدین
سب کی آنکھوں کی ہو ٹھنڈک اور دلوں کا ہو وہ چین
نظم ہو مقبول میری اور خوش انجام ہو
کام ہو میرا ترے فضل و کرم کا نام ہو

اس نظم کے کہنے کے ۳۵ رسال بعد جب اس نومولود بچے کو خدا نے علم وفضیلت کا آفتاب بنایا اور دادی کی دعا کو تمام وکمال قبولیت بخشی تو خود اس کے قلم فیض رقم نے

اپنے حق میں اس نظم پر اپنے تاثر کا اس طرح اظہار کیا:

> ''راقم سطور کی ولادت کے موقع پر اماں بی نے ایک دعائیہ نظم کہی تھی جس کا عنوان ہے ''کام ہو میرا ترے فضل و کرم کا نام ہو''، یہ نظم بڑی مختصر اور پر اثر ہے، اور میں اس کو اپنے لیے سرمایۂ سعادت اور وسیلۂ نجات سمجھتا ہوں۔'' (۱)

محمد جن کو بعض لوگ شروع ہی سے محمد میاں کہتے تھے، جب ایک سال کے ہوئے تو سب کے کھلونا بن گئے، وہ بولنے لگے اور صاف بولنے لگے، جب تک چل پھر نہ سکتے تھے تو ہر ایک اپنی گود میں لیتا اور ادھر ادھر گھمانا چاہتا تھا، چلنے پھرنے لگے تو ان کے لیے تین پہیوں والی سائیکل آگئی جس پر اکثر وہ اپنے مکان کے صحن میں بیٹھ کر پھرا کرتے تھے، ان کی بہنوں کو اپنے سب سے چھوٹے بھائی سے انتہائی محبت تھی، وہ اپنے والد ماجد سے اردو عربی پڑھتی تھیں اور ایک علمی گھرانہ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے اپنی دادی محترمہ خیر النساء صاحبہ اور پھوپھی امۃ اللہ تسنیم صاحبہ کے شعر و سخن میں ملکہ رکھنے کی وجہ سے باوجود اپنی کم عمری کے شعر و سخن کی بھی شد بد رکھتی تھیں، انھوں نے اپنے بھائی پر ایک مناجات کہی جو اب کسی کو پوری یاد نہیں ہے، مگر چند شعر جو محفوظ رہ گئے ہیں نقل کیے جا رہے ہیں۔

خدا سے ہے دعا سب کی کہ زندہ رکھ محمد کو
بڑھا کر زندگی اس کی بلند اقبال کر اس کو
الٰہی علم کی دولت عطا کر تو محمد کو
سخاوت دے محمد کو لیاقت دے محمد کو
ابوبکر و عمر عثماں علی میں جتنے جوہر تھے
وہی جوہر محمد میں تو پیدا اے خدا کر دے
رہے ماں باپ کا سایہ سدا قائم محمد پر

---

(۱) ذکرِ خیر/۹

رہے تیری نظر اس پر رہے تیرا کرم اس پر
بلا کوئی نہ آئے عمر بھر مالک محمد پر
نہ پہنچے کچھ الم اس کو پڑے کچھ بھی نہ غم اس پر

ماں باپ کی توجہ اور تربیت کا آغاز

ڈاکٹر صاحب کے یہاں تعلیم سے زیادہ اچھی تربیت کی اہمیت تھی، انھوں نے محمد میاں کی شیر خوارگی کے زمانہ سے ہی ان پر نظر رکھنی شروع کردی، وہ اس کو پسند نہیں کرتے تھے کہ کوئی بھی شیر خوار بچے کے سامنے کوئی بات یا عمل ایسا کرے جو غلط ہو، اور جس کا اثر بچے کے معصوم دل و دماغ پر پڑے، اور اس کی نگاہیں لاشعوری طور پر اس کو دیکھیں اور اس کی تصویر اس کی آنکھوں میں اتر جائے، جب محمد میاں چلنے پھرنے لگے اور اس منزل کو پہنچے کہ باہر جاسکیں تو ڈاکٹر صاحب نے تنہا جانے اور غلط قسم کے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ پھرنے سے منع کردیا، اکثر اپنی نظروں کے سامنے رکھتے، ان کو میٹھی زبان میں اچھی باتیں بتاتے اور گھر ہی پر رہنے پر بخوشی راضی رکھتے، نماز کو جاتے تو اپنے ساتھ لے جاتے، واپس ہوتے تو ساتھ واپس لاتے، ہر وقت کے ساتھ رکھنے کا یہ نتیجہ نکلا کہ محمد میاں اپنے والد ماجد کی ہر بات میں نقل کرنے لگے حتی کہ دیکھنے والوں نے یہ تک دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب نماز پڑھ کر مسجد سے نکل رہے ہیں اور ان کے دونوں ہاتھ پیچھے کمر پر رکھے ہیں تو ان کے پیچھے محمد میاں بھی اسی طرح اپنے دونوں ہاتھ اپنی پیٹھ کے پیچھے کمر پر رکھے معصومانہ انداز سے اپنے والد ماجد کی نقل کر رہے ہیں، ڈاکٹر صاحب جب مسکرا رہے ہیں تو محمد میاں کے معصوم لبوں پر بھی مسکراہٹ کھل رہی ہے، غرض یہ کہ نشست و برخاست، گفتگو، چال ڈھال میں اپنے والد کی مثال بنے پھر رہے ہیں، ڈاکٹر صاحب نے ان کی اس طرح تربیت کی کہ بڑی عمر تک وہ گھر کے باہر کی دنیا سے ناواقف، اور ہم عمروں اور ہم جولیوں کے ساتھ ٹہلنے پھرنے گھومنے سے ناآشنا رہے۔

بچپن کے تفریحی مشاغل

محمد میاں کو چونکہ باہر پھرنے، بازاروں اور پارکوں میں تن تنہا جانے یا کسی کے ساتھ بے کار جانے کی اجازت نہ تھی، اس لیے وہ گھر میں رہ کر وقت گزارتے تھے، بہت چھوٹے تھے تب ان کے لیے ایک طوطا خریدا گیا اور اس کو پنجرے میں رکھا گیا، وہ طوطا ان کی دلچسپی اور وقت گزاری کا ایک بڑا اچھا مشغلہ بن گیا، وہ ہر وقت اس پنجرے کو اٹھائے پھرتے، کبھی کمرہ میں رکھتے کبھی گھر کے آنگن میں، کبھی جب وہ طوطے کو اٹھاتے اٹھاتے پریشان کردیتے تو آنگن میں لگے تار پر اس کو لٹکا دیا جاتا، اور وہ اس کو پکارتے اور آواز دیتے، کبھی کسی کونے پر رکھا ہوتا تو دانہ اور پانی لے کر جاتے اور اس کو پنجڑے میں ڈال دیتے اور بڑے معصومانہ انداز میں بہت صاف الفاظ کے ساتھ کہتے: مٹھو میاں! بادشاہ سلامت کھانا لایا، مٹھو میاں! بادشاہ سلامت کھانا لایا، وہ جواب دیتا اور ان کو دیکھ کر وہ بولتا تو یہ بہت خوش ہوتے۔

اپنی بہنوں کو پڑھتا ہوا دیکھتے تو ان کے اندر بھی لکھنے پڑھنے کا شوق ہوتا، آتا جاتا کچھ نہیں تو کوئی کاغذ اٹھالیتے اور اس کو گودنا شروع کردیتے یا کوئی کتاب اٹھا لیتے اور جانے کیا کیا بولتے اور سر ہلا ہلا کر پڑھتے۔

کچھ اور بڑے ہوئے تو دیکھا کہ والد ماجد کے نام نہ صرف ہندوستان بلکہ دوسرے ممالک کے خطوط آرہے ہیں، اور ان کے بڑے چاہے وہ بہنیں ہوں یا پھوپھی زاد، ماموں زاد اور خالہ زاد بھائی جو اس وقت اسی گھر میں رہ کر تعلیم حاصل کررہے تھے، جن میں یہ راقم السطور بھی تھا جو ان کی ولادت سے دو سال قبل سے لے کر آج تک اپنے محسن ماموں ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کا نمک خوار اور ممنون احساں رہا، اور اس گھر کا ایک فرد بن کر اس نے ۴۸ رسال اسی گھر میں گزارے، ان سب کا معمول تھا کہ جہاں کوئی خط آیا اور عمدہ ٹکٹ دیکھا تو جس کا بس چلا اس نے ٹکٹ یا تو مانگ لیا یا نکال لیا، اور خود ڈاکٹر صاحب کو اپنی جوانی میں بہترین ٹکٹوں کے جمع کرنے

کا شوق تھا، اور انھوں نے ایک نفیس البم بنایا تھا، جس میں نادر و نایاب ٹکٹ چسپاں کیے تھے، اسی طرح نادر و نایاب سکے جمع کیے تھے، ان کا یہ شوق ان کے برادر خورد مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کی طرف منتقل ہوا، پھر ان کے خوردوں کی طرف اور پھر ان خوردوں سے ان کے خورد محمد میاں نے یہ شوق حاصل کیا اور ٹکٹ جمع کرنے لگے، ڈاکٹر صاحب ان کی دل بستگی اور دوسرے بڑے شوقوں سے بچانے کی خاطر اس شوق کی طرف سے ہمت شکنی نہیں کرتے تھے بلکہ ان ٹکٹوں کے ذریعہ مختلف ملکوں کے ناموں اور وہاں کے حالات سے باخبر کرتے، اس شوق نے محمد میاں کے مختصر اور معصوم دماغ میں عرب ممالک سے تعلق اور دوسرے ممالک سے علم کا نقش بٹھایا، اگر بھوپال کا ٹکٹ سامنے آیا تو اس کی اسلامی شان و شوکت اور اس کے سربراہ کے متعلق بتاتے، حیدرآباد کا ٹکٹ دیا تو حیدرآباد کے متعلق معلومات بتلائیں، سعودی عرب کا ٹکٹ عطا کیا تو مکہ مکرمہ و مدینہ منورہ کی عظمت اور دیار حرم کا شوق دلایا، ڈاکٹر صاحب اسی طرح ان کو تعلیم دیتے تھے۔

دوسری عادت ان کی یہ پڑگئی تھی کہ بیٹھے ہیں تو، اور کھڑے ہیں تو، اپنے دائیں ہاتھ کی شہادت والی انگلی ہوا اور فضا میں لہرا رہے ہیں جیسے کوئی نقشہ بنا رہے ہوں یا کچھ لکھ رہے ہوں، یہ عادت بہت زیادہ پڑگئی تھی، ان کو ٹوکا جاتا اور روکا جاتا مگر وہ پختہ عادت بڑی عمر تک باقی رہی، گویا ان کی انگلی کا اس طرح فضا میں گھمانا اور چکر لگانا اس بات کی علامت تھا کہ یہ بچہ بڑا ہو کر بڑا صاحب قلم ہوگا، اچھے نقشے بنائے گا، بہتر سے بہتر لکھے گا اور اس کا قلم ہمہ وقت رواں دواں رہے گا۔

علماء و مشائخ کی خدمت میں

محمد میاں جس دور میں پیدا ہوئے اور جس گھر میں ان کی ولادت ہوئی، وہ بڑا مردم خیز اور علمی، سیاسی اور دینی لحاظ سے بڑا اہتمام بالشان تھا، محلہ میں دادا مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی سابق ناظم ندوۃ العلماء کو آنکھوں دیکھے ہوئے بزرگ موجود تھے، شیخ

خلیل عرب جو علم وادب کی ایک کسوٹی کی حیثیت رکھتے تھے، اور جو مدتوں محلہ کی مسجد ''مسجد نوازی'' کے امام رہے تھے، اور عم مکرم مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی اور برادر مکرم مولانا سید ابوبکر حسنی کے استاد تھے، مولانا حیدر حسن خاں مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء اور ان جیسی کئی علمی شخصیتیں روزانہ نہ سہی تو جلد جلد ڈاکٹر صاحب سے ملنے آتی تھیں، علمی مجلسیں ہوتیں، دینی گفتگو ہوتی، ان کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کے مرشد وشیخ حضرت مولانا حسین احمد مدنی آتے جاتے اس گھر میں مقیم ہوتے، اور ان کی وجہ سے ہندوستان کے مشہور علماء کی آمد ورفت رہتی، اسی زمانے میں کانگریس کی حکومت بنی، جس کی وجہ سے سیاسی شخصیتوں کا آنا جانا رہتا تھا، جمعیۃ علماء کے اکثر کارکن، عمائد اور علماء حاضر ہوتے اور کئی کئی روز بڑا اجتماع ہوتا، مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب، مولانا ابوالمحاسن سجاد بہاری، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری جیسے مشہور علماء آتے اور باہمی مشورہ ہوتا، حضرت مدنی اور ان علماء کے علاوہ جو باہر سے آتے جاتے قیام کرتے مقامی علماء میں مولانا عبدالشکور فاروقی اور فرنگی محل کے علماء بھی آتے جاتے تھے، محمد میاں کی آنکھ کھلی تو اپنے گرد اہل علم واہل قلم کو پایا، اور یہ سلسلہ آخر تک چلتا رہا، ولادت سے لے کر وفات تک وہ اہل علم وقلم کے گہوارہ میں رہے، اہل درد وسوز اور اہل دل کی مجلسوں میں بیٹھے، آنکھ کھلی تو اس ماحول میں اور آنکھ بند ہوئی تو اسی ماحول میں، زندگی کے سفر کا آغاز یہیں سے ہوا، اور سفر کا انجام بھی یہیں ہوا، محمد میاں نے اپنی آنکھیں کھولتے ہی حضرت مدنی کو دیکھا، تین سال کے ہوئے تو حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی گود میں بیٹھ کر دعائیں لیں، سات آٹھ سال کے ہوئے تو حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی بانی تحریک تبلیغ اور حضرت مولانا محمد زکریا شیخ الحدیث کی زیارت کی اور دعائیں لیں، گیارہ سال کے ہوئے تو حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری کی توجہات حاصل کیں، پھر یہ سلسلہ جو شروع ہوا تو علماء ومشائخ کی آنکھوں کا تارا بن گئے اور آخر عمر تک بے شمار مشائخ کی خدمت میں گئے، اور اپنے گھر پر ان کی

زیارت سے مشرف ہوئے۔ اور بیعت واسترشاد کا تعلق حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری سے قائم کیا، اور ان کے منظور نظر بنے۔

نشو ونما

محمد میاں کے نشو ونما کا زمانہ بڑا بابرکت زمانہ تھا، ہر طرف علم کا چرچا تھا، گھر میں اپنے فاضل والد ماجد ڈاکٹر عبدالعلی ناظم ندوۃ العلماء، اپنے عم مکرم مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کو پایا، اور ان کی شفقتوں اور محبتوں کے نقوش اپنے دل ودماغ میں ثبت کیے، ایسی شفیق ماں پائی جس کی نیکی، متانت، سادگی اور اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کی شہادت ہر دیکھنے والی آنکھ دیتی ہے، محمد میاں کی والدہ ایک بڑے باپ مولانا شاہ ابوالقاسم واسطی ہنسوی کی صاحبزادی اور ایک بڑے سمجھ دار اور جہاں دیدہ شخصیت کے مالک ماموں مولوی سید خلیل الدین حسنی رائے بریلوی کی بھانجی تھیں، وہ اپنی ہم عصر اور ہم عمر بیبیوں میں بعض حیثیتوں سے ممتاز درجہ رکھتی تھیں، وہ علم کا بڑا شوق اور دین کا بہت ذوق رکھتی تھیں۔

محمد میاں کی والدہ مجموعی حیثیت سے ایک قابل رشک خاتون اور ایک مثالی ماں تھیں، ان سے زندگی بھر کسی کو بھی گزند نہ پہنچا، ان سے جو بی بی ملتیں خوش ہوتیں اور زندگی بھر ان کی رطب اللسان رہتیں، محمد میاں کی والدہ اپنے اکلوتے بیٹے کو بہت زیادہ چاہتی تھیں، اور ان کی علمی ترقی اور ان کا دینی ودنیاوی عروج دیکھنا چاہتی تھیں، وہ ان کے لیے دعائیں کرتیں اور بہتر سے بہتر طریقہ سے ان کی تربیت کرتیں۔

گھر میں باپ، چچا اور شفیق ماں کے علاوہ بعض اور خاندانی بزرگوں اور اہل علم کی شخصیتوں کی آمد ورفت اور قیام نے اور مسلسل علماء ومشائخ کی توجہات، دعاؤں اور زیارتوں نے محمد میاں کی شخصیت کو بڑے اچھے بلکہ اچھوتے سانچہ میں ڈھالا، ان کو جو علم ملا وہ کسبی کم وہبی زیادہ تھا، وہ گویا اہل زبان، اہل علم اور اہل دل حضرات کی گودوں میں پلے بڑھے اور پھلے پھولے، خدا نے ان کو علم وعمل، صلاح وتقویٰ، سادگی و

متانت، کم گوئی اور حیا و پاک دامنی کی دولتوں سے بے محنت نواز کر بے ہمہ اور باہمہ شخصیت کا مالک بنایا، ان کے نشو و نما، ماحول اور علم و عمل کی راہ پر گامزن ہونے کا نقشہ ان کے عم مکرم مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی نے ان الفاظ میں کھینچا ہے:

''ان کا نشو و نما دعوت اسلامی کے سایہ میں ہوا، اور ایک ایسے گھرانہ میں جہاں راہ خدا میں سرفروشی و جاں بازی کی داستانیں، سیرت نبویؐ اور اسلامی فتوحات کی منظوم تاریخ اور وہ شاہ نامے پڑھے جاتے جو اسی خاندان کے بعض بزرگوں نے نظم کیے تھے، جس کی بنا پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام اور عربوں کی محبت ان کی رگ و جاں میں رچ بس گئی تھی۔

ان کی پیدائش ایسے خانوادہ میں ہوئی جس کا مدتوں سے یہ شعار تھا کہ ٹھیٹھ اسلامی عقائد اور صحیح تزکیۂ نفس، روحانیت، پاکیزہ جذبات اور ادب و شعر کے صحیح ذوق اور مختلف النوع علوم کے سرچشمہ سے سیراب ہونے کے درمیان کوئی تضاد نہیں۔

انھوں نے شعور کی منزلیں اس وقت طے کیں جبکہ در و دیوار علامہ اقبال کے اشعار سے گونج رہے تھے، اور ہر جگہ ان کی فرماں روائی تھی، وہ اشعار جو محبت و الفت، ایمان و یقین، اسلام کی صلاحیت پر یقین کامل اور اس کی ابدیت پر ایمان سے بھرے ہوئے تھے۔

ان کا نشو و نما ایسے والد کی آغوش میں ہوا جو عقائد کی صحت و پختگی، قوت ایمانی، قلب و دماغ کی وسعت، جدید مطالعہ اور حقیقت پسندی میں ممتاز تھے، وہاں مذہب و سائنس اور قدیم و جدید میں کوئی تضاد نہ تھا، مشرقی و مغربی علوم کے سرچشموں سے یکساں طریقہ پر بہرہ ور ہوئے تھے، اور انھوں نے ان دونوں کے

بہترین اور حسین ترین اجزاء کو جذب کر کے ان کے درمیان
ایک حسین و دل آویز امتزاج پیدا کرلیا تھا، اور اس طرح
"مجمع البحرین" بن گئے تھے...... یہ میرے محترم بھائی،
میرے استاذ و مربی اور محمد میاں کے والد ماجد ڈاکٹر سید عبدالعلی
حسنی کی شخصیت تھی۔"

۱۹۳۶ء سے لے کر ۱۹۳۹ء تک وہ دور ہے جس میں محمد میاں ایک سال سے لے کر تین سال تک کے تھے، اسی پورے دور میں مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی نے سیرت سید احمد شہیدؒ کی ترتیب سے تکمیل و اشاعت کا کام کیا، گھر میں حضرت سید احمد شہیدؒ کے تبلیغ و جہاد، ان کی سیرت اور ان کی جماعت مجاہدین کے تذکرے ہوتے تھے، خود ڈاکٹر صاحب کو حضرت سید احمد شہیدؒ سے عشق و محبت کا تعلق تھا، اور وہ اکثر ان کا تذکرہ کرتے تھے۔

محمد میاں کی پانچوں بہنیں جن میں سب سے بڑی پندرہ سال اور پھر علی الترتیب آٹھ، چھ، چار اور پھر دو سال بڑی ہیں، اپنے والدین کی نورِ نظر اور ان کی تربیت یافتہ ہیں، ان کو اپنے بھائی سے بہت زیادہ محبت تھی، انھوں نے اپنے والدین کی طرح محمد میاں کی تعلیم و تربیت میں دلچسپی اور انہماک سے حصہ لیا، ان پر نظر رکھی، اور ان کی ہر طرح دیکھ بھال کی، اور آخر تک ان سب کا یہی شیوہ رہا، بہنوں کی ایسی محبت، شفقت اور ہمہ وقت خیال نے والدین کی جدائی کا احساس کم سے کم ہونے دیا۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی نظرِ شفقت و التفات

ستمبر ۱۹۳۸ء کو حضرت مولانا تھانوی لکھنؤ بغرض علاج تشریف لائے اور مولوی گنج میں مولانا محمد حسن کے مکان میں قیام کیا، مولانا کے قیام کی وجہ سے ہندوستان بھر کے علماء و مشائخ حاضر خدمت ہوتے، بعد ظہر مکان پر خواص کی مجلس ہوتی اور بعد عصر

مسجد خواص میں عام مجلس منعقد ہوتی، خواص کی مجلس میں ڈاکٹر سید عبدالعلی اور ان کے بھائی مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی شرکت کیا کرتے تھے، خدا کے فضل وکرم سے انھیں مجالس میں سے ایک مجلس میں ان ہر دو بزرگوں کے ساتھ راقم الحروف کو بھی شرکت کی سعادت ملی، راقم الحروف کی عمر اس وقت ۱۳؍سال کی تھی، اتنا یاد ہے کہ جب ہم لوگ بھیڑی منڈی مولوی گنج پہنچے تو زائرین کی بڑی تعداد سڑک پر اور سڑک کے کنارے کھڑی تھی، اور اندر جانے کی اجازت کی منتظر، ڈاکٹر صاحب نے اطلاع کرائی، دروازے پر مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی کھڑے تھے، انھوں نے حضرت تھانوی کے پوچھنے پر پوچھا: آپ کے ساتھ کون کون ہے؟ جواب دیا: میرے بھائی ابوالحسن علی اور میرے بھانجہ محمد ثانی، اندر سے اجازت ملی، ہم لوگ داخل ہوئے، اس وقت حضرت خطوط سن رہے تھے اور جوابات لکھوا رہے تھے۔

۱۵؍ستمبر ۱۹۳۸ء مطابق ۱۹؍رجب ۱۳۵۷ھ کو خواص کی مجلس میں حضرت مولانا تھانوی نے ڈاکٹر صاحب سے از خود فرمایا: ڈاکٹر صاحب! میرا جی چاہتا ہے کہ میں آپ کے گھر آؤں، ان شاء اللہ آج ہی بعد مغرب آؤں گا، پھر حسب ارشاد خواص کی مسجد میں بعد عصر مجلس کر کے اور نماز مغرب پڑھ کر پاپیادہ گوئن روڈ تشریف لے چلے، لوگ سن کر کچھ پیچھے پیچھے چلنے لگے، حضرت مولانا ڈاکٹر صاحب کے مطب میں کچھ دیر بیٹھے، مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی بصد شوق وذوق اپنے بھتیجے محمد میاں کو جن کی عمر تین سال کی تھی، گود میں لیے کوٹھے سے آئے، حضرت تھانوی نے محمد میاں کو اپنی آغوش میں لیا، سر پر ہاتھ پھیرا، دعائیں دیں۔ مطب اور مطب کے سامنے شائقین عوام وخواص کا اچھا خاصا اجتماع ہو گیا تھا، تھوڑی دیر بعد یہ نورانی مجلس ختم ہوئی اور حضرت اپنی قیام گاہ کو تشریف لے گئے، حضرت تھانوی کی تشریف آوری سے اس گھر کو جو شرف حاصل ہوا اور اس کی وجہ سے اہل خانہ کو جو کیف وسرور حاصل ہوا تھا وہ مدتوں باقی رہا، اور آج بھی اس کی لذت اور نورانیت محسوس ہوتی ہے۔

تسمیہ خوانی

۱۹۳۹ء میں جبکہ محمد میاں کی عمر چار سال کی تھی، گھر میں تعلیم کے لیے بٹھائے گئے، اور اپنی بہنوں کے ساتھ وہ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے لگے تھے، مگر قاعدہ سے ۱۹۴۱ء میں جبکہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی دوبارہ لکھنؤ تشریف لائے اور تقریباً ایک ماہ قیام فرمایا تو کسی تاریخ کو بعد ظہر خواص کی مجلس میں مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی محمد میاں کو لے گئے، حضرت نے پاس بلایا اور بسم اللہ کرائی، محمد میاں کے ساتھ حضرت تھانوی کے ایک مسترشد مولوی عبداللہ کشمیری کے لڑکے عبیدالرحمٰن بھی تھے، ان دونوں نے پڑھا، محمد میاں نے آہستہ آواز میں پڑھا اور عبیدالرحمٰن نے بلند آواز سے، حضرت تھانوی نے محمد میاں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: یہ بچہ نقشبندی ہوگا اور عبیدالرحمٰن کو فرمایا کہ یہ چشتی ہوگا، بسم اللہ کی مجلس بڑی بارونق اور نورانی تھی، ہر طرف علماء، فضلاء اور اہل اللہ موجود تھے، محمد میاں اپنی کم عمری کے دور کے ان دونوں واقعوں کو اپنی علمی اور دینی زندگی کی ترقیات کا منبع سمجھتے تھے، اور اس ابتدا پر بڑا کیف و سرور اور اپنی خوش بختی محسوس کرتے تھے، یہی وجہ تھی کہ ان کو حضرت تھانوی سے بہت زیادہ تعلق تھا، اور ان کے دل میں حضرت مولانا تھانوی کی عظمت اور محبت بلکہ کسی درجہ کا عشق کوٹ کوٹ کر بھرا تھا، اور اکثر ان کی تصانیف پڑھا کرتے تھے اور ان سے بڑا فائدہ اٹھاتے تھے۔

ایک بڑا حادثہ

راقم الحروف اور اس کے برادر مکرم سید محمود حسن، محمد میاں کی ولادت سے پہلے سے اپنے خال مکرم ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں رہ کر زیر تعلیم تھے، ہم دونوں بھائیوں کے سامنے محمد میاں پیدا ہوئے، ہماری گودوں میں کھیلے اور پلے بڑھے، جب انھوں نے ہوش سنبھالا اور شعور کی آنکھیں کھولیں تو اپنے پاس اپنے ان بھائیوں کو پایا، ہمہ وقت کا ساتھ، ہر دم کا ساتھ کھیلنا، کھانا پینا، ایک دوسرے کو یک جان دو قالب بنانے

کے لیے کافی تھا، سو یہی ہوا کہ سگے بھائیوں کی طرح رہ کر بچپن کے یہ دن گزرے، مرحوم برادر مکرم سید محمود حسن ہمیشہ کے بیمار تھے، ڈاکٹر صاحب کو ان سے بہت زیادہ محبت اور انس تھا، اور ان کا ان کی بیماری اور کمزوری کی وجہ سے بڑا خیال رکھتے تھے، ۱۹۴۲ء کا شروع سال تھا کہ وہ سخت بیمار اور صاحب فراش ہو گئے، ان کو محمد میاں سے بڑا لگاؤ اور حد سے زیادہ محبت تھی، محمد میاں کی عمر اس وقت سات سال کی تھی، ۵/اپریل ۱۹۴۲ء کو سید محمود حسن کا عین جوانی میں ۲۱/سال کی عمر میں انتقال ہو گیا (۱)، انھیں کے انتقال میں دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب ان کے پلنگ کے پاس دوسرے پلنگ پر اس طرح بیٹھے ہیں کہ ان کے دونوں پیر زمین پر بغیر جوتے کے رکھے ہیں اور آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہے، اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو پکڑے ہیں، دیکھنے والا یہ تأثر لیتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کے بھانجہ کا انتقال نہیں ہوا بلکہ ان کے حقیقی بیٹے کا انتقال ہوا ہے، محمد میاں اپنی کم عمری کے باوجود ہمہ وقت ساتھ رہنے والے پھوپھی زاد بھائی کو جن کو وہ حقیقی بھائی کی طرح سمجھتے تھے، کھو کر آزردہ تھے، یہ ان کی زندگی کے لاشعوری دور کا پہلا حادثہ تھا، جو ان کے گھر میں پیش آیا تھا، جس کی کسک وہ اپنی آخر عمر تک محسوس کرتے تھے، وہ ہمیشہ ان کو اچھے بھیّا کہتے تھے، اور جب بھی ان کا ذکر کرتے اور اپنے بچپن کی باتیں کرتے تو ''اچھے بھیا'' کہہ کر ان کا ذکر ضرور کرتے، کبھی کبھی ان کا ذکر کرتے ہوئے وہ یہ مصرعہ پڑھتے:

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

اور حقیقت یہ ہے کہ برادر مکرم سید محمود حسن کا انتقال ایسی عمر میں ہوا جو عین نوجوانی کی تھی، وہ بہت سادہ مزاج، دین دار، متواضع، خلیق اور بے ضرر انسان تھے، جن کے انتقال پر اپنوں اور غیروں نے آنسو بہائے تھے، اور رہا ڈاکٹر صاحب کا گھر تو وہ حسرت کدہ بلکہ ماتم کدہ بن گیا تھا، ہر ایک سراپا غم بنا اپنے ہوش و حواس گم کیے ہوئے تھا۔ (رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً وغفرلہ مغفرۃً تامۃً)

تعلیمی دور

حروف شناسی

محمد میاں کی تعلیم کو چار دوروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے؛ پہلا دوران کی عمر کے چوتھے سال سے ساتویں سال تک، یہ تین سالہ دور ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۲ء تک کا ہے، اس تین سالہ دور میں انھوں نے اپنے والد ماجد ڈاکٹر صاحب سے، محلّہ کی مسجد کے امام مولوی محمد سلیم کشنوی (سلطان پوری) اور کچھ کچھ اپنی بہنوں سے تعلیم حاصل کی، بالکل ابتدائی کتابیں، نماز کی تعلیم، قاعدہ بغدادی اور تھوڑی بہت اردو اور پھر قرآن مجید کی تعلیم حاصل کی، اور پھر ان کی بہنوں کو ایک مولوی صاحب پڑھانے آتے تھے جن کا نام مولوی عبداللہ کشمیری تھا جو ڈاکٹر صاحب کو نہ معلوم کیسے دستیاب ہو گئے تھے، ممکن ہے حضرت تھانوی کی مجلس میں شرکت کی وجہ سے، کیونکہ مولوی صاحب کا بیعت و ارادت کا تعلق حضرت تھانوی ہی سے تھا، وہ مولوی صاحب بڑے دیندار، ایماندار اور زاہد و عابد خوش اوقات تھے، محمد میاں اپنی ان بہنوں کے ساتھ جوان سے عمر میں قریب تھیں اور مولوی صاحب موصوف سے پڑھتی تھیں، بیٹھ جاتے تھے، اور ان سے مانوس ہو گئے تھے اور خود مولوی صاحب کو اس بچہ سے اس کی پیاری پیاری باتوں اور ذہانت و ذکاوت کی بنا پر بڑا اُنس ہو گیا تھا۔

ابتدائی تعلیم

محمد میاں کی تعلیم کا دوسرا دور ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۶ء تک ہے، یہ پورا دور مولوی عبداللہ کشمیری سے پڑھنے کا ہے، اس دور میں بالکلیہ مولوی صاحب محمد میاں کے استاد رہے،

مکان مسکونہ کے اس کمرے میں جو سڑک کی طرف اوپر ہے یعنی ڈاکٹر صاحب کے مطب کے اوپر والے کمرے میں اور اکثر اس کمرے کی طرف جانے والے زینہ کے اوپری حصہ پر بیٹھ کر اپنا چھوٹا سا بکس، تختی، رحل، کتابیں اور کاپیاں لیے ہوئے ایک سات سالہ بچہ ایک مولوی صاحب کے پاس بیٹھا ہوا ہے، بچہ کی آواز تو پڑھنے کی کم آتی ہے، مولوی صاحب موصوف مسلسل بولتے اور تقریر کرتے رہتے ہیں، بزرگوں کے قصے سنا رہے ہیں، صحابہ کرام کی سیرت سنا رہے ہیں، اور بڑی میٹھی زبان میں کبھی بیٹے اور نام لے کر محمد میاں کہتے ہیں، ان کی آواز کبھی کبھی اتنی بلند ہو جاتی ہے کہ دوسرے کمرے والے لوگ سنتے ہیں، آواز کی شیرینی اور حلاوت ایسی ہے کہ وہ بچہ بڑے شوق سے سنتا ہے، یہ تھے مولوی عبداللہ صاحب، محمد میاں کے استاد اول، اور وہ تھا وہ بچہ محمد میاں جس نے عمر بھر اپنے ان استاد کو یاد رکھا، ان کے ممنون رہے اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرتے رہے، ان کے ادب اور عظمت کو اپنے دل میں بٹھایا، مولوی عبداللہ صاحب نے محمد میاں کو خوشخطی سکھائی، قرآن شریف پڑھایا، حساب پڑھایا اور اس کی مشق کرائی، فارسی پڑھائی، فارسی میں گلستاں بوستاں اور بعض دوسری کتابیں پڑھائیں، پڑھانے سے زیادہ وہ تقریر کرتے اور اسباق کو ذہن نشین کراتے۔

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کی زیارت وخدمت اور عقیدت ومحبت

مولوی عبداللہ صاحب پر مسلم لیگ کے خیالات اور افکار کی پوری چھاپ تھی، اس لیے وہ کانگریس اور جمعیۃ علماء کے افکار وخیالات سے ہم آہنگ نہ تھے، بلکہ کھل کر مسلم لیگ کی حمایت اور علمائے جمعیۃ کے خیالات کی مخالفت کرتے، اگرچہ محمد میاں کو اپنے ان خیالات کی تعلیم نہیں دیتے تھے مگر ان کے سامنے دوسروں سے بحث کرنے لگتے تھے، یہ صورت حال ایسی صورت میں اور بدنما ہو جاتی تھی کہ یہ گھر جہاں وہ پڑھاتے تھے حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کی آنے جانے کی قیام گاہ تھی، اور اس گھر والے سب کے سب حضرت مدنی کے ہی عقیدت مند وارادت کیش تھے اور ان

پر اپنے دل و جان کو چھڑ کنے والے تھے۔

محمد میاں غور سے ان بحثوں کو سنتے، ایک طرف استاد کی عظمت دوسری طرف والد ماجد کا ادب ولحاظ، لیکن ابتدائے عمر سے وہ حضرت مدنی کو دیکھتے، ان کی خدمت میں بیٹھتے رہے اور اپنے والد ماجد کو ان کے سامنے زانوئے ادب تہ کرتے دیکھتے رہے تھے، اس لیے استاد کی تقریروں اور بحثوں کا اثر ان کے دل و دماغ پر بالکل نہیں پڑا، بلکہ دونوں بزرگوں حضرت تھانوی اور حضرت مدنی کا احترام دل میں بیٹھا، اور سیاسی افکار میں ان کے گھر کے بڑوں خصوصاً والد ماجد کے خیالات وافکار کے نقوش ان کے دل و دماغ کے پردہ پر لاشعوری طور پر ثبت ہوتے رہے۔

ان بحثوں کے باوجود مولوی عبداللہ مرحوم کا محمد میاں پر یہ احسان ہے کہ انھوں نے اپنے شاگرد کو اولاد کی طرح پڑھایا، اور محبت کی گراں مایہ متاع ان کو دی، بزرگوں کی عظمت کا سکہ بٹھایا، اور ابتدائی تعلیم بڑے اچھے طریقہ سے دی، ان کے ذہن کو جلا بخشی، ۱۹۴۷ء میں ہندوستان تقسیم ہوا، یہ دور بڑے ہنگامہ اور انتشار کا تھا، اور اسی زمانہ میں باہمی بحثوں کا چکر چلتا رہا۔

ترجمۂ قرآن مجید

محمد میاں کی تعلیم کا تیسرا دور ۱۹۴۴ء سے ۱۹۵۰ء تک ہے، یعنی اس دور کا ابتدائی حصہ مولوی عبداللہ صاحب کی تعلیم دینے کا آخری حصہ بھی ہے، یعنی ایک طرف مولوی عبداللہ صاحب محمد میاں کو فارسی اور اردو کی متوسط کتابیں پڑھاتے تھے تو دوسری طرف ڈاکٹر صاحب محمد میاں کو اپنے خاص انداز اور تجربات کی روشنی میں عربی پڑھاتے تھے، ڈاکٹر صاحب نے محمد میاں کی عربی تعلیم کو قرآن حکیم کی بعض ایسی سورتوں کے ترجمہ سے شروع کیا، جن میں عموماً قصے ہوتے تھے، جیسے سورۂ یوسف، سورۂ زمر، سورۂ قصص وغیرہ۔

قرآن مجید کے ترجمہ کو سورۂ فاتحہ سے شروع کیا، اس کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ

اسی زمانہ میں ان کے پھوپھی زاد بھائی عزیزی مولوی محمد واضح سلمہ (جو بعد میں ان کے بہنوئی بھی ہوئے) اور سب سے زیادہ بے تکلف دوست ایک ہی گھر میں رہ کر زیر تعلیم اور قریب السن تھے اور ہر وقت ساتھ کے اٹھنے بیٹھنے والے ساتھی بھی تھے، دونوں کو عربی پڑھنے کا بڑا شوق تھا اور ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کا شوق بھی رکھتے تھے، جس دن محمد میاں نے سورۂ فاتحہ کا ترجمہ پڑھا، پڑھ کر فوراً واضح کے پاس آئے، اپنے پڑھنے کی خوش خبری سنائی، اور واضح کو وہی ترجمہ پڑھایا، بعد میں مزاحاً کہتے تھے کہ لو ہم تمہارے استاد ہوگئے، انھیں دنوں واضح سلمہ دارالعلوم ندوۃ العلماء سے مولانا سید سلیمان ندوی کی مشہور کتاب "دروس الأدب" لائے جو محمد میاں کے ہاتھوں میں آئی، محمد میاں نے اس کو پڑھا اور اس کے الفاظ یاد کیے۔

عربی زبان کی تعلیم میں ڈاکٹر صاحب نحو وصرف کے قواعد سے صرف نظر کر کے صرف ترجمہ بتاتے اور اگر محمد میاں کہیں اٹکتے تو کہتے کہ اس کے معنی تم فلاں لفظ میں پڑھ چکے ہو، یہ لفظ وہی لفظ ہے مگر فرق یہ ہے کہ اس میں الف نون لگا ہے، اس کے یہ معنی ہوتے ہیں، اس میں واؤ نون آیا ہے اس کے یہ معنی ہیں، اس میں ت ہے اس کے یہ معنی ہیں، الغرض سمجھا کر ان کے ذہن کو ایسے رخ پر ڈالتے کہ وہ خود بخود ترجمہ نکال لیتے۔

بنیادی نصاب تعلیم و درس

اس کے بعد اس وقت کی رائج مصری کتابوں کو پڑھایا، جن میں "حکایات للأطفال" خاص طور پر قابل ذکر ہے، لیکن وہ مصری کتابوں کو ان کی تصویروں اور غیر دینی مضامین کی وجہ سے بچوں کے لیے مفید نہیں سمجھتے تھے، اور وہ یہ چاہتے تھے کہ بچوں کے لیے ایسا عربی نصاب تیار ہو جو بچوں کے دل و دماغ میں انبیاء کرام، صحابہ کرام اور دین اسلام کی عظمت بٹھائے۔

دوسری طرف مولانا عبدالماجد دریابادی نے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو لکھا کہ مصر کی مصور اور غیر دینی درسی نصاب کا دارالعلوم جیسے مدرسہ میں داخل ہونا اور ان کو

بچوں کو پڑھانا سمجھ میں نہیں آتا، مولانا عبدالماجد دریابادی کی توجہ دلانے اور ڈاکٹر صاحب کی فکرمندی سے مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی نے اپنے خاص انداز اور اسلوب میں قصص النبیین کا سلسلہ لکھنا شروع کیا، جس کے تین حصے لکھے اور اپنے بھتیجے محمد میاں کی طرف ان کو منسوب کیا، گویا کہ انھیں کے لیے لکھ رہے ہوں، اس پر جو مقدمہ لکھا، اس کا مخاطب محمد میاں کو بنایا اور لکھا:

"ابن أخي العزيز! أراك حريصاً على القصص والحكايات، وكذلك كل طفل في سنك، تسمع هذه القصص بكل رغبة وتقرأها بكل رغبة، ولكني أتأسف لأني لا أرى في يدك إلا حكايات السنانير والكلاب والأسد والذئاب والقردة والذباب، وعلينا العهدة في ذلك، فذلك هو الذي تجده مطبوعا، وقد بدأت تتعلم اللغة العربية لأنها لغة القرآن والرسول صلى الله عليه وسلم ولغة الدين، ولك رغبة غريبة في درسها، ولكني أخجل أنك لا تجد ما يوافق منك من القصص العربية إلا قصص الحيوانات والأساطير والخرافات، فرأيت أن أكتب لك ولأمثالك أبناء المسلمين قصص الأنبياء والمرسلين (عليهم صلوات الله وسلامه) بأسلوب سهل، يوافق منك و ذوقك، وهذا هو الكتاب الأول من "قصص النبيين للأطفال" أهديه إليك، وقد حاكيت فيه أسلوب الأطفال وطبيعتهم، فلجأت إلى تكرار الكلمات والجمل وسهولة الألفاظ وسط القصة، وأرجو أن يكون هذا الكتاب الصغير أول كتاب يقرأه الأطفال في اللغة العربية ويدرسونه في مدارسهم، وسأتحفك إن شاء الله بقصص الأنبياء ممتعة شائقة واضحة سهلة خفيفة

جميلة، ثم لايكون فيهما بشيئ من الكذب، أقرّ الله بك يا محمد! عين أبويك وعمك وعين الإسلام وأعاد بك بركات آبائك على هذا البيت وعلى المسلمين.“

یہ ایک فطری بات ہے کہ بچہ جب دیکھتا ہے کہ اس کا نام اور ذکر کسی کتاب یا مضمون میں لیا جاتا ہے تو وہ خوش ہوتا ہے اور ایک دوسرے کو دکھاتا پھرتا ہے، اور دوسرے بچے اس پر رشک کرتے ہیں، یہی حال محمد میاں کا تھا، ان کے چاہنے والے چچا نے ان کے لیے ایک کتاب لکھی، دلچسپ اور پراز معلومات، پھر ان کا نام چھپا، وہ بہت خوش ہوئے، اور اپنے ہم عصروں پر ان کو کسی قدر فخر وناز ہوا، ان کے ہم سبق اور ہم عمر بھائی واضح سلمہ کو خیال آیا کہ یہ بھتیجے ہم بھانجے، ہمارا تو نام نہیں آیا، ان کا نام آیا، ان کو اس احساس پر قلق ہوا، محمد میاں کو خدا نے کم عمری کے باوجود ذہن رسا دیا تھا، اور تالیف قلب کی دولت عطا کی تھی، ایک لطیفہ کے طور پر بولے تمہارا بھی نام آیا ہے، اور ”واضحة سهلة“ کی طرف اشارہ کیا۔

ترجمہ ریاض الصالحین

محمد میاں نے مصری کتابوں کو پڑھ کر ”قصص النبیین“ پڑھی پھر ”القراءة الراشدة“ کے حصے پڑھے، ڈاکٹر صاحب نے قرآن شریف کی بعض سورتوں کے ترجمے اور مندرجہ بالا کتابوں کے بعد حدیث کی کتاب ”ریاض الصالحین“ پڑھائی، اس کتاب کے پڑھانے میں بھی ڈاکٹر صاحب نے نہایت سہل طریقہ اختیار کیا۔

جس وقت محمد میاں ڈاکٹر صاحب سے ریاض الصالحین پڑھتے تھے، اسی زمانہ میں واضح سلمہ اس کتاب کو دارالعلوم میں پڑھتے تھے، ڈاکٹر صاحب کا قاعدہ تھا کہ خود بھی پڑھاتے تھے اور بعض دفعہ دوسرے سے پڑھواتے تھے، ایک دن واضح سلمہ پڑھ کر آئے تو ڈاکٹر صاحب نے ان کو بلایا اور کہا کہ ریاض الصالحین کا وہ سبق جو تم پڑھ کر آئے ہو محمد کو پڑھاؤ، دونوں بچوں کی سطح تقریباً ایک تھی، ایک تو ڈاکٹر صاحب کی

موجودگی، دوسرے تازہ سبق، واضح گھبرائے اور پریشاں سے ہوئے۔

اسی زمانہ میں ڈاکٹر صاحب نے اپنی ہمشیرہ امۃ اللہ تسنیم صاحبہ کو جو اس زمانہ میں بعض حوادث کی وجہ سے بہت غمگین اور فکرمند تھیں، اس مبارک کام پر آمادہ کیا کہ وہ ریاض الصالحین کا اردو ترجمہ کریں، بڑے بھائی کے حکم سے انھوں نے دلجمعی کے ساتھ اس کا ترجمہ کر دیا، اور اس کا نام ''زادِ سفر'' رکھا، یہ کتاب بہت زیادہ مقبول ہوئی، اور بہت سے مدارس میں داخل نصاب کر لی گئی، محمد میاں نے اس کتاب کو بھی مطالعہ میں رکھا، اور اصل کتاب ریاض الصالحین کو بھی پڑھتے رہے۔

انشاء اور تعبیر

ان کتابوں کے پڑھنے کے ساتھ ساتھ انشاء کا کام بھی کرنے لگے، شروع میں عموماً اردو سے عربی اور عربی سے اردو جملوں اور عبارتوں کا ترجمہ کرتے تھے، بالکل شروع میں چند دن انشاء کا کام راقم السطور کو دکھایا، اس کے بعد جب اس کا کام اور بڑھا تو دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اس وقت کے استاد ادب مولانا عبداللہ عباس ندوی صاحب کو ڈاکٹر صاحب نے بلا کر فرمایا کہ وہ محمد میاں کی انشاء کو دیکھ لیا کریں، انھوں نے اس خدمت کو انجام دیا، وہ کہتے ہیں:

> ''ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حکم سے محمد میاں نے انشاء کا کام کئی بار مجھ کو دکھایا، میں نے آٹھ آٹھ صفحے ان کے لکھے ہوئے دیکھے مگر سوائے ایک یا دو جگہ کے کوئی نحوی یا صرفی عبارت کی غلطی نظر نہیں آئی، میں نے اس کا ذکر ڈاکٹر صاحب سے کیا تو وہ اتنا خوش ہوئے کہ آپ کا چہرہ مارے خوشی کے کھل اٹھا اور بالکل انار کی طرح روشن اور سرخ ہو گیا۔''

ادب ونحو وصرف اور فقہ

ادب کی کتابوں میں کلیلہ و دمنہ کا کچھ حصہ راقم السطور سے پڑھا، اس زمانہ

میں برادر عزیز مولوی محمد رابع دار العلوم سے فارغ ہو چکے تھے اور دیوبند میں کچھ عرصہ رہ کر دار العلوم دیوبند کے اساتذہ سے تعلیم حاصل کر چکے تھے، ان سے بھی محمد میاں نے گھر ہی پر رہ کر کچھ کتابیں پڑھیں، جن میں حماسہ کے بعض ابواب بھی ہیں۔

ایسا نہیں تھا کہ وہ نحو وصرف سے بالکل بے نیاز ہوں، ان کو بعض دفعہ اپنی اس کمی کا احساس ہوتا تھا، اگرچہ انھوں نے سبقاً سبقاً کوئی نحوی یا صرفی کتاب نہیں پڑھی، بلکہ عمومی طور پر اس سے استغنا برتا، لیکن کوئی نہ کوئی کتاب کبھی نہ کبھی مطالعہ میں رکھ لیتے، مثلاً ایک دن راقم السطور سے کہنے لگے کہ:

> ''منجھلے بھیا! جی چاہتا ہے کہ کوئی نحو وصرف کی ایسی ہلکی کتاب نظر سے گزر جائے جو ذہن ودماغ پر بار بھی نہ بنے اور لکھنے پڑھنے میں کوئی غلطی نہ ہو، کوئی ایسی کتاب بتایئے۔''

راقم السطور کو یاد آیا کہ اس نے مولانا شبلی صاحب فقیہ دار العلوم ندوۃ العلماء کے کہنے پر ان ہی سے ایک کتاب ایسی پڑھی تھی جو مختصر بھی ہے اور جامع بھی، اس کا نام ''ضریری'' ہے، تو ان کو مشورہ دیا کہ تم ضریری پڑھ لو، محمد میاں نے وہ کتاب کتب خانہ سے حاصل کر لی اور اس کے کچھ اسباق راقم السطور سے پڑھے، وہ کتاب ان کو بھی بہت پسند آئی، انھوں نے مولانا عبد الرحمٰن امرتسری کی کتاب کتاب النحو اور کتاب الصرف بھی مطالعہ میں رکھی، اسی طرح اس وقت کی رائج کتابوں میں النحو الواضح بھی تھی، اور وہ کتاب اکثر گھر میں بھی رہتی تھی، اس کو بھی انھوں نے دیکھا تھا مگر سبقاً سبقاً کسی کتاب کا پڑھنا یاد نہیں ہے۔

فقہ میں کنز الدقائق اور شرح وقایہ کے اکثر اسباق مولانا سید محمد مرتضیٰ مظاہری بستوی سے پڑھے، جو ان دنوں دار العلوم ندوۃ العلماء کے چھوٹے درجوں کو پڑھاتے تھے، اور محلہ ہی میں رہتے تھے، ادب میں کامل مبرّد کی مولوی احمد عثمان ندوی سے پڑھی اور مختارات کا کچھ حصہ اپنے خالہ زاد بھائی مولانا سید ابوبکر حسنی سے پڑھا، جو ان دنوں حلیم مسلم کالج کانپور سے ایک طویل رخصت لے کر گھر پر مقیم تھے۔

اردو وانگریزی

اسی طرح مولانا سید ابوبکر صاحب سے ان کے رائے بریلی قیام کے دوران روزانہ انگریزی سے اردو اور اردو سے انگریزی ترجمہ جملوں میں کرتے تھے، ان کا یہ سبق کسی جگہ بیٹھ کر اور جم کر نہیں ہوتا تھا بلکہ ٹہلتے ٹہلتے اور بات کرتے کرتے نہایت ہلکے پھلکے انداز میں ہوتا تھا، یہی وہ ابتدا تھی جس کے بعد محمد میاں نے انگریزی زبان میں اپنی استعداد بہت بڑھالی تھی، اور وہ بے تکلف انگریزی اخبارات پڑھنے لگے تھے، ان کے والد ماجد ڈاکٹر صاحب کا معمول تھا کہ وہ روزانہ ایک انگریزی اخبار اور ایک اردو اخبار منگواتے تھے اور مطالعہ کرتے تھے، اسی وجہ سے محمد میاں نے بھی اپنا معمول یہی بنالیا۔

علمی وادبی سرگرمیوں کا نقطۂ آغاز

اسی زمانہ میں ان کی ملاقات ایک ایسے مخلص طالب علم سے ہوئی جن سے روابط ایسے بڑھے کہ آخر عمر تک علمی خدمت اور حسن معاشرت میں دونوں نے حق رفاقت ادا کردیا، اس وقت کے یہ طالب علم اور ان کے مخلص و باوفا دوست مولوی سعید الرحمٰن صاحب ہیں (۱) جو اس وقت کا حال ان الفاظ میں لکھتے ہیں:

> ''مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ۱۹۵۲ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے شیخ الحدیث حضرت مولانا شاہ حلیم عطا صاحب کے درس حدیث میں ایک ایسے طالب علم بھی شریک ہوتے تھے جن کی صورت و سیرت فرشتوں جیسی تھی، نیکی اور بھولا پن ہر چیز سے نمایاں تھا، اور عام طلبہ سے بالکل الگ ایک حیثیت رکھتے تھے، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ ناظم ندوۃ العلماء مولانا سید عبدالعلی حسنی رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادہ اور حضرت مولانا

---

(۱) مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی مدیر ''البعث الاسلامی'' ندوۃ العلماء و مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء۔ (م)

سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی کے بھتیجے جناب محمد میاں ہیں، میں دارالعلوم میں برابر ان کو دیکھتا تھا، اور کچھ دنوں کے بعد کچہری روڈ پر واقع اصلاح وتبلیغ کے مرکز میں جہاں ہر اتوار کو حضرت مولانا کا درس قرآن ہوا کرتا تھا وہاں وہ دکھائی دینے لگے، ہمارے بعض ساتھیوں نے ان سے راہ ورسم پیدا کرلی تھی، اور حقیقت یہ ہے کہ ان ہی کی وساطت سے ہمارا ان کا تعارف بھی ہوا، اور کبھی کبھار ملاقاتیں بھی ہونے لگیں، اتوار کے درس میں خاص طور سے ہم لوگ ایک دوسرے سے ملنے کی کوشش کرتے، اس کے کچھ ہی دنوں بعد انھوں نے ایک عربی مجلس قائم کی، جس کا نام "المنتدی الأدبي" رکھا، (۱) از راہ کرم انھوں نے مجھے بھی اس کا ممبر بنایا اور ہر جمعہ کو اس کے عربی جلسہ میں شرکت کے لیے ان کا خصوصی دعوت نامہ بھی آنے لگا، "المنتدی الأدبي" ہی دراصل ہماری علمی اور ادبی سرگرمیوں کا نقطۂ آغاز ثابت ہوئی، اسی کے ذریعہ تعلقات میں وسعت اور گہرائی پیدا ہوئی اور اسی وجہ سے عموماً عربی اخبارات اور رسائل اور ادبی کتابوں کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا، اس کے ہفتہ وار جلسوں کے لیے مضامین لکھنے کے سلسلہ میں آپس میں تبادلۂ خیال بھی ہونے لگا، اور اسی کے بہانے ملاقاتوں کا سلسلہ بھی وسیع ہوا اور ہر ایک کو دوسرے سے مختلف مشوروں اور کاموں میں مدد ملنے لگی۔" (۲)

---

(۱) اس کے صدر مولانا سید محمد طاہر حسینی (م-۲۰۰۲ء) تھے جو بعد میں مددگار ناظم ندوۃ العلماء ہوئے۔
(۲) تعمیر حیات محمد الحسنی نمبر/۲۲۶-۲۲۷۔

اعلیٰ تعلیم اور حدیث کی تکمیل

ان کی تعلیم کا چوتھا اور آخری دور ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۲ء تک کہا جا سکتا ہے، جبکہ ان کی علمی استعداد اور بڑھی، اور کتابوں کے پڑھنے کا شوق بڑھنے لگا، اور ہر علم وفن کی کتابوں کو وہ سمجھنے لگے تو ڈاکٹر صاحب نے احیاء العلوم پڑھنے کی تاکید کی، حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی کتاب سرور المحزون پڑھائی اور اس کا اردو میں ترجمہ کرایا، حدیث کی کتابوں میں جمع الفوائد پڑھنے کو دی، اور اس کی حدیثوں پر نشان لگائے، پھر وہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی اور تصانیف پڑھنے لگے، امام ابن تیمیہ اور امام ابن قیم کی کتابیں پڑھنے کے لیے دیں، چونکہ ڈاکٹر صاحب ان ہر دو بزرگوں کے بڑے قائل اور ان سے متأثر تھے اس لیے ان کی کتابوں کو خود رکھتے اور دوسروں کو ان کے پڑھنے کی تاکید کرتے۔

حدیث کی کتابوں میں ریاض الصالحین کے بعد مشکوٰۃ پڑھوائی، اب محمد میاں اس درجہ پر پہنچ گئے تھے کہ وہ دار العلوم میں جا کر صحاح کی تعلیم حاصل کریں، اس کام کے لیے ڈاکٹر صاحب کی نظر مولانا شاہ حلیم عطا سلونی پر پڑی، جو اس وقت مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی کے چلے جانے کے بعد حدیث کے استاد یا بالفاظ دیگر شیخ الحدیث ہوئے تھے، اور مدتوں سے اس درس گاہ میں حدیث کی خدمت انجام دے رہے تھے، محمد میاں نے ۵۲-۱۹۵۱ء میں ان کی خدمت میں جا کر حدیث کی تعلیم حاصل کی، اور اس فن کی کتابوں کے پڑھنے کے بعد گویا علوم وفنون کی تعلیم سے فراغت حاصل کرلی۔ (۱)

---

(۱) حدیث کے اسباق میں ان کے ساتھ مولانا ڈاکٹر تقی الدین صاحب ندوی، مولانا سعید الرحمٰن اعظمی صاحب ندوی مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء، مولانا وجیہ الدین صاحب مرحوم اساتذہ دار العلوم ندوۃ العلماء، پروفیسر احتشام احمد ندوی، مولانا سید احمد علی حسنی ندوی مرحوم وغیرہ بھی رہے، مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی نے اپنی دینی وعلمی خدمات کا موضوع حدیث کو بنایا اور اسی موضوع پر جامع ازہر مصر سے پی. ایچ. ڈی. بھی کی، اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کی خدمت میں رہ کر مزید اختصاص پیدا کیا۔ (م)

فکری، ادبی اور تاریخی کتابوں کا مطالعہ

حضرت مولانا شاہ حلیم عطا صاحب سے تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ محمد میاں دارالعلوم کے دوسرے اساتذہ مولانا محمد اسحٰق سندیلوی، مولانا محمد اویس ندوی سے بھی علمی استفادہ کرتے تھے، نیز کتب خانہ میں بیٹھ کر کتابوں کا مطالعہ کرتے، خصوصاً سید قطب، شیخ محمد الغزالی، احمد امین، احمد حسن زیات کی تصنیفات سے بہت زیادہ استفادہ کرتے۔

مصطفیٰ لطفی منفلوطی کی کتابوں کو بھی پڑھا، جن میں العبرات اور النظرات قابل ذکر ہیں، اسی طرح احمد امین کی حیاتی، فجر الاسلام، ضحیٰ الاسلام، امیر شکیب ارسلان کی "حاضر العالم الإسلامي"، طٰہٰ حسین کی "الأيام" مطالعہ میں رکھی، ان کے علاوہ شیخ حسن البنا کی تصنیفات، ان کی تحریک اخوان المسلمون کے داعیوں کی تصنیفات اور اس جماعت کے اخبارات جیسے الدعوة، منبر المشرق، مصر سے نکلنے والے دوسرے اخبارات الهلال، الجمهورية برابر مطالعہ میں رکھتے تھے، اور پھر اس کے بعد تو مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے مسلسل عرب ممالک کے سفروں، مصر و سوڈان، شام و عراق، کویت و اردن کے دوروں نے کتابوں اور رسالوں کی آمد کا دروازہ کھول دیا، کون سا عربی اخبار تھا جو نہ آتا ہو اور کون سی علمی کتاب تھی جو اس گھر میں موجود نہ ہو، یہ سب رسالے کتابیں محمد میاں نے پڑھیں۔

مولانا محمد اویس صاحب نگرامی ندویؒ کا ایک صائب مشورہ

راقم السطور کو یاد ہے کہ ایک دن وہ اور محمد میاں مولانا محمد اویس ندوی (نگرامی) کے مکان پر جو دارالعلوم کے حدود میں واقع تھا، ملنے گئے، مولانا نے کچھ دیر گفتگو کے بعد فرمایا:

> "محمد میاں! ڈاکٹر صاحب اور علی میاں کا حکم اور مشورہ سر آنکھوں پر، مگر میرا حقیر مشورہ یہ ہے کہ آپ سید قطب، غزالی، احمد امین

اور عقاد، طٰہٰ حسین، منفلوطی، رافعی کی کتابوں کو بہت زیادہ پڑھتے ہیں، اگر ان کے بجائے امام ابن تیمیہؒ اور امام ابن قیمؒ کی تصنیفات کو زیر مطالعہ رکھیں تو آپ کو بہت زیادہ فائدہ ہوگا، ان کے آگے ان لوگوں کی کیا حیثیت ہے؟''

پھر مولانا نے ان ہر دو بزرگوں کی تصنیفات کی نشاندہی کی اور ان کے پڑھنے پر اصرار کیا، ان کے اصرار پر محمد میاں نے ادھر اور زیادہ توجہ دی، چونکہ ڈاکٹر صاحب اور مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی بھی ان ہر دو بزرگوں کی تصنیفات کو پسند کرتے تھے اور ضرور ان کو مطالعہ میں رکھتے تھے، مولانا ابوالحسن علی ندوی نے زادالمعاد کا خلاصہ بھی کیا تھا، اس لیے محمد میاں نے زادالمعاد پڑھی، اس کے علاوہ سیرت ابن ہشام اور دوسری اہم تاریخی اور سیرت کی کتابوں کو مطالعہ میں رکھا۔

غیر مرتب نظام درس اور صرف ونحو سے استغنا کے باوجود علمی فضیلت اور زبان وادب میں کمال وعبور

پھر وہ زمانہ آگیا کہ ان کا محبوب مشغلہ کتابوں کا پڑھنا اور مضامین لکھنا بن گیا، ان کی میز مختلف علوم وفنون کی کتابوں سے ہمہ وقت مزین رہتی، ان میں قدیم کتابیں بھی ہوتیں اور جدید مصنفین کی تصانیف بھی، تفسیر، سیرت، حدیث، تاریخ اور ادب کی مختلف النوع کتابوں کو وہ پڑھتے ہی رہتے، اس طریقہ تعلیم اور ڈاکٹر صاحب کی ہمہ وقت توجہ، کتابوں کے مطالعہ، مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کی ادبی تحریروں اور کتابوں کے پڑھنے، ہر دو برادران عزیزی محمد رابع اور محمد واضح سلمہما جو ہر وقت ساتھ رہتے اور دارالعلوم میں پڑھتے تھے، کے ذریعہ مختلف علوم وفنون کی کتابوں کے گھر میں آنے سے محمد میاں کے مطالعہ میں بڑی وسعت پیدا ہوئی، اور پھر گھر میں خود ایک مختصر سا کتب خانہ تھا، جس میں قدیم وجدید، نادر ونایاب، مطبوعہ اور قلمی کتابیں تھیں، ان

سب کے مطالعہ سے محمد میاں کے ذہن و دماغ، دل اور زبان کو جلا ملی، اور پھر ان کے قلم نے صفحۂ قرطاس پر ان کے نقوش ثبت کرنے شروع کر دیے، خدا نے ان کو ذہن رسا دیا تھا اور دماغ روشن، بغیر کسی محنت اور درسی کتابوں کے سبقاً سبقاً پڑھے بغیر دیکھتے دیکھتے ترقی کے وہ مراحل طے کیے جس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔

مولانا محمد منظور نعمانی جو اپنے دور کے ممتاز ترین عالم اور صاحب نظر بزرگ ہیں، جن کے علم و فضل و کمال اور تمام علوم و فنون میں ان کے تفوق و امتیاز پر سب کو اتفاق ہے، ۱۹۴۶ء میں بریلی سے منتقل ہو کر لکھنؤ آئے، اور اسی محلّہ میں قیام کیا، جس میں ڈاکٹر صاحب مقیم تھے، وہ اپنا تأثر ان الفاظ میں تحریر کرتے ہیں:

> "۱۹۴۶ء کی بات ہے جب راقم سطور نے مولانا علی میاں کے مشورہ بلکہ ان ہی کی تحریک پر الفرقان کو بریلی سے منتقل کرنے اور خود بھی منتقل ہونے کا فیصلہ کیا تھا، اس وقت اپنی رہائش اور الفرقان کے دفتر کے لیے جو مکان کرایہ پر ملا تھا وہ گوئن روڈ پر مولانا علی میاں اور ان کے برادر مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی علیہ الرحمہ کے مکان کے گویا بالکل برابر میں تھا، عزیز مرحوم مولانا محمد الحسنی ڈاکٹر صاحب کے اکلوتے صاحبزادے تھے، ان کو سب محمد میاں کہتے تھے، اس وقت وہ دس گیارہ سال کے بچے تھے، لیکن میں نے کبھی ان کو بچوں کے ساتھ یا بچوں کی طرح کھیلتے نہیں دیکھا، بولتے بھی بہت ہی کم تھے، دریافت کرنے پر معلوم ہوا تھا کہ یہ پڑھنے کے لیے کسی اسکول یا مکتب مدرسہ میں بھی نہیں جاتے ہیں، والد ماجد ڈاکٹر صاحب خود ہی ان کو قرآن پاک یا ترجمہ پڑھاتے ہیں، اور اسی کے ذریعہ عربی تعلیم ہو رہی ہے، اور مصر وغیرہ سے آنے والے عربی اخبارات کا بھی مطالعہ کراتے

ہیں، یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ صرف ونحو کی کوئی کتاب ان کو نہیں پڑھائی گئی ہے اور نہ پڑھانے کا ارادہ ہے، کچھ عرصہ بعد سنا کہ محمد میاں عربی میں مضمون نگاری کرنے لگے ہیں، ہم جیسوں کو بجا طور پر حیرت ہوگی کہ جس شخص نے صرف ونحو بالکل نہیں پڑھی، جو ماضی مضارع، معرب مبنی، مرفوع منصوب، مجرد مزید، منصرف غیر منصرف کو نہیں جانتا وہ عربی کا کوئی جملہ بھی کیسے صحیح لکھ سکتا ہے، لیکن اللہ کی شان اور قدرت کی کارفرمائی کہ محمد میاں نحو وصرف سے بالکل ناواقف اور نابلد ہونے کے باوجود بہت اچھی عربی لکھنے لگے اور جلد ہی وہ وقت آگیا کہ عالم عربی کے بعض بلند پایہ رسالوں میں مضامین بھیجنے لگے، اور ان رسالوں میں وہ مضامین بڑے اہتمام اور بڑی قدر سے غالباً یہ سمجھ کر شائع کیے گئے کہ یہ ہندوستان کے کسی علامہ کے قلم سے لکھے ہوئے ہیں، اس سلسلہ کا ان کا پہلا مضمون مشہور اخوانی زعیم سعید رمضان کے ماہنامہ ''المسلمون'' میں شائع ہوا تھا جو اس زمانہ میں دمشق سے نکلتا تھا اور عالم عربی کا بلند پایہ اور بہت ہی مؤقر مجلّہ تھا۔''(۱)

محمد میاں کے نحو وصرف سے استغنا اور ان فنون سے ناواقفیت کا حال اس واقعہ سے بھی معلوم ہو سکتا ہے جو مولانا محمد مرتضٰی مظاہری سناتے ہیں، وہ کہتے ہیں:

''۱۹۴۸ء یا ۱۹۴۹ء کا زمانہ تھا جب ڈاکٹر صاحب مرحوم نے مجھ سے فرمایا کہ محمد کو کنز الدقائق پڑھا دیجیے، ڈاکٹر صاحب فقہ کی کتابوں میں کنز الدقائق کو بہت پسند کرتے تھے، میں نے ڈاکٹر صاحب کے حکم پر ان کے مکان سے بالکل متصل اس

(۱) ''الفرقان'' لکھنؤ شمارہ جولائی ۱۹۷۹ء

مکان کی اوپری منزل پر جس میں ڈاکٹر صاحب کے بڑے داماد مکرمی سید محمد مسلم حسنی رہتے تھے، اور جس میں میرا عارضی قیام تھا، محمد میاں کو کنز الدقائق پڑھانی شروع کی، ایک دن پڑھاتے پڑھاتے میں نے پوچھ لیا، محمد میاں! اچھا یہ بتاؤ کہ یہ کون سا صیغہ ہے؟ وہ چپ رہے، میں نے کہا سوچ کر بتاؤ، پھر بھی وہ نہ بتا سکے، مولوی سید محمد ثانی صاحب بیٹھے ہوئے تھے، انھوں نے کہا: انھوں نے نحو وصرف پڑھی کہاں ہے جو آپ صیغہ پوچھ رہے ہیں، ان کو تو ماضی کی گردان بھی یاد نہیں، ذرا پوچھیے، میں نے کہا: ماضی کی گردان کرو، وہ گردان بھی نہ کر سکے، میں نے حیرت واستعجاب سے کہا کہ خدا کی شان! اتنی بڑی بڑی کتابیں پڑھتے ہیں اور گردان اور صیغوں تک سے ناواقف ہیں۔"

اور اس سے بڑھ کر یہ کہ جب وہ انشاء پردازی کے اس بلند مقام تک پہنچ چکے تھے جب مصر وحجاز اور دوسرے عرب ممالک کے علماء، ادباء اور اہل قلم حضرات ان کی تحریروں کو بڑے ذوق وشوق سے پڑھتے تھے، اور ان کی علمی فضیلت، قلم کی طاقت، بیان کی لطافت اور ان کی شگفتہ اور سلیس وبلیغ تحریروں کے قائل ہو چکے تھے، اور جن کا تعارف کراتے ہوئے عراق کے ایک بڑے ادیب عالم اور صاحب فکر صاحب قلم بزرگ شیخ محمد محمود الصواف نے ایک جلسہ میں ان کو اس طرح یاد کیا:

"عزیز طلبہ! تم اس نوجوان (محمد میاں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا) کو جانتے ہو؟ نہیں، بالکل نہیں جانتے، یہ وہ فاتح ہیں جنھوں نے تنہا ایوان ناصری کے کنگرے گرادیے، علم کدۂ قاہرہ میں ہلچل مچادی، اور ارباب صحافت کی دھجیاں بکھیر دیں، وہ عالم اسلام کے محبوب رسالہ "البعث الاسلامی" کے

روح رواں ہیں، میں شدت سے اس کا انتظار کرتا رہتا ہوں، جب تک ہاتھ میں نہیں آجاتا، آنکھیں ڈاک کی طرف لگی رہتی ہیں، میں اداریہ پڑھتا ہی نہیں بلکہ اسے پیتا ہوں، مجھے ان کے سارے اداریے زبانی یاد ہیں، تم سننا چاہو تو آزمالو۔'' (۱)

وہ محمد میاں جن کے فضل وکمال اور بلاغت وفصاحت سے معمور تحریر کے ایسے بڑے ادیب ومقرر قائل ہیں، ان محمد میاں کا حال یہ تھا کہ اپنے انتقال سے صرف ایک ماہ پہلے اپنے مؤقر رسالہ البعث الاسلامی میں ذوالفقار بھٹو کی پھانسی پر ایک صفحہ کا مضمون لکھا، صبح کا وقت تھا، وہ اپنی میز کے سامنے بیٹھے ہوئے لکھ رہے تھے کہ راقم السطور اچانک پہنچ گیا، دیکھتے ہی بولے: منجھلے بھیا! آیئے ایک چیز دیکھیے، بس ذرا بیٹھیے پورا کرلیں تو دکھاتے ہیں، اور وہ تیزی سے اپنا قلم چلانے لگے، چند ہی منٹ بعد ایک کاغذ بڑھایا اور بولے: ہم نے بھٹو کی پھانسی پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے اور یہ وہی ہے کمپوز ہونے جارہا ہے، چچا میاں ہیں نہیں، وہ سفر پر ہیں، چھوٹے بھیا (مولوی محمد رابع ندوی) اور واضح دونوں رائے بریلی میں ہیں، آپ اس پر اپنی نظر ڈال لیں۔

راقم سطور نے حیرت سے کہا: تمہارا مضمون اور میں دیکھوں؟! تم اتنا اچھا مضمون لکھتے ہو کہ میں خود اس سے استفادہ کروں نہ یہ کہ میں دیکھوں، یہ کیسی الٹی بات!

وہ مسکرا کر بولے: ارے دیکھیے بھی، اس میں دو چیزیں دیکھنی ہیں: ۱-کوئی نحوی یا صرفی غلطی تو نہیں ہے؟ ۲-مضمون کہیں سخت تو نہیں ہوگیا ہے؟ بس اتنا دیکھ لیجیے اور پاس کردیجیے، ہم کو اطمینان ہوجائے گا۔

ان کے اصرار پر میں نے مضمون کو اپنے ہاتھوں میں لیا اور پڑھا اور کہا: میرے نزدیک کوئی نحوی یا صرفی غلطی نہیں ہے اور اب تو تم ایسی کوئی غلطی بھی نہیں کرتے، تمہارا قلم تو بہت رواں، شگفتہ اور پرتاثر ہوچکا ہے۔

---

(۱) تحریر مولوی محمد ایوب نیپالی جو اس جلسہ میں موجود تھے، اور محمد میاں کے میزبان تھے۔

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

رہا لہجہ کی سختی تو میرا تاثر یہ ہے کہ ذرا سخت ہو گیا ہے مگر کوئی حرج نہیں، ماموں جی تو اس معاملہ میں سخت رویہ ہی کے قائل ہیں۔

محمد میاں بولے: ''بس بس ٹھیک ہے، ہم تو چچا میاں کے خیالات کے ترجمان ہیں، ہمارا قلم ان کے قلم، ہماری زبان ان کی زبان، ہمارے خیالات ان کے خیالات کے تابع ہیں۔''

یہ کہہ کر مجھ سے مضمون لے لیا، مسکرائے اور اپنے بیگ میں رکھ لیا، پھر وہ مضمون چھپا، بعض اہل الرائے کے نزدیک وہ مضمون سخت تھا، مگر جب خال مکرم مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی اپنے سفر سے واپس ہوئے اور اپنے وطن تکیہ کلاں (دائرہ شاہ علم اللہ) تشریف لائے تو محمد میاں بھی آئے، میں نے ایک صبح کو خال مکرم مدظلہ سے تنہائی میں عرض کیا کہ محمد میاں نے بھٹو پر جو مضمون لکھا وہ آپ نے پڑھا، فرمانے لگے: ہاں پڑھا، بہت اچھا ہے، محمد میاں نے خوب ہی لکھا، میں ان کو اس پر مبارکباد دوں گا، اتنے میں محمد میاں کمرے میں داخل ہوئے تو خال مکرم مولانا مدظلہ نے بہت خوشی کا اظہار کیا اور اس مضمون پر داد دی، محمد میاں اپنے عم مکرم مدظلہ کی تحسین اور خوشی پر متأثر ہوئے اور ان کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا، میں نے ان کے چہرہ کو بغور پڑھا، معلوم ہوتا تھا کہ مارے خوشی کے آنکھوں سے آنسو نکل آئے ہیں، ان کی اس کیفیت سے میرا دل بھی خوشی سے جھوم اٹھا۔

رسائل و جرائد کا مطالعہ اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے بعض رسائل کا ترجمہ

محمد میاں کو ۱۹۴۵-۴۶ء ہی سے جبکہ وہ عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھ رہے تھے، ان کے والد ماجد ڈاکٹر عبدالعلی صاحب بعض مصری، شامی، اور حجازی جرائد و کتب

کے مطالعہ پر زور دیتے تھے، اس زمانہ میں ڈاکٹر صاحب کے نام مکہ مکرمہ سے نکلنے والا اخبار ''اُم القریٰ'' آتا تھا، اس طرح بعض مصری جرائد اور کتابیں بھی آنے لگی تھیں، وہ سب محمد میاںؒ اور برادران عزیزان مولوی محمد رابع و محمد واضح کے مطالعہ میں آتی تھیں، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ۱۹۴۵ء میں نئی دہلی میں اسلامی ایشیائی کانفرنس میں عرب نمائندوں اور سفیروں کے سامنے ایک تقریر کی تھی جو إلى ممثلي البلاد الإسلامية کے نام سے طبع ہوئی تھی، اس کے علاوہ من الجباية إلى الهداية طبع ہوئی، پھر ۱۹۴۷ء میں مولانا مدظلہ سفر حج پر گئے اور حجاز میں مختلف علماء سے گفتگو کی، تقریریں کی، اور مختلف مکتبوں سے کتابیں خریدیں اور اپنے برادر مکرم ڈاکٹر صاحب کو ارسال کیں، اس سفر میں راقم السطور بھی ساتھ تھا، ایک دن تیونسی علماء سے ملاقات ہوئی، انھوں نے درجنوں اخبار اور جرائد دیے، یہ ساری کتابیں اور اخبارات ساتھ آئے اور ان کا مطالعہ محمد میاں نے کیا۔

۱۹۵۰ء میں مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی اور عزیزی مولوی محمد رابع ندوی حجاز گئے، اس سے پہلے مولانا مدظلہ کی ایک اردو تقریر ''صورت وحقیقت'' کا ترجمہ محمد میاں نے عربی میں کیا تھا، جس کا نام "بين الصورة والحقيقة" رکھا، وہ رسالہ عرب حلقوں میں بڑا مقبول ہوا، مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی نے اس کتاب کے متعلق مصر سے ۱۹۵۱ء میں اپنے برادر مکرم ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کو لکھا:

> ''محمد میاں کی کتاب بڑی دور دور پہنچ رہی ہے، ان کو اپنی عربی تحریر کی مشق خوب بڑھانی چاہیے۔''

دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

> ''سب سے زیادہ جو رسالہ مقبول و مؤثر ہوا وہ "بين الصورة والحقيقة" ہے، پہلے سے اس کا اندازہ نہ تھا، وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس کی گرفت سخت اور صاف اور مضمون عام فہم اور روزانہ

زندگی سے تعلق رکھتا ہے، یہ رسالہ چونکہ پہلے سے پہنچ چکا تھا، اس لیے اس کی اشاعت بھی بہت ہوئی، اور اکثر حلقوں میں ہم سے پہلے پہنچ گیا۔"

اسی زمانہ میں محمد میاں نے اپنے عم مکرم مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کی تقریر "سیرت محمدی کا پیغام" کا ترجمہ عربی میں کیا تھا، اس کا ذکر ڈاکٹر عبدالعلی صاحب نے مولانا موصوف سے خط کے ذریعہ کیا تھا، جس کا جواب مولانا نے دیا:

"آپ نے محمد میاں سلمہ کے ترجمہ "سیرت محمدی کا پیغام" کا ذکر کیا ہے، وہ بھیج دیں تو کسی رسالہ میں شائع ہو جائے گا۔"

پھر جب مولانا موصوف حجاز سے قاہرہ گئے تو ان کو وہ ترجمہ مل گیا، وہ اس کی وصول یابی پر لکھتے ہیں:

آج کی ڈاک سے محمد سلمہ کا کیا ہوا ترجمہ "سیرت محمدی کا پیغام" پہنچا، ان شاء اللہ یہاں کسی مناسب مجلّہ میں شائع ہو جائے گا۔

ابوالحسن علی

۶ رجمادی الثانیہ ۱۳۷۰ھ

مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کا سفر مصر و سوڈان بڑا کامیاب رہا، اس سفر کی پوری روداد بعد میں چھپی، جس کا نام "مذكرات سائح في الشرق الأوسط" ہے، یہ کتاب بڑی دلچسپ اور معلومات افزا ہے، اس سفر کے دوران دونوں بھائیوں کے درمیان خط و کتابت کا ایک سلسلہ قائم رہا، ڈاکٹر صاحب اپنے قیمتی مشوروں سے مستفید کرتے رہے، اور مولانا موصوف وہاں کے حالات و کیفیات اور سفر کے تأثرات سے آگاہ کرتے رہے، مصر جانے سے پہلے مولانا موصوف حجاز میں ٹھہرے، ان کے ہمراہ عزیزی مولوی محمد رابع سلمہ بھی تھے، مولوی سید محمد طاہر صاحب، مولانا معین اللہ ندوی، مولانا عبداللہ عباس ندوی اور مولوی عبدالرشید ندوی، مولوی سید

رضوان علی ندوی بھی، ڈاکٹر صاحب نے اپنے ایک خط میں تحریر فرمایا:

”رابع سے کہو کہ سید ہاشم علی نحاس کے یہاں سے خریطة أوربا، خريطة الشرق الأوسط اور الرابطة الإسلامية اور الشرق العربي وبعض دیگر جرائد کی ایک ایک کاپی لیتے آئیں۔“

مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی نے مصر سے بہت سی وہ کتابیں ورسالے جو مصر کے علماء وادباء اور مصنفین نے ان کو ہدیۃً دی تھیں، پارسل کے ذریعہ اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر صاحب کو بھیجیں تاکہ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ساتھ محمد میاں ان کا مطالعہ کریں، مولانا نے اپنے خط میں لکھا:

ان میں کئی سو کتابیں ہیں جو مصر کے علماء ومصنفین وادباء نے ملاقات کے وقت ہدیہ دیں، اور بعض کتابیں کتب خانہ ندوۃ العلماء کے لیے اور بعض علمائے ہندوستان کے لیے ہیں، سب پر ان کی تصریح ہوگی، لیکن زیادہ تر ہماری ذاتی کتابیں ہیں، ان میں ”العقد الفريد“ محمد واضح کو دے دی جائے، انھوں نے فرمائش لکھی ہے، یہ احمد امین نے ہمیں ہدیہ کی ہے، اور وحي الرسالة (۱-۲-۳) اور جو کتاب محمد میاں پسند کریں وہ رکھ لیں، پھر ہم ان شاء اللہ آکر جو چیزیں جہاں کی ہوں گی بتلادیں گے، بدائع المنن بھی اس میں ہوگی اور ان شاء اللہ کچھ درسی اور جغرافی کتابیں، محمد سلمہ کی اور بھی کتابیں ہیں جو ہم آکر دیں گے۔

ابوالحسن علی

۲۲/اپریل ۱۹۵۱ء

کتابوں کے اس پارسل کے پہنچنے میں بہت زیادہ تاخیر ہوئی، جس کی وجہ سے

ڈاکٹر صاحب اور محمد میاں کو اس کا انتظار بڑا سخت معلوم ہوا، اور انھوں نے تقاضہ کا خط لکھا، محمد میاں اپنے خط میں لکھتے ہیں:

عم مکرم! مدظلہ العالی

السلام علیکم

آداب کے بعد گزارش ہے کہ ہم لوگ بعافیت ہیں، امید ہے کہ آپ بھی بعافیت ہوں گے، مکہ معظّمہ سے آپ کا گرامی نامہ ملا، مسرت ہوئی، اللہ تعالیٰ خیریت وخوشی سے واپس لائے، اپنی خاص دعاؤں میں فراموش نہ فرمائیں، پارسل معلوم نہیں کس منزل پر ہے، سخت انتظار ہے، ابھی کسی قسم کی کوئی اطلاع یا بلٹی نہیں آئی، چھوٹے بھیا (مولانا محمد رابع) کو سلام۔

والسلام

محمد

۳۰ رستمبر ۱۹۵۱ء

اردو تعلیم اور مطالعۂ کتب

اب تک تو محمد میاں کی عربی تعلیم کی سرگزشت بیان کی جارہی تھی، اب ایک نظر ان کی اردو تعلیم پر بھی ڈالتے چلئے، محمد میاں نے اولاً مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کی مشہور اور مفید عام کتاب کا سیٹ پڑھا، اس کے بعد اپنے والد ماجد ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب کی تصنیف ''اسلام کی تعلیم'' اور جد امجد مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب کی کتاب ''نور الایمان'' اور ''تعلیم الاسلام'' پڑھیں، اس کے ساتھ ان کی کتاب ''اصلاح'' کو مطالعہ میں رکھا، نیز ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب کی تصنیف ''نماز سمجھ کر پڑھیے'' پڑھی جو غالبًا خود ڈاکٹر صاحب موصوف نے پڑھائی، ممکن ہے یہ کتاب انھوں نے اپنے بیٹے

کے لیے ہی لکھی ہو، اس کتاب کو محمد میاں بہت زیادہ پسند کرتے تھے، اور اس کی اشاعت کرتے تھے، اور آخر عمر میں بھی ارادہ تھا کہ وہ اس کتاب کو دوبارہ چھپوائیں گے، سیرت نبویؐ میں مولانا سید سلیمان ندوی کی ''رحمت عالم''، مولانا قاضی سلیمان منصور پوری کی ''رحمۃ للعالمین'' اور مولانا سید مناظر احسن گیلانی کی ''النبی الخاتم'' پڑھی، ''النبی الخاتم'' کی وہ بہت تعریف کرتے تھے، عقائد میں اولاً مولانا خرم علی بلہوری کی ''نصیحۃ المسلمین'' اور بعد میں مولانا شاہ اسماعیل شہیدؒ کی مشہور و معروف کتاب ''تقویۃ الایمان'' اپنے مطالعہ میں رکھی۔

۱۹۳۹ء میں جب ان کی عمر چار سال کی تھی، اس وقت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی تصنیف ''سیرت سید احمد شہیدؒ'' طبع ہوکر گھر پر آئی تھی، وہ اتنی خوب صورت تھی کہ ہر ایک اس کو اٹھا کر دیکھتا تھا، محمد میاں باوجود اس کے کہ اس کو پڑھ نہ سکتے تھے مگر اس کو دیکھتے اور اس کی خوب صورتی سے خوش ہوتے، اور جب ان کی عمر ۹-۱۰ر سال کی ہوئی تو اس کو مطالعہ میں رکھا، اور اس سے ان کے معصوم دل و دماغ پر بڑے خوش گوار اثرات پڑے، اور جہاد و مجاہدین کی عظمت دل میں بیٹھی، اس کتاب کے مطالعہ نے ان کو دینی جذبات سے سرشار کر دیا اور باوجود اپنی کم عمری کے انھوں نے اس سلسلہ کی دوسری کتابیں پڑھنی شروع کر دیں، جن میں مولوی محمد جعفر تھانیسری کی کتاب ''کالا پانی''، مولوی عبدالرحیم صادق پوری کی ''درِّ منثور''، مولانا غلام رسول مہر کی ''سید احمد شہید''، سید صاحب کے حالات پر مشتمل کتاب ''وقائع احمدی'' (مخطوطہ)، مولانا مسعود عالم ندوی کی ''ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک''، حضرت سید احمد شہید کی ''صراط مستقیم'' اور ان کے قلمی مکاتیب (فارسی) اور اپنے عم مکرم کا عربی رسالہ "ترجمة الامام أحمد بن عرفان" شامل ہیں، اس زمانہ میں ان کے گھر میں خاندان کے ایک بزرگ سید عبدالرزاق صاحب کلامی کی منظوم تصنیف ''صمصام الاسلام'' ترجمہ ''فتوح الشام'' (واقدی) پڑھی جاتی تھی، وہ اس کے جاندار اشعار سنتے

اوراس سے اثر لیتے، اور بعد میں خود اس کو پڑھا۔

ان کے عم مکرم کے تین رسالے ''وصیت رسول''، ''مسلمانوں پر ایک نظر اورقلب پر تین اثر'' اور ''تفسیر: الیوم أکملت لکم دینکم'' چھپ چکے تھے، وہ بہت مختصر اور مؤثر تھے، وہ محمد میاں نے پڑھے، اسی طرح مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی مشہور کتاب ''دعائیں'' انھوں نے سبقاً سبقاً پڑھیں، اور دعائیں یاد کیں۔

۱۹۴۲ء میں راقم السطور کے بڑے بھائی سید محمود حسن صاحب کا ۲۱ رسال کی عمر میں انتقال ہوا، محمد میاں ان سے بہت مانوس تھے، اس حادثہ کا پورے گھر پر بہت اثر تھا، راقم السطور نے ان کے انتقال کے بعد ہی ایک مختصر رسالہ ''اسلامی اخلاق'' کے نام سے لکھا اور طبع کرایا، اس کی طباعت میں جو کیف وسرور اور نشاط تھا وہ اب تک یاد ہے، سارے بھائی اس کو لیے پھرتے، اور تقسیم بھی کرتے تھے، محمد میاں مرحوم بھی اس جماعت میں شامل تھے، خود بھی پڑھا اور دوسروں کو بھی دیا۔

۱۹۴۳ء میں ادارۂ تعلیمات اسلام کا قیام عمل میں آیا، اس نے درس قرآن کے ساتھ ساتھ دینی تصنیفات کا ایک ذخیرہ بھی مہیا کیا جو عام فہم تھا، جس میں ''رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم)'' از مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی، ''سیرت محمدی کا پیغام'' از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، نیز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر الگ الگ رسالے طبع کیے، جن کو محمد میاں مرحوم نے اپنے مطالعہ میں رکھا، انھیں میں راقم السطور کے دو رسالے: ''امام ربانی مجدد الف ثانی'' اور ''حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی'' بھی تھے، جو محمد میاں نے پڑھے۔

۱۹۴۶ء میں محمد میاں کی عمر گیارہ سال کی تھی، اس سال راقم السطور نے ایک مکتبہ کی بنیاد رکھی، جس کا نام ''مکتبہ اسلام'' تھا، اس میں حضرت تھانوی کی تصنیفات، ادارہ تعلیمات اسلام کی ساری کتابیں، مولانا سید ابوالاعلی مودودی کی تصنیفات جو استاذ مکرم مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کے ذریعہ دستیاب ہوئی تھیں، جمع کی گئی تھیں،

راقم السطور کو اچھی طرح یاد ہے کہ محمد میاں کا اکثر وقت اس دوکان پر گزرتا تھا اور وہ اس مکتبہ کی اکثر کتابیں اٹھا اٹھا کر پڑھتے تھے۔

مکتبہ اسلام نے خال معظم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی تصنیف ''مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر'' چھاپی، وہ طبع ہو کر دہلی سے آئی تو محمد میاں نے اول سے آخر تک پڑھ ڈالی، اسی زمانہ میں سیدہ امۃ اللہ تسنیم صاحبہ (جو راقم السطور کی خالہ اور محمد میاں کی پھوپھی تھیں) کی ''زادِ سفر'' ترجمہ ''ریاض الصالحین'' چھپی، وہ گھر کی چیز تھی، اور خاصہ کی، وہ محمد میاں نے پڑھی، ان کا شعور بیدار ہوا اور مطالعہ کی قوت بڑھی، علم کا شوق روزافزوں ہونے لگا، انھوں نے دیکھا کہ ان کی والدہ ماجدہ کے ہاتھوں میں ایک کتاب رہتی ہے، جو ہر وقت وہ پڑھتی رہتی ہیں، اس کا نام ''طریق النجاۃ'' (ترجمہ مشکوٰۃ) ہے، وہ کتاب انھوں نے پڑھنی شروع کی اور ختم کر ڈالی، اور اس کی کئی حدیثیں زبانی یاد کرلیں، ایک کتاب ''میری محسن کتابیں'' بھی ہے، جسے انھوں نے بغور پڑھا، اور اس سے بہت کچھ استفادہ کیا، مولانا شبلی کی ''سیرۃ النبی، الفاروق، النعمان'' نیز دارالمصنفین کی مطبوعات خصوصاً ''سیر الصحابہ'' نے ان کے ذہن ودماغ پر گہرے اثرات ڈالے۔

رسالے اور ماہنامے

رسالوں میں سب سے پہلے ''پھول''، ''غنچہ'' اور پھر ''پیام تعلیم'' ان کی نظر سے گزرا، یہ ان کی بہت کم عمری کا زمانہ تھا، اسی زمانہ میں جالندھر سے ''مسلمہ'' نام کا ایک پاکیزہ ماہنامہ جو مسلم خواتین کے لیے نکلتا تھا، ڈاکٹر صاحب اپنی بچیوں کے لیے منگاتے تھے، اس میں اکثر محترمہ امۃ اللہ تسنیم صاحبہ کے مضامین شائع ہوتے تھے، محمد میاں کی بہنیں بھی اس میں لکھا کرتی تھیں، وہ رسالہ محمد میاں پڑھتے تھے، اور بعد میں خود بھی مضمون لکھا۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کا آرگن ''الندوہ'' قدیم وجدید جو دو مختلف دوروں میں

چند سال نکل کر بند ہو چکا تھا، اس کے فائل ان کے مطالعہ میں رہے۔

۱۹۴۶ء میں مشہور دینی رسالہ ''الفرقان'' جو بریلی سے مولانا محمد منظور نعمانی کی ادارت میں نکلتا تھا، لکھنؤ منتقل ہوگیا، اس کا دفتر گویا اس محلّہ میں لب سڑک کھلا تھا، جہاں محمد میاں کا گھر ہے، اس رسالہ میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے مستقلاً مضامین شائع ہوتے، وہ رسالہ گھر پر آتا، محمد میاں نے اس کا خصوصی طور پر مطالعہ کیا، اور آخر تک مطالعہ کرتے رہے۔

۱۹۴۸ء میں ادارۂ تعلیمات اسلام سے ''تعمیر'' کے نام سے رسالہ نکلنا شروع ہوا، اس میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے بکثرت مضامین شائع ہوتے تھے، وہ سارے مضامین محمد میاں کے مطالعہ میں آئے، ''برہان'' (دہلی) اور ''معارف'' (اعظم گڑھ) پہلے ہی سے مطالعہ میں رکھے، اور آخر زندگی میں ''معرفت حق'' (الٰہ آباد) اور ''الحق'' (اکوڑہ خٹک) اور ''بینات'' (کراچی) کا برابر مطالعہ کرتے رہے۔

۱۹۵۰ء کے بعد کا زمانہ محمد میاں کے علم کا روشن زمانہ تھا، وہ اس وقت تک بہت کچھ پڑھ چکے تھے، اور ہر وہ رسالہ یا کتاب ان کی نظر سے گزر چکی تھی جو اس گھر میں آتی تھی، ان کا مطالعہ وسیع اور ان کی نظر عمیق ہو چکی تھی۔

مختلف علوم کی کتابیں

علماء و مشاہیر کی آمد اور ان کی تصنیفات کی کثرت نے ہر علم و فن کے مطالعہ کا دروازہ کھول دیا، مولانا عبدالماجد دریابادی کی ''تفسیر ماجدی''، ان کی ''انشاء ماجد''، ''حکیم الامت نقوش وتأثرات''، نیز ''صدق جدید'' اور ''سچ'' کی فائلوں نے محمد میاں کی زبان وادب کو نکھارنا شروع کر دیا، وہ فکر و ذوق میں اپنے عم مکرم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے مثنیٰ اور زبان وادب میں مولانا عبدالماجد دریابادی کے شاگرد ٹھہرے۔

محمد میاں کے والد ماجد سے قریبی تعلق رکھنے والے بزرگ مولانا عبدالباری ندوی سابق پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کی وہ تصنیفات جو فلسفہ اور معاشیات پر

تھیں، اور وہ تصنیفات جو حضرت تھانویؒ سے تعلق قائم کرنے کے بعد ان کی تعلیمات پر تھیں، جیسے ''جامع المجدد ین'' وغیرہ ان سب کو بغور پڑھا، خصوصاً ان کی مذہبی کتابوں کو اپنے پاس رکھا۔

شعر و سخن

سخن فہمی اور شعر کا ذوق ان کو آبائی ملا تھا، گھر ہی پر کئی شاعر گزرے تھے، ان کے پردادا مولانا فخر الدین خیالؔی صاحب ''مہر جہاں تاب''، جد امجد مولانا سید عبدالحی صاحب ''گل رعنا''، اور دادی محترمہ سیدہ خیر النساء بہترؔ، پھوپھی امۃ اللہ تسنیم پر مشتمل افراد شاعر بھی تھے اور سخن فہم بھی، محمد میاں نے ''گل رعنا'' جو شعراء کے حالات اور ان کے کلام کے نمونوں پر مشتمل ہے، بار بار پڑھی، اسی طریقہ سے دادی صاحبہ کی ''باب رحمت''، پھوپھی صاحبہ کی ''باب کرم''، مولانا فخر الدین خیالؔی کا دیوان جو قلمی ہے مطالعہ میں رکھا، گھر کے باہر اہل سخن میں اکبرؔ، اقبالؔ، جگرؔ کے دیوانوں اور کلاموں کے بڑے شائق تھے، محمد حسین آزاد کی ''آب حیات'' اور علامہ شبلی کی ''شعر العجم'' پڑھی، آخر میں زائر حرم حمید صدیقی کا دیوان نعت ''گلہائے رنگ'' بھی بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے تھے، اور اس کے اکثر اشعار یاد تھے، اور گنگناتے رہتے تھے، ان کتابوں کے علاوہ شاید ہی کسی شاعر کا دیوان خواہ وہ قدیم ہو یا جدید ان کے مطالعہ سے بچا ہو، ان کو اردو، فارسی اور عربی اشعار یاد تھے، اور دیوانوں کے کثرت مطالعہ اور خداداد صاف ستھرے ذوق اور سخن فہمی سے ان میں یہ ملکہ پیدا ہوگیا تھا کہ وہ بروقت مناسب حال شعر پڑھتے تھے، اور اسی کے نتیجہ میں بے تکلف موزوں مصرعے کہہ دیتے تھے، اور اشعار میں اصلاح بھی کر دیتے تھے، اس کے باوجود وہ شاعر نہ تھے۔

ان ساری کتابوں کے پڑھنے سے ان کے دل و دماغ میں دین اور اہل دین کی عظمت، زبان و ادب کی چاشنی، قلم کی روانی، علم کی وسعت اور گیرائی و گہرائی کے نقوش ثبت ہوگئے۔

اسلوب اور فکر ونظر میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے مثنیٰ

انھوں نے اپنے عم مکرم کی چھوٹی بڑی قدیم و جدید ساری کتابوں اور ان کے سارے مضامین کو جو مختلف رسائل اور ماہناموں میں چھپتے رہے تھے پوری توجہ اور انہماک سے پڑھا، اوران کے اسلوب، طرز تحریر، فکر وذوق اور احساسات وخیالات کو اپنا کر اپنے قلم میں ان کو سمودیا، اوران کو اپنے لیے مثل اعلیٰ بنا کر قلمی جہاد شروع کر دیا، اور یہ جہاد تادم مرگ کرتے رہے، جس کی انتہا اس مضمون پر ہوتی ہے، جو انھوں نے اپنے انتقال سے صرف ایک دن پہلے ''ندائے ملت'' کے لیے لکھا تھا، جس کا عنوان تھا ''سد سکندری کی نہیں بلکہ سد ایمانی کی ضرورت ہے''، جس میں انھوں نے بڑی صاف گوئی سے اور جسارت وقوت کے ساتھ ایمان کی دعوت دی تھی۔

محمد میاں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ۱۹۴۹ء سے ۱۹۷۹ء تک تقریباً تیس سال مسلسل پڑھتے رہے اور لکھتے رہے، یہ ان کی زندگی کا عزیز ترین مشغلہ تھا، اور اسی طرح جہاد بالقلم کرتے کرتے انھوں نے اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی، لیکن اس مسلسل جہاد اور تھکا دینے والی مصروفیت کے باوجود ان کا ہر بُن مو کہتا رہا۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اس میں دو رائے نہیں ہوسکتی کہ زبان وقلم، فکر وذوق، احساسات وخیالات اور قلب ونظر کی کیفیت اور جسم وجان کی یگانگت حتی کہ رسم الخط اور طرز ادا میں بھی ان دونوں چچا اور بھتیجے میں ایسا حسین، ایسا جمیل اور ایسا دل کش امتزاج پیدا ہوگیا تھا کہ دونوں یک جان دو قالب بن کر رہ گئے تھے، اوران دونوں کی زبان حال گویا ہونے لگی تھی۔

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

باب سوم

تکمیل علوم سے وفات تک

تکمیل علوم کے بعد

۱۹۵۲-۵۳ء میں محمد میاں کتابی علوم سے تقریباً فارغ ہو گئے تھے، اور وہ اپنے قلم سے علم و دین کی خدمت کرنے لگے تھے، ڈاکٹر صاحب مطب کرتے تھے، خاندان کے بزرگوں اور دوسرے تعلق رکھنے والوں نے ڈاکٹر صاحب پر زور دیا کہ محمد میاں کو کسی ایسے کام پر لگا دیا جائے جو خدمت علم و دین کے ساتھ ساتھ ان کی روزی کا ذریعہ بھی بن سکے، عام طور پر لوگوں کا ذہن اس طرف چلا کہ طب اور ڈاکٹری ان کے گھر کی چیز ہے اور وہ ان کے لیے آسان بھی ہے، خود ڈاکٹر صاحب کو بھی ان کے مستقبل کی فکر تھی، وہ ندوہ کے ناظم تھے، دارالعلوم ندوۃ العلماء میں بہ آسانی وہ ملازمت کر سکتے تھے، اور اس کے حقدار بھی تھے، مگر ڈاکٹر صاحب اور مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کی غیرت اس کا تقاضہ نہیں کرتی تھی، خاندان کے ایک بزرگ اور ڈاکٹر صاحب کے چچا مولانا سید عزیز الرحمٰن صاحب بھی ڈاکٹر صاحب کو اس طرف توجہ دلاتے رہتے تھے، ایک خط میں ڈاکٹر صاحب اپنے عم مکرم مولانا سید عزیز الرحمٰن صاحب کو لکھتے ہیں:

> محمد سلمہ اگر عربی و دینی علوم حاصل کرنے کے بعد ڈاکٹر ہوتے تو کیا ہی اچھا ہوتا، خالہ جان (والدہ مولانا سید ابوالحسن علی

ندوی) نے بھی مجھ سے یہ بات کہی تھی، اور حضرت (مولانا سید حسین احمد مدنی) مدظلہ نے بھی فرمایا تھا، تقریباً سات برس سے میری بیماری کا سلسلہ نہ ہوتا تو شاید ایسا ہو جاتا، اب اس کا امکان نہیں معلوم ہوتا، والد ماجد سے کئی بار سنا کہ آدمی کو جو کام کرنا ہو وہ عنفوان شباب میں کرنے لگے ورنہ پھر کامیابی نہیں ہوتی، زیادہ عمر ہونے کے بعد میں نے بھی پریکٹس شروع کی تھی، اس لیے ہمیشہ پچھتاتا رہا، میرا خیال ہے کہ کچھ باغات کی آمدنی سے انھیں ملے گا اور دواؤں کی تجارت کریں، اس سے آمدنی ہوگی، اللہ تعالیٰ نے اگر فضل فرمایا تو آرام سے بسر کریں گے، آدمی کو چاہیے کہ رزق کے لیے بہانہ پیدا کرے، اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھے، اور اسی سے مانگتا رہے، محنت اور دیانت اور سلیقہ سے کام کرے، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ناکام نہ کرے گا، امید ہے کہ آپ بھی اس کے لیے دعا فرمائیں گے۔

عبدالعلی

۱۳؍دسمبر ۱۹۵۴ء

ایک اولوالعزمانہ اقدام

۱۹۵۵ء تک محمد میاں کو عربی مضامین لکھنے اور عربی سے اردو اور اردو سے عربی میں ترجمہ کرنے میں وہ کمال حاصل ہوگیا تھا کہ اس عمر میں (جو اس وقت محمد میاں کی تھی یعنی ۲۰؍سال) بہت کم عجمی جوانوں کو حاصل ہوتا ہے، ۱۹۵۵ء کے موسم برسات میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور راقم سطور پاکستان کے سفر پر تھے، اسی زمانہ میں ہم لوگوں اور محمد میاں کے شفیق استاد حضرت مولانا شاہ حلیم عطا سلونی کا انتقال ہوگیا، جو اہل ندوہ کے لیے ایک بڑے حادثہ سے کم نہ تھا، شاہ صاحب کو ڈاکٹر صاحب، مولانا سید ابوالحسن علی

ندوی اور ان کی وساطت سے ہم بھائیوں خصوصاً محمد میاں سے بڑا تعلق تھا، ان کے انتقال سے محمد میاں پر بھی اثر پڑا، اور وہ ان کے جنازہ کے ساتھ سلون (۱) (جو شاہ صاحب کا وطن تھا) بھی گئے تھے، اس واقعہ کے ایک یا دو ماہ بعد محمد میاں نے اپنے چند خصوصی دوستوں اور ساتھیوں کے مشورہ سے ایک عربی رسالہ کا ''البعث الاسلامی'' کے نام سے ڈیکلریشن داخل کر دیا اور اکتوبر ۱۹۵۵ء کو اس کا پہلا شمارہ شائع کیا جو لیتھو پر چھپا، اس وقت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور راقم سطور پاکستان کے سفر پر تھے، اس کا پہلا شمارہ محمد میاں نے لاہور بھیجا، اس کی اشاعت کے لیے ہندوستان کے بعض علاقوں کا دورہ کیا جو کامیاب رہا، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے پہلا پرچہ پا کر اپنے برادر مکرم کو لکھا:

''محمد میاں غالباً اپنے دورے سے واپس آ گئے ہوں گے،
البعث کا پہلا پرچہ مجموعی حیثیت سے خاصا رہا اور توقع سے بہتر،
امید ہے کہ آئندہ نمبر اور بہتر ہوں گے۔'' (۱۷/اکتوبر ۱۹۵۵ء)

شروع شروع میں عربی زبان کی اس خدمت کی راہ میں بڑی مشکلات پیش آئیں، چونکہ یہ رسالہ محمد میاں نے اپنے ذاتی خرچ پر نکالا تھا، اس لیے ہر ماہ مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا، مدوجزر کا یہ سلسلہ کئی سال تک جاری رہا، اور محمد میاں کے پایۂ ثبات کو اور اس کی وجہ سے ان کے قلم کی روانی میں کوئی فرق نہیں آیا، اور وہ پورے عزم و ہمت کے ساتھ یہ خدمت انجام دیتے رہے، اور عزیزی مولوی محمد رابع کے قیمتی مشوروں، محمد میاں کے عزیز ترین دوست مولوی سعید الرحمٰن اور دوسرے ساتھیوں مولوی راشد اور مولوی محمد اجتباء کے تعاون سے ہر ماہ یہ رسالہ نکلتا رہا (۲)،

---

(۱) سلون ضلع رائے بریلی کی تحصیل ہے، ایک معروف فاروقی النسب علمی و دینی خاندان یہاں کئی سو برس سے آباد ہے، جن میں شاہ پیر محمد اور شاہ پناہ عطا خاص طور پر قابل ذکر ہیں، آخر زمانہ میں اس خاندان والاشان کے چشم و چراغ حضرت مولانا شاہ حلیم عطا سلونی ہوئے جو دارالعلوم ندوۃ العلماء کے شیخ الحدیث تھے، ان کے صاحبزادگان میں مولانا شاہ شبیر عطا ندوی صاحب مولانا سید محمد الحسنی مرحوم کے ساتھیوں اور دوستوں میں تھے۔ (م)

(۲) یہ سب حضرات اس وقت دارالعلوم ندوۃ العلماء میں عربی کے اساتذہ تھے، ان میں ڈاکٹر سید محمد اجتباء ندوی (م-۲۰ جون ۲۰۰۸ء) بعد میں الہ آباد یونیورسٹی اور کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کے صدر رہے، (بقیہ اگلے صفحہ پر)

محمد میاں کا گھر اس رسالہ کا دفتر تھا، وہیں مرتب ہوتا، وہیں پوسٹ ہونے جاتا، اس رسالہ کو ہندوستان کے عربی مدارس اور علمی حلقوں میں تو کم، مصروشام اور حجاز ونجد کے علمی حلقوں میں زیادہ باریابی ملی، اہل عرب علماء اور ادباء کے خطوط آنے لگے، اور اس کی مانگ بڑھنے لگی۔

محمد میاں کی ٹھوس علمی خدمت کا یہ پہلا قدم تھا جو کامیاب رہا، اور منزل کی طرف ہردم رواں دواں رہا، اگرچہ اس رسالہ کی اشاعت سے محمد میاں کے معاشی مسئلہ کا حل پیدا نہیں ہوسکا، بلکہ ہرماہ ان کو اس پر خرچ کرنا پڑتا تھا، اور کئی سال تک مالی پریشانی رہی۔

کچھ مدت کے بعد جب اس کی اشاعت بڑھنے لگی اور اس سے ندوہ اور اہل ندوہ کا تعارف ہونے لگا، تو ندوہ کے ارباب حل وعقد کی رائے ہوئی کہ اس رسالہ کو ندوہ کا آرگن اور ترجمان بنالینا چاہیے اور محمد میاں سے کہنا چاہیے کہ وہ ندوہ کو دے دیں، اس رائے کے مطابق محمد میاں نے اپنی ذاتی ملکیت سے نکال کر اس کو ندوہ کے حوالے کردیا، اور بحیثیت مدیر کے آخر عمر تک کام کرتے رہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ''البعث الاسلامی'' کے اجراء کے محرکات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''۱۹۵۲ء میں جب مصر میں انقلاب آیا اور زمام اختیار وقیادت صدر ناصر کے ہاتھ آئی اور قومیت عربیہ کی وہ تیز وتند آندھی اٹھی جو عرب نوجوانوں بلکہ پختہ کار عربوں کی بھی ایک بڑی تعداد کو اُڑا لے گئی، بڑے بڑے تناور درخت اور علم وادب کی کوہ پیکر شخصیتیں اس طوفان میں پتوں کی طرح اڑتی اور اس سیلاب میں تنکوں کی طرح بہتی نظر آتی تھیں، اس وقت یہ ضرورت محسوس

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) ڈاکٹر محمد راشد ندوی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں صدر شعبۂ عربی ہوئے، مولانا سعید الرحمن اعظمی ندوی دارالعلوم ندوۃ العلماء کے شعبۂ عربی کے صدر ہوئے اور اب مہتمم دارالعلوم ہیں اور مدیر البعث الاسلامی، مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی ندوۃ العلماء کے ناظم، عالمی رابطہ ادب اسلامی کے نائب صدر اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر ہیں۔(م)

ہوئی کہ فکر اسلامی اور دعوت اسلامی کی ترجمانی کے لیے عربی کا ایک رسالہ نکالا جائے، اس وقت پورے تحتی براعظم میں عربی کا کوئی رسالہ نہ تھا، ندوۃ العلماء کا آرگن ''الضیاء'' ۱۹۳۵ء ہی میں بند ہو گیا تھا، عربی صحافت کا مزاج ایسا بگڑا تھا کہ جو لوگ اس فتنۂ عالم آشوب سے متاثر نہیں تھے اور قومیت عربیہ اور مصری قیادت پر تنقید کرنا چاہتے تھے، ان کے مضامین کا کسی اخبار و رسالہ میں چھپنا بھی دشوار تھا، اور اگر وہ کہیں چھپتے تو یہ رسائل ان غضبناک نوجوانوں کے عتاب کا نشانہ بن جاتے جو اس فلسفہ پر ایمان لا چکے تھے، اور جن پر قومیت و اشتراکیت کا نشہ چھایا ہوا تھا، ۱۹۵۵ء میں جب یہ تحریک اپنے شباب پر تھی اور سارا مشرق وسطیٰ (الا ماشاء اللہ) اس نشہ سے مست اور اپنے جامہ سے باہر ہو رہا تھا، ہم لوگوں نے عربی رسالہ کے اجراء کا ارادہ کیا، اس سے کچھ پیشتر محمد میاں کا ایک مضمون رسالہ ''المسلمون'' (۱) میں "العالم الاسلامی علی مفترق الطرق" (دنیائے اسلام دوراہے پر) کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔

۱۹۵۵ء میں ''البعث الاسلامی'' کے نام سے یہ رسالہ نکلا، اس کے مدیر، مالک، سب کچھ محمد میاں ہی تھے، بھائی صاحب مرحوم نے اس کی سرپرستی قبول فرمائی، محمد میاں کے دوست اور

(۱) رسالہ ''المسلمون'' اپنے عہد کا معیاری اور صف اول کا عربی رسالہ اور فکر و دعوت اسلامی کا بین الاقوامی ترجمان ہے، جس میں عالم عربی اور دنیائے اسلام کے چیدہ و برگزیدہ اہل قلم و ارباب فکر لکھتے تھے، (رسالہ کے مدیر ڈاکٹر سعید رمضان تھے جو امام حسن البنا شہید (م-۱۹۴۸ء) کے داماد اور اخوان المسلمون کے چوٹی کے قائدین میں تھے، جنیوا میں اسلامی سنٹر قائم کیا تھا، وہیں سے ''المسلمون'' نکالتے تھے، مصنف کے خال مکرم اور صاحب سوانح کے عم معظم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے خصوصی تعلق تھا، انھوں نے اس انٹرنیشنل عربی مجلہ کے اداریے بھی لکھے اور اہم مقالات و مضامین بھی جن میں ان کی دو اہم کتابوں "رجال الفکر والدعوۃ فی الإسلام" اور "الأرکان الأربعة" کے مضامین خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ (م)

دارالعلوم کے لائق استاد مولوی سعید الرحمٰن ندوی ان کے معاون خاص تھے۔''(۱)

مشائخ عصر کی خدمت میں

''البعث الاسلامی'' کی پہلی اشاعت کے بعد محمد میاں اور مولوی سعید الرحمٰن صاحب نے پرچہ کی اشاعت کی خاطر علمی حلقوں، اداروں اور مدرسوں کا سفر کیا (۲)، اور اہم شخصیتوں سے ملاقاتیں کیں، یہ دورہ محمد میاں کا پہلا طویل دورہ تھا، اس دورہ میں علماء اور مشائخ سے بھی ملاقاتیں ہوئیں، اس وقت مشائخ میں دیوبند میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی، دہلی میں مولانا محمد یوسف کاندھلوی، سہارنپور میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی، رائے پور میں حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری کی مبارک شخصیات موجود تھیں، یہ دورہ نہ صرف البعث الاسلامی کے لیے مفید ہوا بلکہ ذاتی طور پر محمد میاں نے بھی بڑا علمی، دینی وروحانی فائدہ اٹھایا، اور وہ نیا عزم و حوصلہ اور نئی زندگی لے کر واپس ہوئے، مشائخ کی دعائیں اور مبارک صحبتیں اور اہل قلم کی پر بہار مجلسیں نصیب ہوئیں، ان مدارس میں مروجہ طریقۂ تعلیم وتربیت کا مطالعہ کیا، بعض اہم اور بڑے اساتذہ کے درسوں میں شریک ہوئے، اور مختلف خیالات اور ذہن رکھنے والے اہل علم سے ملاقاتیں کیں، اور تبادلۂ خیالات کیا، اور کامیاب واپس ہوئے۔

شادی

محمد میاں کے خالو مولانا سید عزیز الرحمٰن حسنی ایک خوش اوقات اور صاحب قلب ونظر بزرگ تھے، جو نہایت عقیل وفہیم، تجربہ کار اور جہاں دیدہ شخصیت کے مالک تھے، وہ خاندان کے افراد کے متفق علیہ استاد اور بہتوں کے مربی تھے، مولانا سید ابوبکر حسنی

---

(۱) تعمیر حیات خصوصی نمبر/۱۶۴

(۲) یہ سفر دہلی اور اس کے اطراف کے شہروں اور اضلاع کا تھا جن میں خصوصیت سے دہلی، دیوبند، سہارنپور، علی گڑھ، میرٹھ اور رامپور قابل ذکر ہیں۔

کے والد ماجد اور مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی نیز ڈاکٹر صاحب کے چچا ہوتے تھے، انھوں نے اپنی بڑی نواسی زکیہ بی (جو ڈاکٹر سید حسن مثنی حسنی کی صاحبزادی اور حافظ سید محمد معین حسنی عرف عبداللہ میاں کی پوتی ہیں) کو بڑی توجہ سے تعلیم دی، لکھنا پڑھنا سکھایا، مسئلے مسائل پڑھائے، اور بہت اچھی تربیت کی، ۱۹۵۲ء میں جبکہ محمد میاں کی عمر ۱۷ ر سال کی تھی ڈاکٹر صاحب نے مولانا عزیز الرحمٰن صاحب کو لکھا:

''ہم لوگوں کی خواہش ہے کہ محمد سلمہ کا عقد زکیہ سلمہا سے ہو، اللہ تعالیٰ کا فضل شامل حال رہے، اور موانع نہ پیدا ہوں، آپ بھی دعا فرمائیں۔''

عبدالعلی

۲۹ ر مارچ ۱۹۵۲ء

اس وقت خاندان کے کئی بزرگ بقید حیات تھے، اگلے سال زکیہ سلمہا کے دادا سید محمد معین عرف عبداللہ میاں کا انتقال ہوگیا(۱)، اور ۱۹۵۴ء میں خاندان کے ایک دوسرے بزرگ سید احمد سعید میاں (ماموں وخسر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی) کا انتقال ہوگیا، ۱۹۵۴ء میں ہی محمد میاں کی ہمشیرہ کی شادی عزیزی مولوی محمد واضح حسنی کے ساتھ ہوئی، اور اس کے ایک سال بعد ۱۵ ر ربیع الاول ۱۳۷۴ھ مطابق یکم نومبر ۱۹۵۵ء بروز منگل بعد عصر دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی کی مسجد میں محمد میاں کا عقد ہوا، اس مبارک عقد میں لکھنؤ کے کافی مہمان شریک ہوئے، علماء بھی اور اہل محلّہ بھی، اس

---

(۱) دادی صاحبہ بتول بی بی کا پہلے ہی انتقال ہوچکا تھا، وہ عارف باللہ حضرت مولانا شاہ ضیاء النبی حسنیؒ (م-۱۹۰۶ء) کی نواسی اور آنریری مجسٹریٹ مولوی سید خلیل الدین حسنیؒ کی صاحبزادی اور مصنف علیہ الرحمہ کی پھوپھی تھیں اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی حقیقی خالہ زاد بہن، البتہ عمر میں والدہ کے برابر بلکہ ایک سال بڑی تھیں، خاندان کی ان ممتاز خواتین میں تھیں جو یگانۂ روزگار رہی ہیں، بڑی ذی علم وفہم اور باعمل خاتون تھیں ان کے صاحبزادگان میں تین صاحبزادے بڑے ہوئے اور صاحب اولاد ہوئے: ۱-سید حسن مجتبیٰ حسنیؒ جو کہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے ہم زلف تھے، ۲-ڈاکٹر سید حسن مثنیٰ حسنیؒ جو مولانا عزیز الرحمٰن حسنی کے داماد ہوئے جو مولانا سید عبدالعلی حسنیؒ کے ہم زلف تھے، ۳-سید محمد مسلم حسنیؒ جو مولانا ڈاکٹر عبدالعلی حسنیؒ کے داماد اور مصنف کے ہم زلف اور صاحب تذکرہ کے بہنوئی تھے۔ (م)

میں محمد میاں کے استاد مولوی عبداللہ صاحب بھی تھے، محمد میاں شاندار عمامہ باندھے ہوئے بہت خوبصورت لگ رہے تھے، بعض لوگوں کے اصرار سے اس وقت (عصر) کی نماز بھی محمد میاں نے پڑھائی، نماز عصر کے بعد نکاح ہوا، مہر، مہر فاطمی کے حساب سے رکھا گیا، نکاح غالباً مولانا سید عزیز الرحمٰن صاحب نے پڑھایا اور دوسرے دن رخصتی ہوگئی، شادی کے وقت محمد میاں کی عمر ۲۰/سال کی تھی۔

ماہنامہ ''رضوان'' اور محمد میاں کا کردار

''البعث الاسلامی'' کو نکلے ہوئے صرف ایک سال ہوا تھا کہ ایک دن محمد میاں نے راقم سطور سے عرض کیا:

> ''منجھلے بھیا! آپ ہمت کر کے اردو میں ایک ماہانہ رسالہ نکالیے، چچا میاں (مولانا سید ابوالحسن علی ندوی) بھی ایک تبلیغی سفر پر ہیں، موقع اچھا ہے، جب رسالہ نکل آئے گا تو اس کو چچا میاں بند نہ کریں گے۔''

ان الفاظ کے ساتھ انھوں نے اتنی ہمت بڑھائی کہ صبح وشام اس کو اپنا وظیفہ بنالیا اور خود ہی اس کا نقشہ بنایا، چائے کے بہانے چائے خانہ لے جاتے، اور خفیہ طور پر اس کا نام تجویز کیا، ٹائٹل بنایا، مضامین کا انتخاب کیا، مجھ سے اداریہ لکھوایا، خود ایک مضمون لکھا، اور چند ہی روز میں ڈیکلریشن ہمارے نام داخل کیا، خود پوری دلچسپی لی، اور دیکھتے دیکھتے نومبر ۱۹۵۶ء کو اس کا پہلا شمارہ منظر عام پر آ گیا، اور اس پوری مدت میں قریب سے قریب تر آدمیوں کو پتہ نہ چل سکا، رسالہ نکلتے ہی ۶/کاپیاں خال مکرم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو بذریعہ ڈاک بھجوادیں، پھر اس کی پوسٹنگ، پتوں کی فراہمی اور ملنے والوں کو خریدار بنانے کی خود بھی کوشش کی، اور پھر مسلسل آخر تک اس کی بقا و ترقی کے لیے کوشش کرتے رہے، اور اہم سے اہم مشورے دیتے رہے، جب اس کا کوئی نمبر نکلتا، وہ پوری دلچسپی لیتے اور اس کو متنوع بنانے میں اپنا بڑا وقت لگاتے،

جب کبھی میری ہمت شکستہ ہوتی تو وہ بڑے ادب و محبت کے ساتھ (جس کا مظاہرہ انھوں نے میرے ساتھ ہمیشہ کیا) یہ شعر پڑھتے:

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں یہ مردوں کی ہیں شمشیریں

بچہ کی ولادت

شادی کے تقریباً ایک سال دو ماہ بعد ۲۹/جنوری ۱۹۵۷ء (۲۷/رجب المرجب ۱۳۷۶ء) کو ۲/بجے دن کے وقت لکھنؤ میں محمد میاں کا پہلا بچہ پیدا ہوا، پوتے کی ولادت سے دادا ڈاکٹر عبدالعلی صاحب اور دادی صاحبہ بہت خوش ہوئیں، اعزہ اور احباب نے خیر و برکت کی دعائیں کیں اور خطوط لکھے، حسب قاعدہ ایک ہفتہ کے بعد عقیقہ ہوا، عبداللہ نام رکھا گیا، یہی ایک بچہ تھا جس کو دادا دادی نے دیکھا، آغوش محبت میں پالا، لیکن جب اس بچہ کی عمر سات ماہ کی ہوئی تو مشفق دادی اور جب ساڑھے چار سال کی ہوئی تو شفیق دادا کا انتقال ہوگیا۔

عبداللہ اپنے بچپن ہی سے ذہین، سمجھ دار تھے، ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی، پھر دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوگئے، اور خدا کے فضل و کرم سے دارالعلوم سے فارغ ہوکر اب استاد ہیں، اللہ تعالیٰ اس سعید بچہ کو اپنے باپ دادا کے نقش قدم پر چلائے اور اپنے والد کے انتقال کے حادثہ پر صبر جمیل کی توفیق دے، دوسرے بیٹے عمار سلمہ ہیں جو دادا کے انتقال کے دو سال بعد ۲/اکتوبر ۱۹۶۳ء کو پیدا ہوئے، عبدالعلی نام رکھا گیا اور عمار کے نام سے مشہور ہوئے، الحمدللہ قرآن مجید حفظ کرلیا ہے، محمد میاں کی ایک بچی بھی پیدا ہوئی مگر چند ہی دن میں فوت ہوگئی، تیسرے اور سب سے چھوٹے بیٹے بلال عبدالحی سلمہ ہیں، ۳/اکتوبر ۱۹۶۹ء کو پیدا ہوئے (۱)، مکتب کی تعلیم ماشاءاللہ پوری کر کے الحمدللہ ثانوی عربی درجات میں داخل ہوچکے ہیں اور دارالعلوم

(۱) ان کی اسلامی تاریخ پیدائش ۲۰/رجب المرجب ۱۳۸۹ھ بروز جمعہ ہے۔ (م)

ندوۃ العلماء میں زیر تعلیم ہیں، اللہ تعالیٰ ان سب کو عالم باعمل بنائے اور اپنے خاندان کی علمی و دینی میراث کا بھی حامل بنائے، آمین۔

ایک سخت مرض کا حملہ

۸ ریا ۹ ر ستمبر ۱۹۵۷ء کی بات ہے کہ سر شام محمد میاں کو ہچکیوں کا مرض لاحق ہوا، اسی دن ان کی ہمشیرہ، اہلیہ عزیزی محمد واضح سلمہ اور ان کی پھوپھی والدۂ محمد واضح سلمہ دہلی جارہی تھیں، مغرب تک اس مرض نے شدت اختیار کرلی، کسی دوا سے کوئی فائدہ نہیں ہوا، گاڑی کا وقت قریب آتا جارہا تھا، والدۂ محمد میاں نے جانے کی اجازت دے دی، مگر ڈاکٹر صاحب نے ایسی حالت میں کہ بھائی شدید کرب میں مبتلا ہے، بہن کو جانے کی اجازت نہیں دی، اور دہلی کے مسافر نہ جاسکے، سب لوگ نہایت پریشان محمد میاں کے قریب کھڑے اور بیٹھے تھے اور دوائیں برابر دی جارہی تھیں، ڈاکٹر صاحب کی آنکھوں میں آنسو تھے اور بے چینی کے ساتھ پہلو بدل رہے تھے، ان کا محبوب بیٹا کتنی تکلیف میں تھا، ہچکیوں کے تسلسل اور شدت نے مریض کو نیم جان کردیا تھا، اور بعض لوگ مایوسی کا شکار ہو رہے تھے، پورے گھر پر افسردگی کی فضا چھائی ہوئی تھی، اور اہل تعلق دعاؤں میں لگے ہوئے تھے، خدا نے ماں باپ کی بے چینی اور تڑپ کا خیال فرمایا اور صبح ہوتے صحت یاب فرمادیا، لیکن کسی کو کیا خبر کہ اس مرض کے پیچھے اور کیا بات پوشیدہ ہے، یہ خدا کی بے نیازی ہے کہ وہ کبھی کبھی دکھاتا ہے: ﴿كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ﴾ ادھر دہلی کے مسافر رکے، ادھر محمد میاں کو صحت ہوئی، بالفاظ دیگر دوسری زندگی ملی۔

عظیم خاندانی حادثہ

ادھر دو ہی تین گزرے ہوں گے یعنی ۱۲ ر ستمبر ۱۹۵۷ء بعد عصر والدۂ محمد میاں کو ذرا سا چکر آیا، دوا دی گئی، عشاء تک چکر ختم ہوگیا، صرف کمزوری باقی رہی، سب لوگ مطمئن اور خوش ہو کر اپنے اپنے بستروں پر لیٹ گئے، صبح کو ۴ بجے والدۂ محمد میاں خود اٹھیں، پیشاب کرنے گئیں، واپس آئیں، اچانک چکر آیا اور بے ہوش ہو کر گر گئیں،

ڈاکٹر صاحب جو قریب ہی تھے فوراً لپکے، نبض دیکھی تو غائب پائی، حاذق اور تجربہ کار ڈاکٹر تھے، سمجھ گئے کہ کیا ہوا، خاموشی سے اپنے پلنگ پر بیٹھ گئے، گھر کے سارے افراد پہنچ گئے، لوگوں نے کوشش کی کہ ڈاکٹر فریدی (۱) کو فوراً بلایا جائے، (ڈاکٹر صاحب کی پھوپھی صاحبہ والدۂ سید محمد یامین حسنی مرحوم موجود تھیں انھوں نے ڈاکٹر صاحب کے بڑے داماد سید محمد مسلم حسنی سے ڈاکٹر کو بلانے کو کہا) ڈاکٹر صاحب نے فرمایا، اب کچھ نہیں ہے، فإنا لله وإنا إليه راجعون.

اس وقت مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی حسب معمول سفر پر تھے، وہ گھر جو دو تین روز پہلے ایک بڑے حادثہ کا شکار ہوتے ہوتے بچا تھا، اب دوسرے حادثہ کا شکار ہو گیا، یہ حادثہ محمد میاں کے لیے ایک عظیم حادثہ تھا، ان کی عمر اس وقت ۲۲ ر سال کی تھی، وہ اپنی والدہ کے بڑے عزیز اور لاڈلے بیٹے تھے، اور وہ اپنی والدہ کو انتہائی طور پر چاہتے تھے، ہر وقت ان کی نگاہوں کے سامنے رہتے تھے۔ والدہ کی تدفین کا مسئلہ پیش آیا، انتقال لکھنؤ میں ہوا تھا، انتظام عیش باغ لکھنؤ کے قبرستان میں ہو رہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے راقم سطور سے فرمایا کہ تدفین کے متعلق محمد سے پوچھو، میں نے محمد میاں سے پوچھنا چاہا اور منھ سے لفظ نکالنا چاہا تو ہچکیوں کے ساتھ رونے لگے اور آنسوؤں سے ان کا چہرہ تر ہو گیا اور بڑی مشکل سے ان کے منھ سے یہ لفظ نکلا ''تکیہ''، اور پھر منھ پھیر کر رونے لگے، معلوم ہوتا تھا کہ وہ قابو میں نہیں ہیں، والدہ کی اچانک موت نے (جس کا تصور دو گھنٹے قبل تک کیا نہیں جا سکتا تھا) وہ واقعہ بن کر سامنے آ گیا فوراً آدمی دوڑا گیا اور عیش باغ کا انتظام روکا گیا، اور ایک آدمی تکیہ کلاں جو ہم لوگوں کا وطن ہے، دوڑایا گیا، وہاں پر اس وقت محمد میاں کی دو بہنیں یعنی راقم سطور کی اہلیہ اور عزیزی محمد رابع سلمہ کی اہلیہ تھیں، ان تک اس حادثہ کی اطلاع پہنچانا نہایت مشکل کام تھا، اس لیے اس کام کی ذمہ داری محمد میاں کے دوسرے

---

(۱) نام عبدالجلیل فریدی تھا، لکھنؤ کے حاذق طبیبوں میں شمار ہوتا تھا، سیاسی بصیرت بھی رکھتے تھے، ملی مفاد کے لیے مسلم مجلس قائم کی، اور بے لوث سیاسی خدمات ملت کے لیے پیش کیں، ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی اور ان کے بھائی مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی سے بڑا محبانہ وعقیدت مندانہ تعلق رکھتے تھے۔ (م)

بہنوئی مولانا سید محمد طاہر صاحب کے سپرد کی گئی اور دس بجے دن کو نعش تکیہ کلاں لائی گئی، اور تدفین بعد مغرب عمل میں آئی ان سارے کاموں کے بعد جب فراغت ہوئی تو ڈاکٹر صاحب، ان کے صاحبزادہ محمد میاں، ان کی پانچوں بہنیں خدا ان سب کو زندہ وسلامت رکھے ازحد شکستہ دل اور افسردہ خاطر تھیں، پورا خاندان اس اچانک حادثہ سے اتنا زیادہ متاثر تھے کہ بیان نہیں کیا جاسکتا، وہ خاتون ہی ایسی تھیں جن کی دینداری، تقویٰ، سادگی، متانت اور بے آزاری پر سب متفق تھے۔

دیوبند کا سفر اور حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کی خدمت میں

والدہ صاحبہ کے انتقال کے بعد محمد میاں کا پورا گھر افسردہ ہوگیا، والد، بہنیں اور خود کافی متأثر تھے، ان ہی دنوں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی سخت علیل ہوگئے، ڈاکٹر عبدالعلی صاحب اس خیال سے کہ حضرت مولانا کی عیادت بھی ہوجائے گی اور دل بھی بہلے گا، انتقال کے تقریباً ایک ماہ بعد اپنے بھائی مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی اور اپنے بیٹے محمد میاں کو ساتھ لے کر دیوبند گئے، حضرت مولانا اس قافلہ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے، کئی دن تک قیام کیا، حضرت مولانا کی خدمت میں رہنے اور حضرت مولانا کی تسلی آمیز گفتگو سے شکستہ دلوں پر بہت اچھا اثر ہوا، اسی اثناء میں حضرت مولانا نے محمد میاں کے متعلق پوچھا کہ یہ کیا کرتے ہیں، اس وقت محمد میاں تعلیم سے فارغ ہوچکے تھے اور ''البعث الاسلامی'' جیسے مؤقر رسالہ کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے تھے، مولانا کی گفتگو، اس کا جواب، اور مولانا کا ارشاد مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کی زبان سے سنیے، جو اس سفر میں رفیق تھے:

> ''مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی آخری علالت میں بھائی صاحب (ڈاکٹر عبدالعلی صاحب) مولانا کی عیادت کے لیے دیوبند گئے، ان کا یہ سفر دیوبند کی فراغت کے بعد پہلا سفر تھا، جو اتنے سال کے بعد پیش آیا تھا، میں اور عزیزی محمد میاں ہم رکاب تھے،

مولانا رحمۃ اللہ علیہ بھائی صاحب کے آنے سے بہت خوش ہوئے، ایک دن مجلس میں محمد میاں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ یہ کیا کرتے ہیں؟

میں نے عرض کیا: عربی کا رسالہ ''البعث الاسلامی'' نکالتے ہیں۔

فرمایا: ان کو آپ نے ندوہ میں تدریس میں نہیں لیا؟

میں نے عرض کیا: کہ میرے ایک بھانجے (عزیزی محمد رابع سلمہ) پہلے سے مدرس ہیں، لوگ کہیں گے: اپنے مدرسہ میں اپنے بھانجوں بھتیجوں کو بھر دیا ہے۔

فرمایا: کہ آپ لوگوں کے کہنے سننے کا کہاں تک خیال کریں گے، لوگوں نے نہ اللہ کو چھوڑا، نہ رسول کو چھوڑا، آپ نے سنا نہیں؟

قيل إن الإله ذو ولد
قيل إن الرسول قد كهنا
ما نجا الله والرسول معاً
من لسان الورىٰ فكيف أنا

پھر فرمایا: ان کو جو ندوہ کے ساتھ دل سوزی اور خلوص ہوگا، وہ ہر ایک کو کہاں ہوگا۔ اس بات پر گفتگو ختم ہوئی، لیکن اس کے بعد محمد میاں کو بھائی صاحب مرحوم نے جو ناظم تھے یا میں نے سلک اساتذہ میں شامل نہیں کیا، وہ ''البعث الاسلامی'' کا آزادانہ کام کرتے رہے۔''

محمد میاں اپنے والد اور چچا کے ہمراہ کچھ دن دیوبند میں رہے، واپسی میں ایک شب کے لیے رائے پور گئے، آمد و رفت میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا

کاندھلوی مدظلہ (۱) کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے اور ان کی قیامگاہ پر تھوڑا وقت گزارنے کا موقع ملا، اس سفر سے محمد میاں کے دل میں بزرگوں کی عظمت اور اہل اللہ سے تعلق و محبت کا اضافہ ہوا۔

عام الحزن

اگست ۱۹۵۷ء تا جولائی ۱۹۵۸ء (محرم تا ذی الحجہ ۱۳۷۷ھ) ۱۲/ماہ کا عرصہ محمد میاں اور ان کے والد اور بہنوں کے لیے سخت آزمائش کا گزرا، اگست ۱۹۵۷ء میں محبوب اور مشفق والدہ کا انتقال ہوا، ابھی یہ غم تازہ ہی تھا کہ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کا ۵/دسمبر ۱۹۵۷ء (۱۳۷۷ھ) کو وصال ہوا، جو ان کے گھر کی زینت اور خیر و برکت کا باعث تھے، پھر فروری ۱۹۵۸ء میں ان کے ماموں سید احمد صاحب ہنسوی ندوی کا انتقال ہوا، اور چند ہی ماہ بعد تابڑ توڑ، خالہ زاد بہن، خالو مولانا سید عزیز الرحمٰن صاحب، اور خالہ والدۂ مولانا سید ابوبکر صاحب حسنی ایم اے۔ ان سبھوں کو محمد میاں سے بہت زیادہ تعلق تھا، اپنے بیٹے کی طرح ان سے محبت کرتے تھے، اور اکثر لکھنؤ آتے اور محبت و شفقت کا انتہائی معاملہ کرتے، فطری طور پر محمد میاں کو اپنے ان اکابر اور چاہنے والے قریبی ننہیالی اعزہ کے انتقال سے رنج و غم ہوا۔

تبلیغی کام سے دلچسپی اور علمی مشغولیتیں

ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب کو تبلیغی تحریک سے بہت دلچسپی تھی، وہ چاہتے تھے کہ محمد میاں کو بھی دلچسپی رہے، چنانچہ محمد میاں بھی جماعت میں نکلے، حالانکہ ان کو سفروں سے مناسبت کبھی نہیں رہی تھی مگر پھر بھی انھوں نے اس کے لیے وقت نکالا، وہ تقریر

---

(۱) حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کا انتقال مصنف کے انتقال (۲۱/ربیع الآخر ۱۴۰۲ھ / ۱۶/فروری ۱۹۸۲ء) کے بعد یکم شعبان المعظم ۱۴۰۲ھ کو مدینہ منورہ میں بعد عصر ہوا، اور وہیں جنت البقیع میں بعد عشاء مدفون ہوئے، رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ۔ اپنے عہد کے مرجع خلائق بزرگ اور مرشد و مربی اور شیخ المشائخ تھے، علم حدیث کی نسبت سے زیادہ شہرت ملی اور شیخ الحدیث ان کے نام کا جز بن گیا، مصنف علیہ الرحمہ ان کے تلمیذ و مسترشد اور خلیفہ تھے۔ (م)

بالکل نہیں کرتے تھے مگر انھوں نے اس سلسلہ میں اپنے ایک سفر میں تقریر بھی کی، ڈاکٹر صاحب کو جب اس کی تفصیلات معلوم ہوئیں تو وہ خوشی سے کھل اٹھے۔

یہی وہ زمانہ تھا کہ محمد میاں نے عربی سے اردو اور اردو سے عربی ترجمے شروع کیے، اس میں خصوصیت سے محمد اسد صاحب (سابق لیوپولڈ ویس) کی کتاب ''روڈ ٹو مکہ'' (Road to Makka) کے عربی ترجمہ "الطريق إلى مكة" کے چند ابواب کا ترجمہ قابل ذکر ہے، جو ڈاکٹر صاحب کے حکم سے محمد میاں نے کیا اور اس کا نام ''طوفان سے ساحل تک'' رکھا، وہ ترجمہ اتنا کامیاب اور بے مثال کیا کہ پڑھنے والے ترجمہ نہیں سمجھتے تھے، اس کو اصل سمجھتے تھے، اس کے پڑھنے میں قاری کو بڑا لطف آتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ یہ سرگزشت کسی اور کی نہیں اپنی ہے، اور اس سفر کا راہی کوئی اور نہیں خود پڑھنے والا ہے، وہ ترجمہ بڑا مقبول ہوا، اس کے کئی ایڈیشن نکلے، اور آج بھی اس میں وہی تازگی اور اس کے الفاظ میں وہی شکوہ اور زندگی ہے، جو لکھنے والے میں لکھتے وقت تھا، اس ترجمہ کی ابتدا ۱۹۵۷ء سے ہوئی اور اس کی تکمیل اور اشاعت ۱۹۶۰ء میں ہوئی، اس کی وجہ یہ ہوئی کہ دسمبر ۱۹۵۶ء میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے مدھیہ پردیش کا تبلیغی دورہ کیا، وہاں سے محمد اسد صاحب کی کتاب کا عربی میں ترجمہ اپنے بھائی کو بھیجا اور یہ رقعہ بھی لکھا کہ:

> "الطريق الى مكة" آپ کی خدمت میں بھیجی تھی، کتاب نہایت دلچسپ اور پر از معلومات ہے، ابن سعود مرحوم کے متعلق بڑی جچی تلی رائے دی ہے، اس کا اگر انتخاب کر دیا جائے تو ہندی میں اس کی اشاعت بڑی مفید ہوگی، دوسرا پرچہ جس میں اس کا ایک انتخاب ہے محمد میاں سلمہ کو عنایت فرما دیجیے گا، ان کے رسالہ کے لیے ہے۔
>
> ابوالحسن علی
>
> ۱۲/دسمبر ۱۹۵۶ء

تکمیل واشاعت نومبر ۱۹۶۰ء میں ہوئی، اس وقت مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی برما کے سفر پر تھے، اور اس کتاب کے مشتاق تھے، وہ لکھتے ہیں:

''محمد میاں سلمہ کو بعد سلام و دعا کے معلوم ہو کہ ''طوفان سے ساحل تک'' کتاب چھپ چکی ہوگی، کم سے کم دو نسخے ہوائی ڈاک سے بھیج دیں۔'' (۱۹/دسمبر ۱۹۶۰ء)

یہ ترجمہ بڑا ہی مقبول ہوا، ادھر محمد میاں نے اپنے عم مکرم کی ایک تقریر ''صورت و حقیقت'' کا "بين الصورة والحقيقة" کے نام سے بڑا کامیاب و جاندار ترجمہ کیا تھا، وہ بھی اصل کی طرح ہو گیا تھا، اب محمد میاں کا قلم رواں دواں ہونے لگا، دوسری طرف ''البعث الاسلامی'' کے مضامین تہلکہ مچائے ہوئے تھے، اور ''الرائد'' بھی ندوۃ العلماء سے نکل آیا، جس کے ذمہ دار بھی ان کے ہی ایک بھائی عزیزی مولوی محمد رابع ندوی تھے، اس میں بھی محمد میاں لکھتے، یہ سب چیزیں ڈاکٹر صاحب کے مشاہدے میں آتیں جس سے وہ بڑے مسرور ہوتے، اور اللہ کا شکر ادا کرتے، وہ اپنی نجی مجلسوں میں، ہم جیسے چھوٹوں سے خدا کی اس نعمت موہوبہ پر خوشی کا اظہار کرتے اور اپنے رب کے شکر گزار ہوتے، اس کے علاوہ محمد میاں نے عربی زبان میں ایک بلیٹن نکالا، جو بڑا مفید ثابت ہوا، مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی برما (رنگون) سے لکھتے ہیں:

''یہاں کا قیام مفید ثابت ہو رہا ہے، لوگوں کا بہت رجوع ہے، اور مختلف حلقوں کے لوگ مانوس و متوجہ ہو رہے ہیں، کل یہاں کے مسلمان منسٹر عبدالرشید صاحب اور فلپائن کے مسلم لیڈر سینیٹر والنٹو مکان پر ملنے آئے، دارالعلوم کا تعارف ہوا، اور ان کو کچھ چیزیں پڑھنے کے لیے دی گئیں، محمد میاں سلمہ کا تازہ عربی انگریزی بلیٹن پیش کیا، ایسے مواقع پر وہ بہت موزوں ہوتا ہے۔''

(۲۳/دسمبر ۱۹۶۰ء)

ایک مجلس کا انعقاد اور تنظیمی کام کا آغاز

اسی زمانہ میں محمد میاں اور ان کے چند دوستوں اور کرم فرماؤں نے جن میں سرفہرست ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کا نام آتا ہے، ایک مجلس کا انعقاد کیا، اور ''رابطہ عالم اسلامی'' کی تشکیل دی، اس کا دفتر اپنے مکان کے متصل مکان کی اوپری منزل میں رکھا، اس کے ذریعہ عرب ممالک نیز دوسرے ممالک کی نمایاں مسلمان شخصیتوں اور تحریکوں سے رابطہ کیا، خط و کتابت کی، اردو عربی و انگریزی میں خبرنامہ جاری کیا، اور ایک مدت تک بڑا منظّم اور مؤثر کام کیا، اور اپنے والد ماجد کے دیرینہ خواب کو شرمندۂ تعبیر بنایا، عراق کے ایک اخوانی کارکن مہدی سامرائی سے دوستی کی، وہ خود آئے، اور چند روز قیام کیا، رابطہ کا دستور بنایا گیا، لیکن افسوس ہے کہ بہت دنوں تک یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا، اور بعض سیاسی مجبوریوں کی بنا پر یہ مفید کام رک گیا۔

چند دن مطب میں

گزشتہ صفحات سے آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ ڈاکٹر صاحب پر ہر طرف سے اس کا زور پڑتا تھا کہ وہ محمد میاں کو ڈاکٹری پڑھائیں، اور اپنے مطب میں بٹھائیں تاکہ ان کے معاش کا مسئلہ بھی حل ہو، اور یہ پرانا مطب آباد رہے، اس کی تفصیل ڈاکٹر صاحب کے ایک خط سے جو نقل کیا جا چکا ہے معلوم ہو چکی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کو محمد میاں کی علمی و دینی ترقی کی بڑی فکر تھی، اور وہ معاش سے زیادہ ان کی علمی اور دینی ترقی سے خوش ہوتے تھے، اور معاش کے لیے بھی اپنے وطن اور دوسرے شہروں میں باغات لگوائے تھے، اور انھیں کی آمدنی کو محمد میاں کے لیے کافی سمجھتے تھے، ان کی یہ فکر ان ہی کے ایک مکتوب سے ظاہر ہوتی ہے جو انھوں نے اپنے شیخ و مرشد حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کو اس وقت لکھا تھا جب محمد میاں کی عمر صرف پانچ سال تھی، وہ مکتوب یہاں درج کیا جاتا ہے، ملاحظہ کیجیے!

''علی بدستور تبلیغ دین کا کام کر رہے ہیں، اس کام سے بہتر دنیا

میں کوئی کام نہیں ہے، اس لیے کہ انبیاء اسی کام کے لیے مبعوث کیے گئے تھے، میری تمنا تھی کہ ہم دونوں ساتھ ساتھ کام کرتے، مگر معاش کی مجبوریاں مانع ہیں، تعلیم کا کام بھی انھیں کرنا پڑتا ہے، اس وجہ سے انھیں بہت محنت کرنی پڑتی ہے، اللہ تعالیٰ ان کی مدد فرمائے، اور ان کی صحت اور قوت میں برکت عطا فرمائے، اور اپنے دین کی خدمت عرصۂ دراز تک لیتا رہے۔

زراعت و باغبانی کا جو کچھ کام میں کر رہا ہوں اس کی غرض یہ تھی کہ ہم دونوں مل کر اعلائے کلمۃ اللہ میں اپنا وقت صرف کر سکیں، اور نہ انھیں ملازمت کی حاجت رہے نہ مجھے مطب کی پابندی رہے، تعلیم دین بھی ثواب کا کام ہے۔

مگر ملازمت کی پابندی سے مقصد میں خلل ہوتا ہے، ملازمت نہ ہوتی تب بھی وہ ان شاء اللہ قرآن وحدیث کی تعلیم دیتے، اور تبلیغ کا کام بھی کرتے، اور میں بھی کرتا، دعا فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ ہم دونوں کو اپنی رضامندی کی راہ پر چلاتا رہے، اور اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر قائم رکھے، اور اپنے دین کی خدمت لے، اور ہمارے ذریعے گمراہوں کو سیدھی راہ دکھائے، اور اس طرح رزق عطا فرمائے کہ سوا اللہ کے کسی کی حاجت نہ رہے، جس طرح بھی علی سلمہ کام کر رہے ہیں (۱) اس سے میرا دل بالکل مطمئن ہے، عرصہ سے جس بات کی تمنا تھی وہ حاصل ہو رہی ہے، دل کو قرار ہو گیا اور آنکھیں ٹھنڈی ہو گئیں، مگر شوق اس کا طالب ہے کہ اور ترقی ہو اور جس طرح سید صاحب

---

(۱) یہ اس زمانہ کی بات ہے جب حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی ایک طرف تو ندوۃ العلماء کے دارالعلوم میں تعلیم کے کام میں مصروف تھے اور دوسری طرف حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی کی رہنمائی میں دعوت وتبلیغ کے کام میں مشغول تھے۔ (م)

(حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ) سے اسلام کو ترقی ہوئی
ویسے ہی علی سلمہ کی کوششوں سے ترقی ہو اور مجھے بھی کام میں
شرکت کا موقع ملے۔

دعا فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ یہ تمنا پوری فرمائے اور ہم لوگوں
کی صحت وقوت میں ایسی برکت عطا فرمائے کہ یہ کام پورا ہو۔''

عبدالعلی

(۲۰ /مارچ ۱۹۴۰ء)

جس طرح ڈاکٹر صاحب کو اپنے بھائی مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کی تعلیمی وتبلیغی مساعی سے خوشی ہو رہی تھی جس کا انھوں نے حضرت مولانا حسین احمد مدنی کی خدمت میں اظہار کیا، ویسے ہی انھیں اپنے بیٹے محمد میاں کے علمی دینی اور دعوتی کاموں کو دیکھ کر مسرت ہو رہی تھی جس کا وہ اظہار بھی فرمادیتے اور اللہ کا شکر ادا کرتے، مگر ایک عرصہ سے ڈاکٹر صاحب علیل رہنے لگے تھے، گھر پر محمد میاں کو انگریزی دواؤں اور ہومیو پیتھ کے علاج سے روشناس کرایا تھا، اور اکثر ان سے دوائیں دلواتے تھے۔

انتقال سے تقریباً کئی ماہ پہلے سے صاحب فراش ہوگئے، مریض آتے تو پریشان ہوتے، وہ کسی اور ڈاکٹر کے پاس جانا گوارا نہ کرتے، کمپاؤنڈر صاحب مریض کا حال لکھ کر ادھر بھیجتے، ڈاکٹر صاحب پرچہ دیکھ کر دوا تجویز کرتے، مگر یہ صورت دشوار ہونے لگی تو محمد میاں کو حکم دیا کہ وہ مطب میں بیٹھیں، مریض کو دیکھیں، نسخہ لکھیں اور جب کسی دوا پر اطمینان نہ ہو یا کسی مریض کا مرض پیچیدہ ہو تو مریض کا حال لکھ کر اور اس پر اپنی تجویز کردہ دوا کا نام تحریر کر کے ملازم کے ہاتھ اوپر بھیج دیا کریں، اس طور پر مریض کا کام بھی بن جائے گا اور محمد میاں کو مشق بھی ہو جائے گی، محمد میاں کو اس سے پہلے ہومیو پیتھک کی سند بھی مل چکی تھی، وہ قانوناً مطب کر سکتے تھے، دواؤں کے ناموں اور مرض کی تشخیص کا علم وتجربہ بھی ہو چلا تھا، اس لیے محمد میاں کئی ماہ مطب میں بیٹھے اور

مریضوں کو مطمئن کرتے رہے، اکثر حال کا پرچہ اوپر آتا، ڈاکٹر صاحب ان کی تجویز کردہ دوا کو ہی پاس کرتے، کبھی کبھی دوا بدل بھی دیتے، اور جب محمد میاں اوپر آتے تو بٹھا کر تعلیم دیتے، اور تبدیلی کی وجہ بتلاتے۔

والد ماجد ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب کا انتقال

محمد میاں کی تعلیم و تربیت میں ڈاکٹر صاحب کا بڑا دخل تھا، شب و روز ان کی خصوصی توجہ اپنے ہونہار بیٹے کی طرف تھی اور انھوں نے ان کی تعلیم و تربیت میں بڑی محنت اور دیکھ بھال کی تھی، ان کی فطری خواہش تھی کہ ان کا بیٹا ایک مثالی شخصیت کا مالک بنے، اس کے وہ خواب بھی دیکھتے تھے اور اپنے خوابوں کی تعبیر بھی ان کو نظر آنے لگی، وہ اپنے محبوب بیٹے کی ترقیات کو دیکھ دیکھ کر خوش بھی ہوتے تھے، ان کی محنت کے سرسبز و شاداب درخت میں میٹھا پھل لگنے کا وقت آیا تو خدا کے یہاں ان کا بلاوا آ گیا، وہ کئی ماہ سے بیمار تھے، بیماری بڑھتی گئی اور کئی موقعے ایسے آئے کہ گھر والوں کو فکر ہوگئی کہ خدانخواستہ کوئی حادثہ نہ پیش آ جائے، مگر خدا کو منظور تھا کہ امید و بیم کے لمحات سے گھر والے گزریں، تا کہ حادثہ کے وقت نا قابل برداشت غم سے دوچار نہ ہونا پڑے۔ محمد میاں اپنی صحافتی زندگی میں قدم رکھ چکے تھے، اردو عربی زبان میں ان کے مقالات، ترجموں اور مستقل کتابوں کی اشاعت ہو چکی تھی اور ان کا نام صحافیوں، ادیبوں اور معرکۂ حق و باطل میں حق کی کمان سنبھالنے والوں کی صف اول میں آنے لگا تھا، صورت و سیرت، صفات و خصائل میں "الولد سرٌّ لأبيه" کے مصداق بن چکے تھے، ان کی طرف سے ان کے والد ماجد کو بہت کچھ اطمینان ہو چکا تھا کہ ۶ / مئی ۱۹۶۱ء مطابق ذی قعدہ ۱۳۸۰ھ کو سر شام بیہوش ہوگئے، پھر ہوش میں آ گئے، رات سب نے جاگ کر گزاری، اور دوسرے دن ایک بجے اپنے بیٹے، بھانجوں اور دامادوں کے گھیرے میں ایک حاذق ڈاکٹر کے سامنے اپنے رفیق اعلیٰ سے جا ملے، إنا لله وإنا إليه راجعون.

حاضرین دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے کہ چند منٹ پہلے ایک بولتی ہوئی زبان یک لخت خاموش اور ایک مسکراتا ہوا چہرہ چشم زدن میں ساکت وصامت ہوکر رہ گیا، ڈاکٹروں نے اپنے سر پکڑ لیے اور خاموشی سے اٹھ کر چل دیے، بیٹے اور سارے عزیز اشکبار آنکھوں سے اپنے محبوب عزیز، جان و دل سے زیادہ عزیز بزرگ کو رخصت کرکے آگے کے فریضہ میں لگ گئے، ان کے چھوٹے بھائی مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی اس موقع پر بھی سفر پر تھے، وہ جب سفر سے واپس آئے تو تدفین وغیرہ سب سے فراغت ہوچکی تھی، ان کو دوہرا صدمہ ہوا، ایک تو وفات کا، دوسرے جنازہ اور تدفین میں عدم موجودگی کا، وہ آنے کے بعد جب محمد میاں سے ملے تو پھر اپنے جذبات کو قابو میں نہ رکھ سکے، اور صرف یہی نہیں برسوں انھیں اس بات کا احساس رہا۔

ڈاکٹر صاحب کی وفات کا حادثہ افراد خاندان، ندوہ اور پوری ملت اسلامیہ کے لیے اہم سانحہ اور صدمہ کی بات تھی مگر محمد میاں کے لیے یہ حادثہ سخت ترین تھا، ان کے دل ودماغ پر اس وقت جو بھی حالت گزری ہو وہ خدا جانے مگر سوائے آنسوؤں کے اور کسی چیز کا اظہار نہیں کیا، اب تک وہ آزاد تھے، نہ گھر کا بار تھا نہ گردش روزگار کا بوجھ، وہ آزادانہ لکھتے تھے اور والد کی خدمت کرتے تھے، اب اپنے گھر کے وہی بڑے تھے، اور مطب سے لے کر گھر تک ان کو فکر کرنی تھی، مگر والد نے ان کے لیے اتنا چھوڑ دیا تھا کہ اب بھی اگرچہ پہلے جیسا نہیں پھر بھی آزادی سے علم ودین کی خدمت کا موقع تھا، میں نے ان کے صبر وعزیمت اور عدم بے قراری کو دیکھ کر پوچھا:

> ''محمد میاں! جب تمہاری والدہ کا انتقال ہوا تھا تو تم زیادہ مغموم اور بے قرار ہوئے تھے، وہ کیفیت ماموں صاحب (ڈاکٹر صاحب) کے انتقال پر تم پر طاری نہیں ہوئی؟
>
> اس کا جواب انھوں نے دیا کہ میاں (وہ اپنے والد صاحب کو میاں کہا کرتے تھے) کے انتقال کے غم میں ہمارے صبر کا دامن چھوٹ سکتا تھا مگر پہلے ہی سے ہم نے اپنے کو تیار کر رکھا تھا

کہ یہ وقت آنے والا ہے، صبر وعزیمت سے کام لینا چاہیے، تو خدا
نے اس کا حوصلہ دیا، والدہ ماجدہ کا انتقال تو ایسا اچانک ہوا تھا کہ
دیر تک عقل کام نہیں کرتی تھی کہ کیا ہوا، ہم والدہ کے غم میں ایک
عرصہ تک سنبھلے نہیں تھے، ہوش وحواس گم تھے کہ ایک دن ان کو
خواب میں دیکھا کہ وہ بہت اچھے لباس میں خوش خوش آرہی ہیں،
ہم ان کو دیکھتے ہی ان کی طرف لپکے، اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ
کہیں ہم نے کہا: بوا! (وہ اپنی والدہ کو بوا کہا کرتے تھے) پہلے یہ
بتائیے کہ آپ پر کیا گزری؟ وہ مسکرا کر بولیں، ہمارے اللہ نے
ہمارے ساتھ بہت اچھا معاملہ کیا، بہت اچھی جگہ عنایت فرمائی
بس پھر آنکھیں کھل گئیں، دل کو جو اطمینان ہوا وہ بتا نہیں سکتے،
سارا غم دور اور بے چینی کافور ہوگئی۔''

مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کا اظہار تعلق

گزشتہ صفحات میں جیسا کہ آچکا ہے کہ مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کے لیے بھی یہ حادثہ کوئی معمولی حادثہ نہ تھا، انھیں ڈاکٹر صاحب کی ہی ہمیشہ سرپرستی حاصل رہی اور ڈاکٹر صاحب ہی کی تربیت کا وہ بھی ایک ثمرہ ہیں جیسے محمد میاں ہیں، اس کو انھوں نے ایک مکتوب میں بھی ظاہر کیا ہے جو انھوں نے ڈاکٹر صاحب کو تحریر کیا تھا، اس سے ان تینوں کے درمیان جو محبت ومودت کا تعلق اور جذبۂ احسان مندی ظاہر ہوتا ہے اس کی مثال کم پائی جاتی ہے، مکتوب ملاحظہ ہو!

''میرا تو یہ عقیدہ ہے کہ دارالعلوم میں جو کچھ ہو رہا ہے اور جو کچھ
ان شاء اللہ آئندہ ہوگا وہ سب آپ ہی کا عمل ہے، جس طرح اگر
محمد میاں سلمہ کی توجہ اور ان کی خصوصیت سے دارالعلوم کو نفع پہنچے تو
وہ آپ ہی کا عمل ہے، اسی طرح میرے ناچیز ہاتھوں سے جو کچھ

ہو وہ آپ ہی کے ہاتھ سے ہوگا، میرے لیے سب سے مقدم اور مقدس اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا کے بعد آپ کی رضا اور آپ کی خوشنودی ہے، اور اس کا جو درجہ اور جو حیثیت عزیز از جان محمد میاں سلمہ کے لیے ہے وہی مجھ نالائق کے لیے ہے، میری خواہش یہی ہے کہ ہم لوگوں کے ہاتھوں سے جو کچھ ہو وہ خالصتاً آپ کی طرف منسوب ہو، اور اس کو آپ کی سرپرستی اور آپ کی خوشنودی اور رضا حاصل ہو، ہم لوگ آپ کے جوارح و اعضاء ہیں، ہمارا مستقل وجود نہیں۔''

(۱۵ ربیع الاول ۱۳۷۸ھ)

تنہائی کی ایک رات

ڈاکٹر صاحب (مولانا سید عبدالعلی حسنی ناظم ندوۃ العلماء) کا انتقال لکھنؤ میں ہوا تھا، وہ جس میں رہتے تھے وہ بڑا اور سہ منزلہ مکان ہے اور الحمد للہ اب بھی ہم لوگوں کے پاس ہے(۱)، تدفین رائے بریلی میں اپنے خاندانی قبرستان میں ہوئی، سب گھر والے تکیہ کلاں اپنے گھر آگئے، چھ دن بعد محمد میاں نے لکھنؤ جانے کی اجازت مانگی، ان کی دادی بی بی خیر النساء صاحبہ (والدۂ مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی) اور بہنوں نے اکیلے جانے سے روکا، وہ نہ مانے اور کام کا بہانہ کر کے رخصت ہو گئے، راقم سطور اور عزیزی مولوی محمد رابع ندوی دور تک سمجھاتے چلے کہ نہ جاؤ، وہاں کوئی نہیں، مگر وہ طے کر چکے تھے، واپس نہ لوٹے اور لکھنؤ چلے گئے، رات کو تنہا اس گھر میں رہے، ہر طرف سناٹا، گرمی کا موسم اور چاندنی رات تھی، وہ خود کہتے تھے کہ ''دیر تک نیند

(۱) یہ مکان گوئن روڈ امین آباد میں واقع ہے، ڈاکٹر صاحب کی وفات کے بعد بھی یہ مولانا محمد الحسنی اور ان کے بھائیوں مولانا محمد ثانی حسنی صاحب، مولانا محمد رابع حسنی صاحب، مولانا محمد واضح رشید صاحب کی قیامگاہ رہی، نیچے سڑک کی جانب مکتبہ اسلام اور مطب تھا، اب یہ مکان روڈ ف مارکیٹ ہے، ایک دوکان حسنی فارمیسی کی ہے جس سے ڈاکٹر صاحب کی تیار کردہ دوائیں فروخت ہوتی ہیں اور ایک دوکان میں مکتبہ اسلام ہے۔(م)

نہیں آئی، ادھر دیکھتے کبھی ادھر دیکھتے، میاں کے جانے کا غم، تنہائی کا احساس، میاں ہی کی تکیہ سر کے نیچے رکھ کر لیٹے، زندگی بھر تنہا نہیں رہے تھے، زندگی میں یہ پہلا موقع تھا، آنکھ لگتی نہیں تھی، کبھی خیال آتا کہ بڑوں کی بات مان لیتے اور نہ آتے، مگر پھر اس خیال سے کہ پست ہمتی سے کیا فائدہ؟ دل کو کڑا کر کے آنکھیں بند کر لیں، تھوڑی دیر بعد محسوس ہونے لگا کہ میاں کی چال سے کوئی چل رہا ہے، بالکل میاں کی طرح جیسے وہ چلتے تھے، اور ان کے نرم جوتوں کی آواز تھی، آنکھ کھول کر دیکھتے، کوئی نظر نہیں آتا، کچھ انجانا خوف، اور کچھ گھر کی مانوس سے مانوس تر فضا اور اس کی مکانیت عجیب کیفیت میں مبتلا کیے رہی، اور خدا جانے کب آنکھ لگی، جب آنکھ کھلی تو صبح کو سپیدی نمودار ہو چکی تھی، اور فجر کی اذان دی جا چکی تھی، ہم اٹھے اور مسجد کو چلے گئے، نماز کے بعد اچھے بھیا مولوی طاہر صاحب ملے، ان سے ہم نے کہا، آپ نے وعدہ کیا تھا کہ سوتے وقت آپ گھر آجائیں گے اور ساتھ رہیں گے، آپ نہیں آئے، ہم پر یہ واقعہ گزرا، وہ بولے: ہم آئے تھے اور دیر تک دروازہ کھولنے کے لیے پکارتے رہے، تم بولے نہیں، مجبور ہو کر واپس ہو گئے۔ اور یہ رات ہم کو بھولی نہیں۔"

جائیداد کی دیکھ بھال، مطب اور دواخانہ کی ذمہ داری

محمد میاں نے زندگی بھر لکھنے پڑھنے سے کام رکھا تھا، جائیداد کا کام دوسرے کرتے تھے، مطب کی ذمہ داری والد ماجد پر تھی، والد ماجد کے انتقال کے بعد ہر چیز کی نوعیت بدل گئی، جب سب کے دل ٹھہرے اور معتدل حالات پیدا ہوئے تو ہم سب بھائی بہنوں نے خال مکرم مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی سے (جو اس وقت ڈاکٹر صاحب کی جگہ پر تھے) مشورہ چاہا بلکہ حکم کے طلب گار ہوئے، مطب کے متعلق مولانا نے فرمایا کہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ہم سب کے دیرینہ کرم فرما ہیں، بھائی صاحب (ڈاکٹر صاحب) کی تیمارداری اور دوا علاج جس دل سوزی اور محبت و تعلق کے ساتھ کیا ہے وہ سب جانتے ہیں، اس وقت بڑا مسئلہ بھائی صاحب کے

مطب میں کسی ڈاکٹر کے بیٹھنے کا ہے، محمد میاں تو اس میدان کے مرد نہیں، ہم یہ نہ چاہیں گے کہ وہ علم وقلم کی خدمت کے بجائے اس میں پھنس جائیں، نہ بھائی صاحب اس کو پسند کرتے تھے، اس لیے ہماری رائے ہے کہ ڈاکٹر قریشی صاحب کو یہاں بیٹھنے کی زحمت دی جائے اور محمد میاں کا ان سے کچھ معاملہ طے ہو جائے، اس حکم پر سب راضی ہو گئے، اور پھر خود ہی مولانا نے ڈاکٹر صاحب سے بات کر کے ان کو راضی کر لیا، مطب کی کچھ شکل بدل گئی، اور ڈاکٹر صاحب بیٹھنے لگے، وہ دن تھا اور آج کا دن ہر دو حضرات نے ایک دوسرے کے ساتھ جس محبت و تعلق کا اظہار کیا اور جس یگانگت کا ثبوت دیا وہ مثالی درجہ رکھتا ہے، اس میں محمد میاں کی عقل و فراست، محبت و یگانگت کا کمال تو تھا ہی، خود ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب کے حسن طبیعت اور کمال اخلاق کا بھی دخل تھا، وہ خود بیان کرتے ہیں:

> ''(وہ) بے نفسی، ایثار، سخاوت، حسن سلوک اور للّٰہیت کا ایسا نمونہ تھے کہ اس کی مثال کم سے کم نوجوانوں میں میری نظر میں نہیں ہے۔''(۱)

اور ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''ایسا ہمدم اور رفیق جو عزیزوں سے زیادہ محبوب ہو، اور جس کے ساتھ شب و روز گزرے ہوں، سفر و حضر ہر جگہ ساتھ رہا ہو، مکہ مکرمہ، منیٰ، عرفات، مسجد نبوی سے لے کر خدا معلوم کتنے مواقع ایسے آئے جب ہم صرف دونوں ہوئے، صرف ایک قدر مشترک اسلام کی سربلندی، پیار محبت، دل سوزی اور دردمندی کے ان لمحات کا خیال آتا ہے۔''(۲)

ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب مرحوم کی چھوڑی ہوئی جائیداد لکھنؤ، رائے بریلی اور فتح

---

(۱) تعمیر حیات محمد الحسنی نمبر/۲۵۶ (۲) تعمیر حیات محمد الحسنی نمبر/۲۵۴

پورتین جگہوں پر تھی، جن کو نئے سرے سے ترقی دینا اور اس کی دیکھ بھال کرنا تھا، مشورہ سے لکھنؤ اور فتح پور کی دیکھ بھال محمد میاں نے اپنے ذمہ لی اور اپنا معاون اپنے بہنوئی مولانا سید محمد طاہر صاحب کو بنایا، اور رائے بریلی کی جائیداد اپنے دوسرے بہنوئی سید محمد مسلم حسنی صاحب اور راقم سطور کے ذمہ کی، الحمدللہ ان سب نے پوری دلچسپی سے اپنی اپنی ذمہ داری سنبھالی، محمد میاں علم وقلم کی خدمت کے ساتھ ساتھ ہر دو جگہ کی ذمہ داری بھی بخوبی پوری کرتے رہے، ہر سال فتح پور کا سفر کرتے اور دو تین روز رہ کر باغ کو فروخت کرتے اور گھر واپس آجاتے، اور یہ سلسلہ آخری دنوں تک چلتا رہا۔

حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری سے تعلق اور آخری حاضری

حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری سب سے پہلے ۱۹۴۶ء میں لکھنؤ تشریف لائے، پھر ۱۹۴۸ء میں تشریف لائے، پھر ۱۹۵۱ء، ۱۹۵۲ء، ۱۹۵۳ء میں مسلسل تشریف لاتے رہے، ان سب موقعوں پر محمد میاں نے ان کی خدمت میں حاضری دی، ان کی دعائیں لیں اور پھر ان ہی سے بیعت ہوگئے، اور عقیدت ومحبت کا تعلق اتنا بڑھا کہ رائے پور بھی حاضر ہوئے، اور ۱۹۶۲ء میں جب حضرت رائے پوری پاکستان کے آخری سفر پر گئے اور وہاں علیل ہوگئے، زندگی وعافیت کی طرف سے تشویش ناک خبریں پہنچنے لگیں، جس کے پیش نظر مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی مولانا محمد منظور نعمانی کے ساتھ لاہور پہنچے اور وہاں سے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کو بلایا اور ڈاکٹر صاحب بھی روانہ ہوگئے تو محمد میاں کا دل بھی اپنے مرشد کی خدمت میں حاضر ہونے اور ان کو صحت وعافیت کے ساتھ دیکھنے ورنہ کم سے کم زندگی کی حالت میں پہنچ جانے کی خواہش ہوئی، اور جانے کا ارادہ کرنے لگے کہ ایک رات کو خواب دیکھا، اس خواب کو وہ خود بیان کرتے تھے کہ:

> ”ہم نے دیکھا: ہمارے گھر کے دروازہ پر ایک بوڑھا شیر اس طرح بیٹھا ہے کہ جیسے وہ گھر کی دربانی کر رہا ہو، ہم نے اس سے

پوچھا کہ اے شیر! بتا کہ حضرت رائے پوری ہندوستان واپس آئیں گے کہ نہیں، اس نے جواب دیا کہ نہیں۔

اس خواب کے بعد ہمارا دل بے قرار ہو گیا اور ہم کسی نہ کسی طرح تیار ہو کر پاکستان روانہ ہو گئے۔''

اس سفر میں محمد میاں کے ہمراہ خال مکرم مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کے خادم خاص عبدالرزاق صاحب تھے، یہ دونوں جب لاہور پہنچے تو حضرت رائے پوری غشی (کوما) کی حالت میں تھے، اور حضرت کے مسترشدین اور عیادت کے لیے آنے والوں کا بڑا ہجوم تھا، چونکہ مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی پہلے پہنچ گئے تھے، اس لیے حضرت نے ان کو دیکھ لیا تھا۔

عبدالرزاق صاحب کہتے ہیں: جب مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی حضرت کے قریب پہنچے تو حضرت کو بتایا گیا کہ علی میاں آئے ہیں تو حضرت نے آنکھیں کھولیں اور پھر بند کرلیں اور چند روز اسی حالت میں رہ کر انتقال کر گئے۔۔إنا لله وإنا إليه راجعون.

حضرت رائے پوری کا قیام لاہور میں حاجی عبدالمتین صاحب کی وسیع وعریض کوٹھی میں تھا، مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی اور ان کے رفقاء اور مولانا محمد منظور نعمانی کا قیام اسی کوٹھی میں رہا، یہاں سے سب ڈھڈھیاں (حضرت کے وطن) روانہ ہوئے جہاں حضرت کی چوتھی نماز جنازہ ہوئی اور پھر وہیں تدفین عمل میں آئی، مولانا محمد میاں ان سارے موقعوں پر موجود رہے، پھر سب کی ایک ساتھ ہندوستان واپسی ہوئی، البتہ ڈاکٹر صاحب بعض مجبوریوں کی وجہ سے زیادہ ٹھہر نہیں سکے تھے جس کا بعد میں انھیں افسوس رہا۔

مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی لکھتے ہیں:

''اپنے زمانہ کے شیوخ وصلحاء میں ان کو حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری سے بڑی عقیدت تھی، حضرت کی لکھنؤ کی

مجلسوں میں تو وہ شریک ہوتے ہی تھے، رائے پور بھی گئے، اور
وہاں حضرت کے ہاتھ پر بیعت ہوگئے، اللہ تعالیٰ نے حضرت کی
آخری علالت میں ان کو لاہور پہنچا دیا، حضرت کا حادثۂ وفات
ان کے سامنے ہی پیش آیا، جنازہ کے ساتھ گئے اور حضرت کے
وطن ڈھڈھیاں جا کر تدفین میں شرکت کی۔"

تعمیر حیات کا اجراء

۱۰/نومبر ۱۹۶۳ء میں محمد میاں کی ادارت میں ندوۃ العلماء کے ترجمان کے طور پر "تعمیر حیات" کا پہلا شمارہ منظر عام پر آیا، اس رسالہ کے اجرا کا مقصد بیان کرتے ہوئے محمد میاں لکھتے ہیں:

"تعمیر حیات" کے اجراء کا ایک بڑا مقصد یہ ہے کہ یہ بات کسی نہ کسی درجہ میں حاصل ہوسکے، اور مسلمانوں کو یاد دلایا جاتا رہے کہ ندوۃ العلماء کس لیے وجود میں آیا، کن مخلصین اہل نظر نے اس کی بنیاد ڈالی، وہ کس بات کا داعی ہے، اس نے اس بدلے ہوئے زمانہ میں کیا تعلیمی نظام اختیار کیا ہے، اور اس کے کیا اسباب ہیں، اس نے کس طرح مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق کی دعوت دی ہے اور اس کا اس میدان میں کیا کردار ہے، اس نے علوم نبوت کی کس طرح ترجمانی و اشاعت کی ہے، اور قرآن و حدیث، فقہ اسلامی، سیرت نبوی، اور دوسرے اسلامی علوم کی کیا خدمت کی ہے، اس نے عقل و قلب، روح کے تقاضوں اور جائز بشری مطالبات، ایمانی کیفیات اور جدید معلومات کو کس طرح باہم جمع کیا ہے، اور ان کے موہوم تضاد کو رفع کیا ہے، وہ جدید تمدنی مسائل میں مسلمانوں کی کس طرح رہنمائی کرنا چاہتا

ہے، اور مغرب کے چیلنج کا اس کے پاس کیا جواب ہے۔

دعا ہے کہ "تعمیر حیات" اس اہم مقصد کی تکمیل کا مفید ذریعہ بن سکے، اور اس سے دین کی خدمت، اسلام کی حفاظت واشاعت اور دینی تعلیمی مسائل میں مسلمانوں کی اہم ضروریات کی تکمیل کا کام لیا جا سکے۔"

وہ عربی میں "البعث الاسلامی" پہلے ہی سے نکال رہے تھے، یہ اضافی ذمہ داری بھی انھوں نے لی، ان کے رفیق مولوی سعید الرحمٰن صاحب لکھتے ہیں:

"جب ۱۹۶۳ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے شعبۂ تعمیر و ترقی کی طرف سے ایک پندرہ روزہ تعمیر حیات نکالنے کا فیصلہ ہوا، تو اس کی ادارت کے فرائض انجام دینے کے لیے اپنی تمام مشغولیات کے باوجود تیار ہو گئے۔"(۱)

اپنی معاونت کے لیے انھوں نے مولوی سعید الرحمٰن صاحب کا نام رکھا، کچھ عرصہ بعد انھوں نے ادارت کی پوری ذمہ داری مولوی سعید الرحمٰن صاحب کو دے کر ان ہی کو ایڈیٹر بنا دیا، پھر یہ ذمہ داری مولوی اسحاق جلیس ندوی کی طرف منتقل ہوئی۔(۲)

تعمیر حیات کے ذریعہ سے محمد میاں نے ندوۃ العلماء اور اس کے دارالعلوم کے نظام ونصب العین اور خدمات سے مسلمانوں کو روشناس کرایا، اور ہر موضوع پر بڑے مفید مقالات لکھے، اور آخر عمر میں ان مقالات اور اداریوں کو جمع کرنا بھی شروع کر دیا تھا کہ ان کو کتابی شکل میں منظر عام پر لایا جائے گا، اس طرح کے اداریوں کو جمع کر کے ایک مفید مجموعہ مرتب کیا جو افسوس کہ ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکا۔

---

(۱) تعمیر حیات محمد الحسنی نمبر/ ۲۳۹

(۲) مولانا اسحاق جلیس صاحب ندویؒ نے جولائی ۱۹۷۹ء میں انتقال کیا تو کچھ وقت کے لیے اس کی ادارتی ذمہ داری مولانا نور عظیم (عبدالنور) ندویؒ نے سنبھالی اور ان کے شریک ادارت مولانا شمس الحق صاحب ندوی رہے، اور پھر ان ہی پر اس کی پوری ذمہ داری آ گئی، تا حال اس ذمہ داری کو وہی انجام دے رہیں۔(م)

محمد میاں (محمد الحسنی) نے اپنے پہلے اداریہ میں ندوۃ العلماء کے نصب العین، اس کی دعوت اور نظام عمل پر پوری بحث کی اور اس عہد کی تجدید کی جو ۱۳۱۱ھ میں علماء نے فیض عام کالج کانپور میں اکٹھے ہو کر مولانا سید محمد علی مونگیری کے ندوۃ العلماء کے تخیل کو پیش کرنے پر متفقہ طور پر کیا تھا، لکھتے ہیں:

''یہ دراصل اس عہد کی تجدید ہے کہ ندوۃ العلماء نے جو دعوت، نصب العین اور نظام عمل مسلمانوں کے سامنے پیش کیا تھا، اور جس نے ان کے اندر زندگی کی ایک نئی لہر پیدا کردی تھی وہ دعوت اور نصب العین ایک طرف علوم نبوت کا حامل و داعی و شارح و ترجمان اور مسلمانوں کی معاشرتی و دینی اصلاح - رفع نزاع باہمی اور اخوت اسلامی کا - آئینہ دار ہے اور دوسری طرف مغرب کے چیلنج کا ٹھوس اور عملی جواب بھی ہے، یہ دو اس کے ایسے شہپر ہیں جو اس کی بلند اور نتیجہ خیز پرواز کے لیے ضروری ہیں، وہ نہ مرعوبیت کا قائل ہے نہ فرار کا داعی، نہ مغربی علوم اور مادی وسائل و ترقیات کا بالکل منکر ہے نہ اس کا مقلد جامد اور خوشہ چیں، وہ نہ ان علوم و مسائل اور صنعتی ترقیات سے وحشت رکھتا ہے نہ ان سے مقاصد کا سا معاملہ کرنا چاہتا ہے، وہ مغربی تہذیب کی قوت و وسعت، جاذبیت اور اثر انگیزی کا معترف بھی ہے، اور اس کے معنوی افلاس، باطنی ظلمت اور بے مقصدیت اور بے یقینی کی اس کیفیت سے بھی واقف ہے جو یورپ کے حسین و جمیل مظاہر کے اندر پوشیدہ ہے، اور اس کو حقیقی قلبی اطمینان اور باطنی مسرت سے یکسر محروم کر رکھا ہے۔

ندوۃ العلماء کے یہ دو ایسے بازو ہیں جو اس کی متوازن ترقی و پیش قدمی کے لیے بے حد ضروری ہیں، اور ان دونوں کے صحیح

تناسب کوملحوظ رکھنا ندوہ کے ہر طالب علم، ہر ذمہ دار اور ہر بہی خواہ کا فرض ہے۔"(۱)

پہلی تصنیف "سیرت مولانا محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ"

بانی ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید محمد علی مونگیری کی سیرت اب تک سامنے نہیں آئی تھی، مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کو اس کا تقاضہ ہوا کہ وہ اس کام کو انجام دیں، اس کے لیے انھوں نے خاکہ بنا کر مواد اکٹھا کرنے کا کام شروع کر دیا تھا کہ انھیں معلوم ہوا کہ اس مبارک کام کا آغاز محمد میاں کر چکے ہیں، انھیں اس سے مسرت ہوئی، اس طرح جو کام وہ خود کرنے جا رہے تھے ان کی ہی نگرانی میں انجام پانے لگا، وہ لکھتے ہیں:

"......اسی دوران ایک روز اچانک معلوم ہوا کہ محمد میاں (جن کا "البعث الاسلامی" کا دفتر اسی کمرہ میں تھا) بغیر کسی کو بتلائے اپنے شوق سے یہ کام شروع کر چکے ہیں، اور ان کی بڑی تمنا ہے کہ یہ کام ان کے ہاتھوں انجام پائے، یہ غالباً اس تعلق کا نتیجہ تھا جو ان کے دادا مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب اور حضرت مولانا سید محمد علی مونگیری کے درمیان رہ چکا ہے، یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ اس کام کو خالص اپنی سعادت سمجھ کر انجام دے رہے ہیں، اور ان تمام آداب کو ملحوظ رکھتے ہیں جو اہل اللہ اور برگزیدہ اصحاب کی سوانح اور سیرت کی تصنیف و ترتیب میں ملحوظ رکھنے چاہئیں۔"

آگے لکھتے ہیں:

"......کتاب میرے تصور و توقع سے بلند نکلی، مجھے آج بھی اس میں بہت شبہہ ہے کہ میں اس کو اتنے اچھے طریقہ پر لکھ سکتا اور اس کے حقوق سے عہدہ برآ ہو سکتا تھا۔"(۲)

---

(۱) تعمیر حیات ۱۰/نومبر ۱۹۶۳ء ماخوذ از محمد الحسنی انتخاب نمبر (ماہنامہ رضوان)

(۲) تعمیر حیات محمد الحسنی نمبر/۱۵۶

کتاب کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''کتاب جامع بھی ہے مؤثر بھی، دل آویز بھی، وہ نہ صرف ایک عظیم و برگزیدہ شخصیت کی سوانح ہے بلکہ ایک عظیم تحریک کی تاریخ بھی ہے، ایک معاشرے کی تصویر ہے، اور ایک پورے دور کی عکاسی بھی، ماضی کی سرگزشت بھی ہے اور مستقبل کا وہ خواب بھی جو خدا کے ایک برگزیدہ و عالی ہمت بندہ نے دیکھا تھا، اور جس کی تعبیر پورے طور پر ابھی ظاہر نہیں ہوئی، اور یہ اس عظیم ادارہ کے فرزندان اور ذمہ داران کا فرض ہے کہ اس خواب کو پورا کرنے کی کوشش کریں۔''

یہ ضخیم اور محققانہ تصنیف مجموعی طور پر پسند کی گئی، البتہ اس میں بعض حقائق سے کچھ لوگوں نے اختلاف بھی کیا، علمی دنیا میں اس اختلاف کی گنجائش ہے، مکتبہ دارالعلوم ندوۃ العلماء سے ۱۹۶۳ء میں شائع ہوئی، یہ ان کے قلم سے نکلی ہوئی پہلی کتاب تھی، اس کے بعد ۱۹۷۰ء میں اپنے جداعلیٰ اور مشہور بزرگ حضرت سید شاہ علم اللہ حسنی کا تذکرہ لکھا، جو بے حد مقبول ہوا، پھر پیام ندوۃ العلماء، روداد چمن، اور کئی اہم کتابوں کے اردو ترجمے منظر عام پر آئے جو سب کے سب بڑے مقبول ہوئے۔

گجرات کا ایک سفر

۶ر دسمبر ۱۹۶۴ء کو مسلم مجلس مشاورت کا ایک وفد دہلی سے گجرات کے لیے روانہ ہوا، اس وفد میں تمام جماعتوں کی بہتر سے بہتر نمائندگی تھی اور تقریباً سب کے صدر اور رہنما موجود تھے، اس وفد میں پنڈت سندر لال (۱) بھی شریک تھے، ملک کے

(۱) اس دورے میں پنڈت سندر لال بھی شریک تھے، اور تقریباً تمام اہم ارکان مجلس، وفد نے احمد آباد کے مضافات اور نواحی قصبات کا بھی دورہ کیا، ہر جگہ اس کا جوش و خروش سے استقبال ہوا، بڑے بڑے جلسے منعقد ہوئے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تحریک خلافت کا دور واپس آگیا ہے، اہم مقامات میں سے نڈیاڈ، گودھرا، بڑودہ، بھروچ اور سورت تھے۔ (کاروان زندگی ۵۰۹/۱)

مختلف خطوں میں (جس میں خصوصیت سے کلکتہ، راوڑکیلا، جمشید پور اور گجرات قابل ذکر ہیں) فرقہ وارانہ فسادات بھڑکنے کے بعد مسلمانوں کو جس بڑے جانی و مالی نقصان کا سامنا کرنا پڑا تھا، اس سے درپیش مشکلات کو دور کرنے اور ملی مسائل کے حل کرنے کے لیے جو اولین کوششیں کی گئی تھیں، اسی سلسلہ کی یہ بھی ایک کوشش تھی، جس میں پیش پیش لوگوں میں مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی بھی تھے، محمد میاں کو ملت کے لیے تڑپ اور دل سوزی موروثی طور پر ملی ہوئی تھی، پھر انھیں اپنے عم مکرم مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کے کاموں سے والہانہ لگاؤ بھی تھا، چنانچہ اس وفد میں محمد میاں بھی ساتھ گئے، یہ وفد حسب ذیل مقامات پر گیا:

پالن پور، احمد آباد، بیس نگر، نڑیاڈ، گودھرا، بڑودہ، بھروچ، سورت۔

جہاں پر یہ دورہ ختم ہوا وہاں اور ہر جگہ جہاں سے یہ وفد گزرا یا ٹھہرا، زبردست استقبال ہوا، اور جگہ جگہ اس کے بڑے شاندار جلسے منعقد ہوئے، مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی محمد میاں کی اس سفر میں شرکت کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''محمد میاں پڑھنے لکھنے میں جتنے پکے تھے سفر میں اتنے ہی کچے تھے، یہ وراثت ان کو اپنے والد ماجد سے ملی تھی، جو برسوں سفر نہیں کرتے تھے، ایک مرتبہ والدہ صاحبہ کے اشارہ وہدایت سے میں ان کو مسلم مجلس مشاورت کے دورۂ گجرات میں ساتھ لے گیا جو دسمبر ۱۹۶۴ء میں ہوا تھا، اس سلسلہ میں احمد آباد، اور اس کے نواح گودھرا، بڑودہ، سورت اور بھروچ ان کا جانا ہوا۔'' (۱)

سفر حجاز

۱۹۶۷ء میں محمد میاں نے حجاز مقدس کا پہلا سفر کیا، یہ سفر مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کی معیت میں ہوا، مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی واپس آ گئے مگر

(۱) تعمیر حیات محمد الحسنی نمبر/۱۵۹

محمد میاں نے ان سے اجازت لے کر مزید قیام کا فیصلہ کیا، اور اس مدت میں انھوں نے مدینہ منورہ میں چھ ماہ سے زائد عرصہ تک قیام کیا، اور فریضۂ حج بھی ادا کیا، یہ سفر رجب ۱۳۸۷ھ (اکتوبر ۱۹۶۷ء) میں ہوا، رابطہ عالم اسلامی کا ماہ شعبان ۱۳۸۷ھ (نومبر ۱۹۶۷ء) میں اجلاس منعقد ہونا تھا، اس سفر کا ایک قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے انھیں اور مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کو ایک سنگین حادثہ سے بال بال بچایا، جب یہ لوگ ایک دعوتی مناسبت سے طائف گئے اور وہاں سے واپسی میں وہ گاڑی جس پر یہ دونوں حضرات تھے، حادثہ کا شکار ہوگئی، مگر مسافروں کو اللہ تعالیٰ نے پورے طور سے محفوظ رکھا، مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی لکھتے ہیں:

> ''مجھے یاد ہے کہ محمد میاں جب پہلی مرتبہ (۱۳۸۷ھ/ ۱۹۶۷ء) میں میرے ساتھ حجاز گئے اور وہاں کے وزیر تعلیم معالی الشیخ حسن بن عبداللہ بن حسن سے ملنے کے لیے ہم لوگ شیخ محمد محمود الصواف کی معیت میں طائف گئے تو انھوں نے بڑی گرمجوشی سے ''البعث الاسلامی'' کے جوان مدیر کا استقبال کیا، اور رسالہ سے اپنی گہری دلچسپی وتأثر کا اظہار کیا۔
>
> اسی سفر میں (۱۳؍رجب ۱۳۸۷ھ/ ۱۶؍اکتوبر ۱۹۶۷ء کو) وہ سنگین حادثہ پیش آیا جس میں اللہ نے ہم دونوں کو بال بال بچایا، ہوا یہ کہ جب ہم طائف سے واپس آرہے تھے تو حدود مکہ میں داخل ہونے سے پہلے ڈرائیور کی آنکھ جھپک جانے کی وجہ سے گاڑی الٹ گئی، اور ایسی الٹی کہ چھت بالکل زمین پر تھی، اور چاروں پہیے دفتی کے ڈبہ کی طرح اوپر، ڈرائیور کا خیال تھا کہ ہم دونوں اب اس عالم میں نہیں ہیں، اس نے لیٹے لیٹے پوچھا کہ ''یا شیخ أأنت حي؟'' واقعہ بھی ایسا تھا، گاڑی جب رکی تو پہلے

محمد میاں باہر آئے اور انھوں نے کہا کہ چچا میاں باہر آجایئے، اللہ تعالیٰ نے ہم لوگوں کی مدد فرمائی اور صاف جان بچالی، ایسا کس طرح اور کیسے ممکن ہوا، یہ محض قدرت الٰہی کا کرشمہ ہے، مفتی امین الحسینی صاحب مرحوم نے مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ آپ گاڑی سے اس طرح نکلے جیسے حضرت یونس علیہ السلام شکم ماہی سے نکلے تھے، معلوم ہوتا ہے ابھی اللہ کو محمد میاں سے کام لینا تھا، اور ''البعث الاسلامی'' کے ذریعے عالم عربی میں ہندوستان کی ایک بے سروسامان جماعت کی نحیف آواز پہنچائی تھی۔''(۱)

---

(۱) (تعمیر حیات محمد الحسنی نمبر/ ۱۶۶-۱۶۷)۔ اس واقعہ کی تفصیل حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے کاروان زندگی حصہ دوم میں لکھی ہے جو صاحب تذکرہ اور تذکرہ نگار دونوں کے سانحہ وفات کے بعد منظر عام پر آئی، اس سے ایک اقتباس نقل کیا جارہا ہے، مولانا لکھتے ہیں:

''......دوپہر کا کھانا شیخ محمد محمود الصواف کے تعلق سے عراقی احباب کے ساتھ کھایا، عصر کے وقت طائف سے مکہ کے لیے روانہ ہوئے، موٹر میں میں اور محمد میاں تنہا تھے، ہم لوگ احرام باندھ کر چلے تھے، بن لادن کی مسجد میں نماز پڑھی اور عمرہ کی نیت کی، عصر و مغرب کے درمیان چلنا ہوا تھا، طائف کے حدود سے ہم لوگ گزر رہے تھے اور عرفات کے حدود ابھی شروع نہیں ہوئے تھے کہ ہم کو محسوس ہوا کہ گاڑی کھڈ میں جارہی ہے (یاد رہے کہ طائف اور مکہ کے درمیان سڑک کے

کنارے کئی جگہ گہرے گھڈ آتے ہیں) اس وقت صاف معلوم ہوا کہ ہم لوگ وادی موت کی طرف جارہے ہیں اور اگر کسی بڑے پتھر نے راستہ میں موٹر کو روک نہیں لیا تو موت یقینی ہے "إلا أن يشآء اللّٰه"، یہی محسوس ہوتا رہا کہ موٹر پلٹیاں کھارہی ہے، ایک جگہ اچانک موٹر رکی، محمد میاں نے کہا کہ ''چچا میاں'' فوراً اتر جایئے، دیکھا تو وہ باہر کھڑے ہیں، اور مجھے اترنے کی دعوت دے رہے ہیں، ان کو خیال تھا کہ موٹر پھر اسٹارٹ ہوجائے گی، اور ہم لوگ نکل نہیں سکیں گے، میں کھڑکی سے باہر نکلنے لگا تو ڈرائیور نے جو سیٹ کے نیچے پڑا ہوا تھا، میری طرف مخاطب ہو کر کہا: "یاشیخ هل أنت حي؟" (مولانا! کیا آپ زندہ ہیں؟) میں نے کہا ہاں الحمدللہ! میں کھڑکی سے باہر نکلا تو دیکھا کہ موٹر بالکل الٹی پڑی ہے، چھت نیچے اور چاروں پہیے اوپر، میں الحمدللہ باوضو تھا اور ہاتھ میں تسبیح تھی، نہ احرام کھلا تھا نہ تسبیح ہاتھ سے چھوٹی تھی، حیرت ہوئی کہ موٹر کے الٹنے کے بعد ہم لوگ سیٹ سے کیسے نہیں گرے، اور کھڑکی سے کیسے نکل سکے؟ یہ سب ایک ایسے ڈرامائی انداز میں ہوا گویا ہم نے خواب دیکھا تھا، سڑک پر گزرنے والی موٹریں یہ منظر دیکھ کر ٹھہر جاتیں، اور ان کے مسافر پوچھتے "هل أنتم أحياء؟" (کیا آپ لوگ زندہ ہیں؟) (باقی اگلے صفحہ پر)

حج

مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی رابطہ عالم اسلامی کے پروگرام میں شرکت کرنے کے بعد ہندوستان واپس آ گئے، جبکہ محمد میاں ٹھہر گئے، اور چھ ماہ سے زائد عرصہ انھوں نے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی عطر بیز فضاؤں میں گزارا، زیادہ تر قیام مدینہ منورہ میں رہا، اس طرح ان کو حرمین شریفین کی متبرک سرزمین پر رمضان المبارک اور اشہرِ حرم گزارنے کی سعادت نصیب ہوئی، اور جب وہ حج کی سعادت حاصل کرکے واپس آئے تو انھوں نے اپنے دلی تأثرات اور جذبات واحساسات بیان کیے، وہ تأثرات حسب ذیل اشعار میں بیان کیے جارہے ہیں:

زہے بخت ہم بھی حرم دیکھ آئے — خدا کا کرم تھا کہ ہم دیکھ آئے
خوشا کعبۂ محترم دیکھ آئے — طواف اس کا ہم دم بدم دیکھ آئے
لپٹ کر اور آنکھوں سے آنسو بہاکر — درِ کعبہ و ملتزم دیکھ آئے
مقام ابراہیم اور سنگ اسود — انھیں دیدہ و دل بہم دیکھ آئے
صفا اور مروہ، حطیم اور زمزم — مطاف اور صحن حرم دیکھ آئے
کھڑے ہوکے میزاب رحمت کے نیچے — گھٹا رحمت حق کی ہم دیکھ آئے
منیٰ اور مزدلفہ عرفات جاکر — خدا کا کرم ہر قدم دیکھ آئے
مدینہ کی پاکیزہ گلیوں میں پھر کر — مدینہ کے اہل کرم دیکھ آئے
بقیع و اُحد کے مقابر مشاہد — انھیں جا کے با چشم نم دیکھ آئے

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) قریب ہی پولیس کی ایک چوکی تھی، ہم لوگ وہاں گئے، طائف ہی کے وضو سے مغرب کی نماز پڑھی، اور وہیں سے رابطہ کے دفتر کو ٹیلی فون کیا کہ دوسری گاڑی بھیج دی جائے، دوسری گاڑی ملنے پر ہم لوگ مکہ معظمہ آئے، پہلے تو پولیس کی چوکی پر رپورٹ لکھوائی کہ حادثہ میں ڈرائیور کی کوئی غلطی نہ تھی تا کہ وہ ماخوذ نہ ہو، اندازہ ہوتا ہے کہ ڈرائیور کی موٹر چلاتے وقت آنکھ لگ گئی، حجازی ڈرائیور عموماً رات کو جاگتے ہیں اور چائے پی پی کر غنودگی کو دور کرتے ہیں، شائد ڈرائیور کو وقت پر چائے نہیں ملی تھی، بہرحال اللہ تعالیٰ نے اس حادثہ میں موت سے بال بال بچایا" ولکن اللہ سلّم." (سورۂ انفال/۴۳) (کاروان زندگی حصہ دوم ص/۴۵-۴۶) (م)

وہ منبر سے تا روضہ جنت کی کیاری — اسے دیکھا گویا اِرم (۱) دیکھ آئے
لبوں پر درود و سلام مسلسل — حضور شفیع الامم دیکھ آئے
بیاں کر نہیں سکتے کیفیت اس کی — مواجہہ پر جا کر جو ہم دیکھ آئے
جسے کہتے ہیں کیف و مستی کا عالم — وہ عالم خدا کی قسم دیکھ آئے
دیارِ حرم الغرض ہم پہنچ کر
خدا کا کرم ہی کرم دیکھ آئے (۲)

سیدہ خیر النساء بہتر صاحبہ کا سانحۂ وفات

محمد میاں اپریل ۱۹۶۸ء کے اواخر یا مئی کے شروع میں ہندوستان واپس ہوئے تھے، چار مہینے بھی گزرنے نہیں پائے تھے کہ ان کو ایک عظیم خاندانی صدمہ سے گزرنا پڑا، ان کی شفیق دادی مخدومہ سیدہ خیر النساء بہتر صاحبہ (والدہ مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی) کا ۶؍رجمادی الثانیہ ۱۳۸۸ھ (۳۱؍اکتوبر ۱۹۶۸ء) کو رائے بریلی میں ان کے مکان تکیہ کلاں میں انتقال ہوگیا، ان کی عمر ۹۳؍سال تھی، اور پورے خاندان کو ان کی سرپرستی اور دعائیں اور برکتیں حاصل تھیں۔ (۳)

دوسرا سفر حجاز

۱۹۷۲ء میں حجاز مقدس کا دوسرا سفر کیا، یہ سفر "الندوۃ العالمیۃ للشباب الإسلامي" کی دعوت پر ہوا، اور انھوں نے تنہا سفر کیا، مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی لکھتے ہیں:

---

(۱) جنت۔
(۲) ملاحظہ ہو: "میزاب رحمت" مصنف کا شعری مجموعہ۔ جو مکتبۂ اسلام لکھنؤ سے حال میں شائع ہوا ہے۔ (م)
(۳) خود مولانا سید محمد الحسنی رحمۃ اللہ لکھتے ہیں:
"اماں بی ہمارے پورے خاندان کے لیے خیر و برکت سکون و طمانیت اور نورانیت و للّٰہیت کا سرچشمہ تھیں، اور ان کے جانے کے بعد خاندان کے ہر فرد نے صدق دل سے یہ محسوس کیا کہ ایک بہت بڑی دولت اس کے ہاتھ سے چھن گئی ہے، راقم سطور کی خوش نصیبی تھی کہ ان کی زندگی کے آخری ایام میں اس کو حاضری کی سعادت حاصل ہوئی۔" (ذکر خیر مؤلفہ سید مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی ص/۱۰۷) (م)

''دوسرا سفر انھوں نے تنہا ۱۹۷۲ء میں "الندوة العالمية للشباب الإسلامي" کی دعوت پر (جس کا مرکز ''ریاض'' میں ہے) کیا، اور سالانہ کانفرنس میں شرکت کی، اور حج سے فراغت کر کے واپس ہو گئے۔'' (۱)

مدرسہ ضیاء العلوم کی نظامت

شوال ۱۳۹۲ھ نومبر ۱۹۷۲ء میں ان کے آبائی وطن تکیہ کلاں رائے بریلی سے متصل گاؤں میدان پور میں مدرسہ ضیاء العلوم کا قیام عمل میں آیا، جناب محمد شرافت خاں صاحب (جو انجمن تعلیمات دین ضلع رائے بریلی کے آرگنائزر تھے) کو انچارج بنایا گیا، اور اس کے پہلے جلسہ کے موقع پر جس میں مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی، مولانا معین اللہ صاحب ندوی اور دوسرے حضرات موجود تھے، راقم الحروف بھی شریک تھا، مولوی اسحاق جلیس صاحب ندوی نے رپورٹ پیش کی اور محمد میاں کے نام کا مدرسہ کے ناظم کے طور پر اعلان کیا (۲)، اس طرح محمد میاں مدرسہ ضیاء العلوم کے ناظم اول منتخب ہوئے، لیکن انھوں نے لکھنؤ کے قیام اور دوسری مشغولیات کی وجہ سے اس منصب پر رہنا پسند نہیں کیا اور ایک سال کے مختصر عرصہ میں ہی انھوں نے اس سے سبکدوشی اختیار کر لی، اور پھر باقاعدہ طور پر مدرسہ کے ناظم ان کے بہنوئی مولانا سید محمد طاہر صاحب منصور پوری (مددگار ناظم ندوۃ العلماء) منتخب ہوئے۔ (۳)

---

(۱) تعمیر حیات محمد الحسنی نمبر

(۲) مدرسہ کے ناظم مولانا سید محمد الحسنی صاحب منتخب ہوئے، اور پہلے معتمد تعلیم کی حیثیت سے تعلیمی امور کی ذمہ داری کتاب کے مصنف مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ نے سنبھالی، ان کے انتقال کے بعد ان کے بھائی مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ معتمد تعلیم ہوئے، اور اب وہ ضیاء العلوم کے سرپرست اعلیٰ ہیں، اطال اللہ بقاءہ۔ (م)

(۳) مولانا سید محمد طاہر صاحب کا تعلق مظفر نگر میں منصور پور کے سادات بارہہ سے ہے، تعلیم مظاہر علوم میں حاصل کی، دار العلوم ندوۃ العلماء میں بھی ایک سال لگایا، پھر حضرت مولانا عبد القادر رائے پوری اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے ساتھ اس چھ رکنی وفد میں حجاز گئے جو ندوۃ العلماء کی طرف سے دعوتی مشن پر ساتھ کیا گیا تھا، ڈھائی سال گزار کر ۱۹۵۳ء میں ہندوستان واپس ہوئے، (بقیہ اگلے صفحہ پر)

حجاز مقدس کا تیسرا اور آخری سفر

محمد میاں کا حجاز کا آخری سفر ۱۹۷۴ء میں پیش آیا، جو جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے اجلاس شوریٰ کے موقع پر ہوا، یہ سفر ایک مہینہ کا تھا، یہ اس وقت کی بات ہے جب ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی نے یہ طے کیا کہ آئندہ سال ۱۹۷۵ء میں ندوۃ العلماء میں اجلاس عام کا انعقاد ہو، اور اجلاس کل ہند نہیں بین الاقوامی سطح پر منعقد ہو، اور اس کی صدا باہر بھی لگائی جائے، خاص طور پر ممالک عربیہ کے علمی و تعلیمی حلقوں کو اس میں خاص طور سے شرکت کی دعوت دی جائے، چنانچہ اس کا سلسلہ مکہ معظمہ سے شروع کیا گیا، اور رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے اس وقت کے جنرل سکریٹری شیخ صالح قزاز کو اس کی سب سے پہلے دعوت دی گئی، اس موقع پر مکہ معظّمہ میں محمد میاں موجود تھے، وہ خود اپنی کتاب ''روداد چمن'' میں لکھتے ہیں:

> ''جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، اس سلسلہ کی سب سے پہلی دعوت شیخ صالح قزاز جنرل سکریٹری رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کو دی گئی۔'' (۱)

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) اور مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی (سابق ناظم ندوۃ العلماء) کی دوسری صاحبزادی سے عقد ہوا، ۱۹۵۴ء میں ان کے صاحبزادے مولانا سید سلمان حسینی ندوی پیدا ہوئے، ۱۹۵۸ء میں ندوۃ العلماء کے شعبہ نظامت سے وابستہ ہوئے اور مددگار ناظم کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے، ۱۹۷۴ء (۱۳۹۴ھ) میں ان کے شیخ و مرشد شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب نے اجازت و خلافت سے سرفراز کیا اور ۲۰۰۱ء میں لکھنؤ میں طویل علالت کے بعد انتقال کیا، تین صاحبزادے اور ایک صاحبزادی یادگار ہیں، دوسرے صاحبزادے مولانا اسحاق حسینی ندوی نے ۱۱ر محرم الحرام ۱۴۲۷ھ کو انتقال کیا، مولانا سید محمد طاہر صاحب منصور پوریؒ نے اپنی زندگی میں ہی ضیاء العلوم کی نظامت اپنے صاحبزادے مولانا سید سلمان حسینی ندوی کے سپرد کردی تھی، وہ اس مدرسہ کے اس وقت ناظم ہیں، انھوں نے اپنی نیابت اور معاونت کے لیے مولانا محمد میاں کے ہی چھوٹے صاحبزادے مولانا بلال عبدالحی حسنی کو منتخب کرلیا تھا، وہ نائب ناظم کی حیثیت سے مدرسہ کے نگراں اور ذمہ دار ہیں۔ (م)

(۱) حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی اس سلسلہ میں اپنی خودنوشت سوانح حیات ''کاروان زندگی'' (۱۷۶/۲) میں لکھتے ہیں:

(باقی اگلے صفحہ پر)

یہ ۱۹۷۴ء کی بات ہے جب عم مخدوم و معظم مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی مدظلہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کی سالانہ مشاورتی میٹنگ میں شرکت کے لیے تشریف لے گئے، اور راقم سطور کو ہم رکابی اور رفاقت کا شرف حاصل تھا، شیخ صالح قزاز حجاز کی بزرگ و لائق صد احترام ہستیوں میں ہیں، اور ان کے فخر کے لیے یہی کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حرم مکی و مسجد نبوی کی توسیع و تعمیر کا عظیم الشان اور زندہ جاوید کام ان سے لیا ہے، اس لیے یہ اولیت اور سبقت محل تعجب نہیں بلکہ ان نسبتوں سے فال نیک اور باعث سعادت ہے۔

یہ ملاقات عشاء کے وقت ان کے دفتر تعمیرات میں ہوئی (جو حرم شریف سے بالکل متصل ہے اور جہاں سے طواف و سعی کی آوازیں بھی بالکل صاف سنائی دیتی ہیں، اور حرم کا دل فریب و ایمان افروز منظر نگاہوں کے سامنے رہتا ہے) اس میں مولانا مدظلہ، ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی (جن کی تحریک و سعی کو اس میں بڑا دخل تھا) اور راقم سطور کے سوا کوئی نہ تھا، مولانا نے اس موقع پر ان سے درخواست کی کہ ندوۃ العلماء کے اس اجلاس میں ضرور شرکت کریں، انھوں نے نہایت خندہ پیشانی و گرمجوشی سے نہ صرف یہ کہ دعوت قبول کی بلکہ پورے تعاون کا یقین دلایا، اور ایک وفد بھیجنے کا وعدہ کیا، افسوس ہے کہ وہ خود عین وقت پر اپنی علالت اور بغرض علاج سفر امریکہ کی وجہ سے شرکت نہ کر سکے،

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) ''اس وفد میں جو ان سے گفتگو کر رہا تھا، راقم سطور، عزیز گرامی ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی، عزیز القدر محمد الحسنی شامل تھے، یہ گفتگو حرم شریف سے متصل دفتر تعمیرات میں ہوئی، جہاں طواف وسعی کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں، اور حرم شریف کا دل فریب اور ایمان افروز منظر سامنے تھا۔'' ''والبلد الطیب یخرج نباته باذن ربه.'' (م)

البتہ رابطہ کے وفد نے حسب وعدہ اس میں شرکت کی، اور شیخ صالح قزاز کا وہ اہم پیغام پڑھ کر سنایا گیا جس میں انھوں نے یہ تاریخی جملہ کہا تھا کہ "ہم مولانا کو عالم عربی کے لیے ہندوستان کا تحفہ سمجھتے ہیں۔" (۱)

ندوۃ العلماء کا پچاسی سالہ جشن تعلیمی

ندوۃ العلماء کا ایک بین الاقوامی اجلاس عام جس کی ضرورت متعدد پہلوؤں کے پیش نظر عرصہ سے محسوس کی جارہی تھی، اور دس بارہ سال سے اس کا احساس اور زیادہ پیدا ہونے لگا تھا، آخر کار ۱۹۷۴ء میں ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی نے اس کی منظوری دی، اور نومبر ۱۹۷۵ء میں اس کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا، محمد میاں نے اس کو بین الاقوامی طور پر مؤثر اور مفید بنانے میں پورا حصہ لیا، اور اپنے عم محترم مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کا، ان کے دوسرے معاونین (خصوصاً مولانا معین اللہ ندوی نائب ناظم ندوۃ العلماء اور مولوی اسحاق جلیس ندوی، مولوی سعید الرحمٰن ندوی، اور عزیزان مولوی سید محمد رابع ندوی و مولوی محمد واضح حسنی وغیرہ) کے ساتھ ہاتھ بٹایا، محمد میاں کی دلچسپی اس میں صرف قلمی و تحریری نہیں تھی، وہ متعدد جہات سے دلچسپی لے رہے تھے، انھوں نے مولوی اسحاق جلیس ندوی کے ساتھ مل کر ایک علمی نمائش بھی لگائی جو بڑی جاذب نظر تھی، ندوۃ العلماء کی عمارتوں کے حسن و تزئین پر بھی نظر رکھی، اس تعلق سے "روداد چمن" سے ان کا ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"یہاں اس راز کا انکشاف شاید دلچسپی سے خالی نہ ہو کہ عین

---

(۱) روداد چمن از مولانا محمد الحسنی ص/۲۱-۲۲

(سعودی عرب کے اس مؤقر وفد میں جو ممتاز شخصیتیں شریک ہوئیں ان میں ایک اہم نام شیخ صالح الحصین کا بھی ہے، جو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی اور ندوۃ العلماء کے نہایت خیر خواہ اور ہمدردوں میں ہیں، اور بڑا قدیم اور مخلصانہ و محبانہ تعلق رکھتے تھے، کئی سال رئیس الشؤون الحرمین الشریفین کے اعلیٰ منصب پر فائز رہ کر دونوں حرموں حرم مکی و حرم مدنی کے انتظامی کاموں کی پوری نگرانی فرمائی، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔ (م)

اجلاس کی اس ہماہمی اور تعمیر کے جوش و خروش میں جب وقت سے ایک کشمکش جاری تھی، اور ”کام بہت اور مہلت کم“ کا عالم تھا، راقم الحروف نے صوفی انعام اللہ صاحب (۱) سے ذکر کیا کہ یہ برجیاں ایک نو تعمیر گنبد کی منتظر ہیں، انھوں نے کہا کہ اگر کوئی صاحب خیر و صاحب عزیمت اس کا بار اٹھالیں تو یہ کام اب بھی ہوسکتا ہے، اس لیے کہ مولانا اس کے حق میں نہیں ہیں کہ تعمیرات کی مد میں ذرا بھی بلاضرورت صرف کیا جائے، ہم لوگ مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی کے پاس گئے، اور اس وقت ہماری ایک خفیہ میٹنگ (جس میں راقم الحروف، صوفی صاحب، مولانا عبداللہ عباس ندوی اور مولانا اسحاق جلیس ندوی کے سوا اور کوئی نہ تھا اور جس کا راز آج تک کسی کو معلوم نہیں) منعقد ہوئی، مولانا عبداللہ عباس ندوی نے کہا کہ اس کا ذمہ میں لیتا ہوں، لیکن اس وقت صرف پانچ ہزار کا انتظام کیا جاسکتا ہے، باقی رقم میری واپسی کے بعد مل سکتی ہے، راز رکھتے ہوئے اس کا انتظام وقت کی تنگی کے ساتھ کوئی آسان کام نہ تھا، ورنہ شاید یہ ”مبارک سازش“ کامیاب ہوجاتی، اور یہ کارنامہ بھی مولانا عبداللہ عباس ندوی اور صوفی صاحب کے نامۂ اعمال میں لکھا جاتا۔“ (۲)

یہ بین الاقوامی اجلاس ۲۵ تا ۲۸ رشوال ۱۳۹۵ھ (۳۱ راکتوبر تا ۳ رنومبر ۱۹۷۵ء) ندوۃ العلماء کے پرفضا میدان میں منعقد ہوا، اور بڑی کامیابیوں کے ساتھ اختتام پذیر

---

(۱) صوفی انعام اللہ صاحب لکھنؤ کے ایک مرد درویش تھے، اپنی نوجوانی خانقاہ رائے پور (سہارنپور) میں حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہ کے زیر تربیت گزاری اور بڑے مجاہدات کیے اور اپنے شیخ کے مجاز بیعت ہوئے، ۹ رربیع الاول ۱۴۲۰ھ (۱۹۹۹ء) کو ۷۲ سال کی عمر میں مختصر علالت کے بعد لکھنؤ میں وفات پائی، ندوۃ العلماء سے بڑا تعلق تھا اور اس کے مسائل میں دلچسپی لیتے تھے۔ (م)

(۲) روداد چمن از مولانا محمد الحسنی ص/۵۰-۵۱ (۳) تعمیر حیات محمد الحسنی نمبر/۱۵۷-۱۵۸

ہوا(۳)، محمد میاں نے مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کے ایماء پر اس کی نہایت جامع مؤثر اور ادبی روداد لکھی جو "روداد چمن" کے نام سے شائع ہوئی، اجلاس کی ایک خاص بات یہ تھی کہ داعی اجلاس مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی نے خطبہ استقبالیہ اصلاً عربی زبان میں تیار کیا تھا، جس کا بڑا ہی رواں اور فصیح ترجمہ محمد میاں نے اردو میں کیا، مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی لکھتے ہیں:

> "انھوں نے میرے عربی خطبۂ استقبالیہ کا ترجمہ اردو میں اس طرح کیا تھا کہ بعض جگہ وہ عربی سے بھی بڑھ گیا تھا، شعر کی جگہ شعر رکھنا، اور ہندوستانی ومقامی ماحول کی رعایت سے ان الفاظ کا انتخاب، بڑی سبک دستی بلکہ چابک دستی کا کام تھا۔
>
> انھوں نے روداد مرتب کی، اور گویا الفاظ میں ریکارڈنگ کا کام اس طرح کیا کہ پڑھنے والے کو دل کی دھڑکنیں، ذہن کے اندیشے، انبساط کی کیفیت اور سانس کی آواز بھی سنائی دے، جب یہ روداد "روداد چمن" کے نام سے شائع ہوئی تو مخدومی مولانا عبدالماجد دریابادی علیل اور بڑی حد تک معذور ہو چکے تھے، انھوں نے کتابوں پر مختصر تبصرہ کرنا بھی چھوڑ دیا تھا، لیکن "روداد چمن" انھوں نے خود مطالعہ فرمائی، اور اس پر ایسا تبصرہ کیا جو عرصہ سے انھوں نے کسی کتاب پر نہیں کیا تھا، ان کا یہ جملہ بڑا معنی خیز اور پوری عبارت کا قائم مقام ہے کہ "مصنف نے پروپیگنڈہ کو لٹریچر بنادیا۔" آج بھی کتاب موجود ہے اور اس میں مصنف کے قلم کی مصوری کا کمال دیکھا جا سکتا ہے۔"(۱)

ایک خاندانی صدمہ

ادھر اجلاس کی کامیابی کی خوشیاں تازہ تھیں کہ محمد میاں کی پھوپھی صاحبہ اور راقم

(۱) تعمیر حیات محمد الحسنی نمبر ۱۵۸

السطور کی خالہ سیدہ امۃ اللہ تسنیم جو علمی و دینی حلقوں میں اپنی کتابوں ''قصص الانبیاء''، مناجاتوں کے مجموعہ ''باب کرم''، ''ریاض الصالحین'' کے ترجمہ ''زادسفر'' اور اپنے مقالات ومضامین کے ذریعہ معروف ہیں، اچانک شدید علیل ہوئیں اور مختصر علالت کے بعد ۲۸؍جنوری ۱۹۷۶ء کو وفات پاگئیں، رحمها الله تعالىٰ رحمة واسعة وغفرلها، اس حادثہ نے پورے خاندان کو ہلا کر رکھ دیا۔

پہلی عربی تصنیف ''الإسلام الممتحن''

محمد میاں کی یہ پہلی عربی تصنیف ہے، جو ہندوستان میں سب سے پہلے دارعرفات رائے بریلی سے شائع ہوئی، اور باہر کے ممالک میں سب سے پہلے قاہرہ سے شائع ہوئی، یہ البعث الاسلامی میں ان کے قلم آبشار (۱) سے نکلے اداریوں اور مضامین کا ایک انتخاب ہے جو خود انھوں نے کیا، محمد میاں کو اس کتاب کی اشاعت کا بڑا تقاضا تھا، اس سلسلہ میں ان کی فکر اور شوق کا ان خطوط سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے جو انھوں نے قاہرہ میں مقیم دارالعلوم ندوۃ العلماء کے استاد مولوی عبدالنور ندوی (۲) اور مولوی نذرالحفیظ ندوی (۳) کو تحریر کیے ہیں، اپنے ایک خط میں جو مولوی نذرالحفیظ ندوی کے نام ہے، وہ تحریر کرتے ہیں:

> ''آپ کا عنایت نامہ بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں بشارت نامہ بہت سی خوش کن خبریں لیے ہوئے تھا، افسوس ہے اور ندامت کہ پھر تاخیر کے ساتھ جواب دے رہا ہوں، حالانکہ یہ موقع تاخیر کا نہ

---

(۱) مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے ان کے قلم کو آبشار سے تعبیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مادہ پرستانہ زندگی نے ان کی طبیعت کے اندر ایک شدید کشمکش پیدا کردی اور ان کے قلم کو ایک ایسے آبشار میں تبدیل کردیا جو چٹانوں سے ٹکرانے کی وجہ سے ابلتا ہے اور بڑے جوش وشور کے ساتھ گرتا ہے، اس کے نتیجہ میں ایسے مضامین ان کے قلم سے نکلے جن میں آبشار کا شور اور طوفان کا زور ہے۔ (تعمیر حیات محمد الحسنی نمبر/۱۶۷)

(۲) مولانا عبدالنور (نور عظیم) ندوی نے تدریس وصحافت کے ذریعہ دین کی خدمت کی، بڑی صلاحیتوں کے مالک بنے، تفصیلی حالات کے لیے ملاحظہ ہو: ''پرانے چراغ'' حصہ سوم از مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ۔ (م)

(۳) مولانا نذرالحفیظ ندوی عمید کلیۃ اللغۃ العربیۃ وآدابہا دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ (م)

تھا، اللہ تعالیٰ معاف فرمائے۔

کتاب کا جو استقبال ہوا وہ ظاہر ہے کہ مصنف اور کتاب دونوں کی حیثیت سے زیادہ تھا، اس میں خدا کے فضل خاص اور شان ستاری کے سوا کتاب کی تقدیم اور آپ حضرات کے خلوص ومحبت اور محنت وتگ ودو کو بھی بہت دخل ہے، اس کا بدلہ اللہ تعالیٰ آپ کو دنیا وآخرت میں بہترین عطا فرمائے۔

خوشی ہوئی کہ کتاب اچھی اور دل نواز چھپی، چچا میاں مدظلہ تو اس کو دیکھ کر اس قدر مسرور ہوئے کہ بیان کرنا مشکل ہے، پہلا نسخہ ان ہی کے ہاتھ میں پہنچا تھا، فالحمد لله علىٰ ذلك حمداً كثيراً طيباً مباركاً فيه۔''(۱)

ایک دوسرے خط میں یوں رقمطراز ہیں:

''عزیزی سلمان سلمہ(۱) کا خط آیا کہ کتاب مکتبة المهيمن (ریاض) میں مل گئی، کچھ نسخے خرید کر دوستوں اور اہم اشخاص کو دیے، لیکن برادر مکرم طارق حسن عسکری (۲) سے معلوم ہوا کہ دوبارہ کتاب کو پوچھنے گئے تو معلوم ہوا کہ ختم ہو چکی ہے، اب پھر تعطل اور انتظار کی کیفیت ہے۔''(۳)

---

(۳) تعمیر حیات محمد الحسنی نمبر/۲۸۳-۲۸۴

(۱) مولانا سید سلمان حسینی ندوی استاذ حدیث وعمید کلیۃ الدعوۃ والاعلام دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ مکتوب نگار کے بھانجے اور مولانا ڈاکٹر سید عبد العلی حسنیؒ کے نواسے ان دنوں دار العلوم ندوۃ العلماء سے تکمیل علوم کے بعد ریاض سعودی عرب میں جامعہ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ میں ماجستر میں زیر تعلیم تھے، اپنے علم وفضل اور زور خطابت میں شہرت رکھتے ہیں، پہلے ہندوستان کے شہروں اور دیہاتوں کے خوب دعوتی دورے کیے اور اب دنیا کے ملکوں میں پھر پھر کر خدمت دین کا کام انجام دے رہے ہیں۔(م)

(۲) سید حسن عسکری طارق صاحب قادری مقیم مدینہ منورہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے اور ان کے خاندان کے مخلص ترین لوگوں میں ایک، مدینہ منورہ میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ کی خدمت کی اور ان کے مخصوص احباب میں جگہ بنالی۔(م)

(۳) تعمیر حیات محمد الحسنی نمبر/۲۹۲

الإسلام الممتحن کی عالم عربی میں بڑی پذیرائی ہوئی، اس اہم تصنیف کے علاوہ محمد میاں نے مصر تتنفس، إلی القیادة العالمیة، المنهج الإسلامی السلیم، تناقض تحار فیه العیون، الإسلام بین لا ونعم بھی تصنیف کیں، مگر یہ ان کی زندگی میں چھپ کر نہ آسکیں۔

"السیرة النبویة" کا ترجمہ "نبی رحمت"

محمد میاں کو اپنے عم مکرم مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی سے غیر معمولی تعلق اور لگاؤ تھا، اس کے نتیجہ میں انھوں نے ان کی تحریروں کو بار بار پڑھا اور اتنا پڑھا کہ وہ اسی انداز میں سوچتے اور اسی انداز میں لکھتے، فرق کرنا مشکل ہوتا کہ کہاں چچا نے چھوڑا ہے اور کہاں بھتیجے نے شروع کردیا، جب مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کی کتاب "السیرة النبویة" سامنے آئی تو انھوں نے اپنے لیے یہ بڑی سعادت سمجھی کہ اس کو اردو میں منتقل کرنے کا کام شروع کریں، چنانچہ انھوں نے اس کام کے لیے اپنے کو ایسا یکسو کرلیا کہ اس کو پورا کرکے ہی دم لیا، ان کا یہ ترجمہ "نبی رحمت" کے نام سے شائع ہوا، اور خوب مقبول ہوا، مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی لکھتے ہیں:

> "عربی سے اردو میں ترجمہ کی خدمت مصنف کے لختِ جگر، قرۃ عین برادر زادۂ عزیز سید محمد الحسنی مدیر "البعث الاسلامی" نے بڑے شوق اور پورے آداب کے ساتھ انجام دی، یہ ان کے ترجمہ کے سلسلہ کی آخری کڑی تھی، اس کی طباعت کے بعد وہ زیادہ دن اس دنیا میں نہیں رہے، اور ان پر ہندوستان میں "سیرت نبویؐ" کے مصنف عظیم علامہ سید شبلی نعمانی کا یہ شعر صادق آتا ہے ؎
>
> مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتم
> خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

پاکستان کا دوسرا سفر اور ایشیائی کانفرنس میں شرکت

محمد الحسنی (محمد میاں) نے جولائی ۱۹۷۸ء میں پاکستان کا دوسرا سفر کیا، اور اپنے عم مکرم مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کے ہمراہ ملک کے مختلف حصوں کا دورہ کیا، ہر طبقہ اور ہر خیال کے لوگوں سے ملاقاتیں کیں، وہاں کے حالات کا جائزہ لیا، جماعتوں اور افراد کے طرز عمل، کردار و اخلاق، فکر و ذوق اور سیاسی، علمی، دینی خدمتوں کا مطالعہ کیا، اس ملک میں پھر محمد الحسنی نے کچھ امیدیں پائیں اور کچھ اندیشے محسوس کیے، انتخاب کی ہماہمی، جماعتوں میں آپس کے مقابلے اور اختلاف آراء اور ان کے منشور کو دیکھا اور پڑھا، اور پھر واپس آکر روزنامہ ''جنگ'' کراچی کی فرمائش پر ایک مضمون لکھا، جس میں پاکستان کے حالات کا پورا تجزیہ کیا ہے، وہ تجزیہ بڑا بے باک، بے لاگ ہے، جو گرفت کی ہے وہ بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے، پورے مضمون کا نقل کرنا طوالت کا باعث ہوگا، اس مضمون کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے!

> ''شعبان ۱۳۹۸ھ مطابق جولائی ۱۹۷۸ء میں ہم لوگوں کو اسلامی ایشیائی کانفرنس میں شرکت کا موقع ملا، کانفرنس کے اختتام کے بعد اس ملک کو پہلی بار اچھی طرح دیکھنے کی نوبت آئی، اس سفر میں اللہ تعالیٰ کی جو تائید و نصرت نظر آئی اور ہمارے دوستوں، بھائیوں، بزرگوں اور کرم فرماؤں نے جس غیر معمولی تعلق و محبت اور تعاون و ہمدردی کا مظاہرہ کیا، اس کے ذکر سے میں ان کے بے پایاں خلوص، ان کے امنڈتے ہوئے جذبات اور ان کے لطیف و نازک احساسات کو مجروح نہ کروں گا، اور ان کی اَن کہی کہانیوں کا پردہ فاش نہ کروں گا، جو صرف دل و نگاہ کی زبان سے کہی جاتی اور گوش دل سے سنی جاتی ہیں، اس لیے کہ بقول جگر مرادآبادی:

''نغمہ وہی نغمہ ہے کہ جس کو روح سنے اور روح سنائے''

اس سفر میں تجربہ کار و باعمل نوجوان، حوصلہ منداور جواں ہمت بزرگ، دردمند اور باشعور رہنما، سرفروش وسادہ دل عوام لیکن اسی کے ساتھ مختلف جگہوں پر پھیلے ہوئے دام تزویر، اور زمیں دوز کمین گاہیں اور بارودی سرنگیں بھی نظر آئیں جو سوسائٹی کے مختلف طبقوں میں بچھائی گئی تھیں، پھیلائے ہوئے زہر کے باقی ماندہ اثرات اورصوبائی، لسانی اور قبائلی تعصّبات کی بو بھی محسوس کی، ایمان واخلاص کے دل نواز جھونکے بھی فضا کو کبھی کبھی معطر کرتے ہوئے اور سنجیدگی اور شعور کی کچھ لہریں بھی سطح آب سے ابھرتی ہوئی دیکھیں، مسجد میں شکست ریختہ تسبیح شیخ اور بت کدہ میں برہمن کی پختہ زناری بھی دیکھی، امیدوں کے شعلہ افروز چراغ اور باد مخالف کے تندو تیز تھپیڑے بھی دیکھے، زندگی اور زندہ دلی بھی دیکھی، حیوانیت اور درندگی بھی، ہمدردی وانسانیت بھی، خودغرضی اور نفسانیت بھی، اسلامیت اور مغربیت بھی اور پالیسی بیوروکریسی کی سخت کشمکش، اور معاشرے کا فساد اور ماحول کا بگاڑ بھی، اور مرد درویش کے انداز خسروانہ بھی جس کو ایک ترجمان حقیقت نے اس بلیغ انداز میں بیان کیا ہے ؎

کرم تیرا کہ بے جوہر نہیں میں
غلام طغرل و سنجر نہیں میں
جہاں بینی مری فطرت ہے لیکن
کسی جمشید کا ساغر نہیں میں (۱)

مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی، محمد میاں کے اس آخری سفر کے متعلق

(۱) محمد الحسنی انتخاب نمبر (رضوان لکھنؤ) مرتبہ از مصنف

رقمطراز ہیں:

''۶، ۷ر جولائی ۱۹۷۸ء کو رابطہ عالم اسلامی کی طرف سے کراچی میں پہلی اسلامی کانفرنس منعقد ہو رہی تھی، اس وقت میں حجاز میں تھا، مجھے معلوم ہوا کہ محمد میاں کے نام بھی دعوت نامہ گیا ہے، میری بڑی خواہش تھی اور میں نے اس کے لیے حرم شریف میں دعا کی تھی کہ وہ اس کی شرکت کے لیے آمادہ ہو جائیں اور پاکستان کے سفر و قیام میں ان کا ساتھ ہو، اللہ نے یہ دعا قبول کی، اور مولانا محمد منظور نعمانی کی معیت میں وہ عین وقت پر پہنچ گئے، اس کانفرنس سے فراغت کے بعد وہ میرے ساتھ پاکستان کے مختصر دورے میں شریک رہے، فیصل آباد، اسلام آباد، راولپنڈی، سرگودھا، اکوڑہ خٹک اور لاہور کے سفر میں ساتھ رہا، اس سفر میں وہ اپنے مرشد حضرت مولانا رائے پوری کے وطن و مدفن ڈھڈیاں بھی گئے، دو دن وہاں قیام رہا، ہندوستان آکر انھوں نے اپنی بہنوں سے کہا کہ یہی سفر کا حاصل تھا، اور جو سکون وہاں نصیب ہوا، پورے سفر میں نصیب نہیں ہوا۔

اس موقع سے ان کے دور افتادہ عزیزوں نے بھی ان کو دیکھ لیا، جنھوں نے ان کو دیکھا نہیں تھا اور ان کے نام اور قابلیت کی شہرت سنتے تھے، اس سفر میں انھوں نے اس کی ادنیٰ کوشش بھی نہیں کی کہ وہ اپنے کو نمایاں کریں یا کہیں کوئی مضمون پڑھیں اور تقریر کریں، انھوں نے اس پورے سفر میں اپنے کو ایک معمولی رفیق اور شریک قافلہ سے زیادہ نہیں سمجھا اور ہر جگہ چھوٹے بن کر رہے۔''(۱)

---

(۱) تعمیر حیات محمد الحسنی نمبر/۱۶۰

محدث شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کی ندوۃ تشریف آوری اور محاضرات

مئی ۱۹۷۹ء کے آخری ہفتہ میں ریاض کی جامعۃ الامام محمد بن سعود کی طرف سے استاد زائر Visiting Prophesier کی حیثیت سے شام کے مشہور محدث و عالم علامہ شیخ عبدالفتاح ابوغدہ (۱) جو جامعۃ الامام میں استاذ حدیث ہیں، دارالعلوم میں دو ہفتہ کے لیے اسلامی موضوعات پر لکچر دینے کے لیے تشریف لائے تو محمد میاں نے ان کے محاضرات سے استفادہ کے لیے اپنا قیمتی وقت فارغ کیا، اور ایک طالب علم کی طرح وہ اپنا پورا وقت اس کے لیے دیتے، اور بڑے ذوق وشوق سے محاضرات سنتے، اور یہ چاہتے کہ دوسرے بھی اسی طرح اپنا وقت فارغ کریں اور استفادہ کریں، مولوی سعیدالرحمٰن صاحب مدیر ''البعث الاسلامی'' لکھتے ہیں:

> ''مولانا مرحوم نے اپنا پورا وقت ان کے لکچروں سے استفادہ کرنے میں ایک طالب علم کی طرح گزارا، اور وہ صبح سے شام تک دارالعلوم میں رہا کرتے تھے، میں کسی وقت ''البعث'' کے

---

(۱) شیخ عبدالفتاح ابوغدہ رحمۃ اللہ کی ندوۃ العلماء یہ پہلی آمد نہیں تھی اس سے پہلے بھی وہ تشریف لائے، پہلی بار ان کی تشریف آوری تبلیغی جماعت کے ساتھ ہوئی تھی جب ان کی جماعت اواخر اگست ۱۹۶۲ء میں نظام الدین دہلی آئی اور وہاں دیوبند، سہارنپور اور لکھنؤ بھی آئی تھی، ان کے متعلق مولانا سید محمد ثانی حسنی (مصنف کتاب) سوانح مولانا محمد یوسف کاندھلوی ص/۳۴۲ میں لکھتے ہیں:

''شیخ عبدالفتاح ابوغدہ شام کے ممتاز حنفی علماء میں ہیں، ان کو علامہ محمد زاہد الکوثری سے تلمذ و استفادہ کا شرف حاصل ہے، فخر المتأخرین مولانا عبدالحی فرنگی محلی کی تصنیفات سے خاص شغف ہے، ہندوستان کے اس سفر کے دوران انھوں نے براہ راست معلومات اور ان کی تحریر کے عکس لیے اور شام واپس جا کر ان کی متعدد تصنیفات بڑی تحقیق واعتناء سے شائع کیں۔''

شیخ عبدالفتاح ابوغدہ بعد میں ہندوستان تشریف لائے، ان کا ہندوستان کا آخری سفر نومبر ۱۹۹۲ء کو ہوا، جس میں وہ رائے بریلی اور ہتھوڑا باندہ بھی تشریف لے گئے اور علماء وطلبہ کو حدیث کی اجازت دی، ان کی ان مجلسوں میں شریک ہونے والے ممتاز علماء ومشائخ میں لکھنؤ میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی اور ہتھوڑا باندہ میں حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد باندوی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، ۱۹۹۷ء کو ریاض میں وفات پائی اور مدینہ منورہ میں جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔ (م)

پروف وغیرہ کی اصلاح میں مشغولیت کے باعث درس میں نہ پہنچ سکا تو وہ گرفت کرتے تھے کہ تم کہاں رہ گئے؟ شیخ ۵؍جون ۱۹۷۹ء کو واپس تشریف لے گئے تو ہم سب لوگ ساتھ ہی ہوائی اڈہ ان کو رخصت کرنے گئے۔"(۱)

انابت الی اللہ

محمد میاں کی زندگی میں انابت الی اللہ، احتساب نفس، استحضار نیت اور اخلاق و تواضع کے پہلو شروع سے ہی ہویدا تھے، مگر وفات سے کچھ سال پیشتر سے ان میں یہ اوصاف نمایاں طور پر محسوس کیے جانے لگے تھے، دیر دیر تک مسجد میں بیٹھنا، لوگوں کے اختلاط سے پرہیز اور کسر نفسی وغیرہ بڑھ گئی تھی، اور اصلاح باطن کے لیے اصحاب قلوب سے رابطہ اور دین کے غلبہ کے لیے بے چینی میں اضافہ ہو رہا تھا، اس سلسلہ میں ان کے ہی ایک ساتھی اور بھائی برادر عزیز مولوی محمد واضح کے ایک مضمون سے اقتباس پیش کیا جا رہا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"شہرت و ناموری سے ان کو کوئی مناسبت نہیں تھی، ان کے مقالات پڑھنے والے اور ان کی شخصیت اور فکر سے متاثر ہونے والے ان سے ملاقات کے شائق ہوتے مگر وہ اکثر ملاقاتوں سے گریز کرتے، تواضع اور انابت الی اللہ کے ساتھ اپنے کام میں مصروف رہتے، ہمیشہ اپنی نیت کا محاسبہ کرتے رہتے اور ہر طرح کی آلودگی سے اس کی حفاظت کرتے۔

چند سال پہلے صالحین اور مجاہدین کی سیرت کے مطالعہ سے ان پر اس احتساب کا ایسا غلبہ ہوا کہ انھوں نے تزکیہ و تربیت نفس کے خاطر لوگوں کے ساتھ زیادہ اختلاط سے اجتناب کا ارادہ کر لیا تھا،

---

(۱) تعمیر حیات محمد الحسنی نمبر/۲۴۲۔

ان کے ذہن میں اکثر یہ سوال پیدا ہوتا اور مجھ سے اکثر تذکرہ کرتے، ایک روز مجھ سے کہنے لگے: تاریخ میں صرف ان ہی حق پرستوں کی اصلاحی خدمات کا تذکرہ ملتا ہے جنھوں نے اپنی زندگی کا ایک عرصہ اپنے نفس کی تربیت و اصلاح میں گزارا، دعوت کا مرکز داعی کا قلب ہے، اس لیے اس کے دل کو آئینہ کی مانند صاف وشفاف ہونا چاہیے۔ ان کو اہل حق اور اہل قلوب سے بہت تعلق اور قلبی مناسبت تھی، ان کی خدمت میں وقت گزارنے اور استفادہ کرنے کی جستجو رہتی، خاص اوقات میں خاص طور سے بعد مغرب اکثر گھنٹوں تدبر وفکر میں گزارتے، اصلاح نفس، اخلاص عمل اور حسن نیت کے لیے ہر وقت کوشاں رہتے تھے، اور اپنے ساتھیوں اور عزیزوں کو بھی اسی رنگ میں دیکھنا چاہتے تھے، لغویات سے اجتناب کرتے، با ہم طنز و مزاح خواہ وہ صرف تفریح ہی کے لیے کیوں نہ ہو اور عیب جوئی سے احتراز کرتے، اور اپنے رفقاء کو اس کی طرف متوجہ کرتے، اگر وہ کسی مجلس میں ہوتے اور لوگ ایسی گفتگو شروع کرتے جو ان کے ذوق و وجدان پر گراں ہوتی تو وہ خود ہی اس مجلس سے خاموشی سے یا کوئی عذر پیش کر کے اٹھ جاتے یا خاموشی اختیار کر لیتے، اس طرح اکثر گفتگو کا رخ بدل جاتا اور کسی کی دل شکنی بھی نہ ہوتی۔''(۱)

ایک یادگار مکتوب

محمد میاں نے وفات سے صرف ہفتہ پہلے شیخ وقت حضرت مولانا محمد احمد پرتاپ گڑھی کی خدمت میں ایک مکتوب روانہ کیا، حضرت مولانا محمد احمد صاحب کی محمد میاں پر

(۱) تعمیر حیات محمد الحسنی نمبر/۲۴۷۔

بڑی شفقتیں اور عنایتیں تھیں، انھیں ان کی اس وقت اور توجہات حاصل ہوئیں جب انھوں نے ان کے مجموعہ کلام کی ترتیب واشاعت کی خود ذمہ داری لی، عناوین لگائے اور کتاب کا نام ''عرفان محبت'' تجویز کیا، جسے حضرت مولانا نے پسند فرمایا اور سبھی نے ان کے حسن ذوق کی داد دی، حسب ذیل خط میں اس دیوان کے متعلق بھی ضروری باتیں آ گئی ہیں اور جلدی اشاعت کی خوش خبری بھی دی ہے، وہ خط یہ ہے:

''مخدوم گرامی زیدت مکارمہ وامجادہ والطافہ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اللہ تعالیٰ سے دست بہ دعا ہوں کہ جناب والا ہر طرح بخیر و عافیت ہوں اور تمام تکلیفات زائل ہوگئی ہوں، عرصۂ دراز سے کوئی عریضہ خدمت بابرکت میں ارسال نہ کرسکا، معافی کا خواستگار ہوں، آنے والوں سے الحمد للہ خیریت ملی اور طبیعت کو اطمینان رہا، دو ایک روز جو خدمت میں گزرے، اس سے خدا کا شکر ہے بڑا فائدہ ہوا، یہ خیال رہا کہ کتاب کا کوئی مرحلہ طے ہوجائے تو اطلاع دی جائے، لیکن اس میں خاصی تاخیر ہوئی، کچھ روز ہوئے نمونہ کے طور پر ایک آدھ صفحہ سامنے آیا، لیکن اندازہ ہوگیا کہ زیادہ تاخیر کا اندیشہ ہے، اس لیے رائے یہ ہوئی کہ دہلی بھیجا جائے، وہاں بھی ہم لوگوں کا کام ہوتا ہے اور نسبتاً جلدی ہوتا ہے، امید ہے کہ ان شاء اللہ چند روز کے اندر دیوان کا تصحیح شدہ نسخہ دہلی روانہ ہوجائے گا، کسی قدر کتابت ہوجائے تو اس کی تصحیح کر کے پھر جناب والا کی خدمت میں ارسال کیا جائے گا، خدا کرے جلدی کام ہو اور اچھا ہو۔

جناب کی توجہ اور دعاؤں کا حسب دستور محتاج ہوں اور میری خوش نصیبی ہے کہ اس سے محروم نہیں ہوں، اور الحمد للہ اس کا اثر

پاتا ہوں، اپنے کو دیکھتا ہوں اور حضرت کی شفقتوں اور الطاف کو تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ:

کلاہ گوشۂ دہقاں بآفتاب رسید

اللہ تعالیٰ کی ذات عالی سے قوی امید ہے کہ ان توجہات عالیہ کا خاطر خواہ اثر اور ثمرہ ظاہر ہوگا کہ:

مستحق کرامت گناہ گاراند

یہاں سب بھائی، بزرگ اور اہل خانہ اور بچے مؤدبانہ سلام عرض کرتے ہیں اور امیدوار عنایت و دعا ہیں۔

برادرم سید محمد واضح یہیں موجود ہیں اور خاص طور پر سلام عرض کررہے ہیں اور دعاؤں کی درخواست۔

وہاں سب حضرات بالخصوص مخدومی مولانا لئیق صاحب، کامل صاحب، مولانا قمر الزماں صاحب زید مجدہ اور مولانا عمار، ڈاکٹر صلاح الدین و برادرم سرفراز وغیرہم کی خدمت میں سلام عرض ہے۔

خادم
محمد الحسنی

۱۰ رجب ۱۳۹۹ھ / ۷ جون ۱۹۷۹ء"(۱)

---

(۱) مولانا سید محمد الحسنی رحمۃ اللہ کو بزرگوں اور مشائخ و اصحاب قلوب سے بچپن سے ہی تعلق رہا، جس کا سلسلہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ سے ہوتا ہے، جن کی ان کے گھر آمد و رفت رہتی اور وہ ان کے والد کے مہمان ہوا کرتے، ان کی وفات کے بعد ان کی سوانح لکھنے کا انھوں نے پروگرام بنایا اور اس کام کا آغاز بھی کردیا تھا، بیعت وہ حضرت مولانا شاہ عبد القادر رائے پوری سے ہوئے، اور خاطر خواہ استفادہ بھی کیا، ان کے انتقال کے وقت بھی وہ لاہور میں ان کے پاس موجود تھے، حضرت شاہ وصی اللہ صاحب، حضرت مولانا عبد الشکور فاروقی، مولانا محمد یوسف کاندھلوی سے بھی انھیں نیاز مندانہ تعلق تھا، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی اور حضرت مولانا محمد احمد پرتاپ گڑھی سے عقیدت و محبت تھی، اور ان کے بعض کاموں میں حصہ لے کر توجہات اور دعائیں بھی حاصل کیں، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

(باقی اگلے صفحہ پر)

دو اہم سفروں سے معذرت

محمد میاں کو ان دو چیزوں سے جو شخصیت کی تاثیر، ہمہ گیریت اور زیادہ افادیت ثابت کرنے کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہیں کبھی مناسبت نہ رہی، ایک سفر، دوسرے تقریر، اس لیے انھوں نے وہی سفر کیے جو بہت زیادہ ضروری تھے، ایک تو حجاز کے سفر کہ حج اور عمروں کی سعادت حاصل ہوگی، دوسرے پاکستان کے دو سفر جس میں ایک میں تو اپنے شیخ و مرشد حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری کی خدمت میں حاضری مقصود تھی، اور دوسرا بین الاقوامی مسلم ایشیائی کانفرنس میں شرکت کے لیے تھا جس کے لیے ان کے عم مکرم مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کا شدید تقاضا تھا کہ یہ اس میں شریک ہوں، اللہ نے محمد میاں میں جو محاسن و کمالات جمع کیے تھے ان سے دوسروں کے استفادہ کے لیے یہ دو چیزیں بڑی معاون ہوتیں، ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین صاحب قریشی نے اپنے اسی تعلق کی بنا پر لکھا ہے کہ:

''اگر ان میں دو کمزوریاں نہ ہوتیں، تو وہ اپنی کم عمری میں دنیائے

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) ''اپنے مرشد (حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری) کے علاوہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی سے عقیدت و محبت تھی، متعدد بار وہ رمضان المبارک میں سہارنپور جاکر ان کی صحبت اور ان کی مبارک مجالس میں شرکت سے مستفید ہوئے، حضرت شیخ کی مشہور کتاب فضائل نماز کا عربی میں ترجمہ بھی کیا جو ''الصلوٰۃ و مکانتھا فی الإسلام'' کے نام سے چھپی، جس سے حضرت کی دعائیں ان کو حاصل ہوئیں اور تبلیغی جماعت کے عرب حلقوں نے اس سے فائدہ اٹھایا، آخری دور میں ان کو حضرت مولانا محمد احمد پھولپوری سے بڑا تعلق ہو گیا تھا، اور مولانا کی بھی ان پر خصوصی نگاہ و شفقت تھی، مولانا کے عارفانہ کلام کو جمع و مرتب کرنے میں خاص طور پر ان کی تحریک شامل تھی، اور ان ہی کے بار بار تقاضے سے ''عرفان محبت'' کے نام سے مجموعہ مرتب ہوا، جس کے عناوین ان ہی کے تجویز کیے ہوئے ہیں، مولانا کی خدمت میں وہ وقتاً فوقتاً حاضر بھی ہوا کرتے تھے، مولانا کو ان کی وفات کا بڑا صدمہ ہوا، ان کی مجلسوں میں اب بھی ان کا برابر تذکرہ ہوتا ہے۔'' (تعمیر حیات خصوصی نمبر/ ۱۵۹)

افسوس کہ حضرت مولانا محمد احمد صاحب پھولپوری نے بھی ۱۹۹۱ء کو الہ آباد میں انتقال کیا اور تدفین عمل میں آئی، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔ (تفصیلی حالات کے لیے ملاحظہ ہو ''نمونہ سلف نقوش وتأثرات'' مرتبہ مولانا شمس الحق ندوی ایڈیٹر ''تعمیر حیات''، لکھنؤ) (م)

اسلام کی سحر انگیز، ممتاز ترین اور طاقتور ترین شخصیت کی حیثیت
سے ابھرتے، اور پورے عالم اسلام پر چھا جاتے، ایک سفر
کرنے سے وحشت، دوسرے تقریر کرنے سے عدم مناسبت۔''

انتقال سے تھوڑا پہلے ان کو دو دعوت نامے ملے: ایک رابطہ عالم اسلامی کی طرف سے تھا قبرص جانے کا، دوسرا ماسکو سے آیا تھا، انھوں نے دونوں سے معذرت کرلی، مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی لکھتے ہیں:

''ہوائی جہاز کے سفر سے ان کے اعصاب پر بڑا اثر پڑتا تھا، اور وہ سفر میں ٹرین کو ترجیح دیتے تھے، لیکن بیرونی ممالک کے سفروں میں ہوائی جہاز سے چارہ نہیں تھا، اس لیے وہ حتی الامکان اس سے بچنے کی کوشش کرتے تھے، انتقال سے کچھ ہی دن پہلے ان کو ایک طرف قبرص (سائپرس) کی مسلم صحافت کی اس کانفرنس میں شرکت کے لیے جو رابطہ عالم اسلامی کے اہتمام میں ہورہی تھی، دعوت نامہ ملا۔

اور دوسری طرف ماسکو سے وہاں کی ایک صحافتی کانفرنس میں شرکت کے لیے دعوت نامہ آیا ہوا رکھا تھا، لیکن انھوں نے ان دونوں سفروں میں سے کسی میں جانا پسند نہیں کیا، اور اس کی نوبت آنے سے پہلے وہ دنیا سے سفر کر گئے، قبرص میں بجائے ان کی موجودگی کے ان کے لیے دعائے مغفرت کی گئی اور فاتحہ پڑھ کر ثواب پہنچایا گیا۔''(۱)

ایک قلمی شاہکار اور آخری یادگار

مولانا محمد منظور صاحب نعمانی لکھتے ہیں:

''۱۱ر جون دوشنبہ کی شام کو اسی مہینہ جون (مطابق رجب) کا البعث الاسلامی کا شمارہ میرے پاس آیا، مغرب وعشاء کے

(۱) تعمیر حیات محمد الحسنی نمبر/۱۵۹-۱۶۰

درمیان میں نے سب سے پہلے اس کا افتتاحیہ پڑھا، جو عزیزم مرحوم کے قلم کا لکھا ہوا تھا، اس کا عنوان تھا "سـؤال حـائـر يـحتـاج إلـى جـواب" یہ سات صفحے کا مضمون تھا، اس میں ممالک اسلامیہ عربیہ خاص کر سعودی مملکت کے ذمہ داروں سے وہ باتیں صاف صاف کہی گئی تھیں جن کا اسی طرح صاف صاف کہا جانا ان کی خیر خواہی کا بھی تقاضا تھا اور از روئے دین اب فرض ہو گیا تھا، اور اس فرض کو اب وہی مرد خدا ادا کر سکتا تھا جس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی خاص توفیق عطا ہو، اس کو پڑھ کر میں نے محسوس کیا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمارے مولانا محمد الحسنی کو یہ سعادت بخشی گئی ہے کہ بہتر سے بہتر اور مؤثر سے مؤثر انداز میں انھوں نے یہ فرض ادا کیا، میں نے اس افتتاحیہ کو ان کے قلم سے ''ندائے غیب'' سمجھا اور طے کر لیا کہ اس کو اردو میں منتقل کرا کے ''الفرقان'' میں شائع کرنا ہے۔

اگلے دن (۱۲ر جون سہ شنبہ) فجر کی نماز کے بعد ہی میں نے مولانا محمد میاں کو فون کیا، ان کے مضمون کے بارے میں اپنا تأثر ان کو بتلایا اور ان سے فرمائش کی کہ وہ اس کو جلدی زیادہ سے زیادہ بس دو تین دن میں ''الفرقان'' کے لیے اردو میں منتقل کر دیں یا کسی سے کرا دیں، انھوں نے کہا: بہت اچھا! ان شاء اللہ ہو جائے گا، اللہ کے سوا کسی کو بھی علم نہ ہو گا کہ آج ہی کا دن ان کی زندگی اور ان کے کام کا آخری دن ہے، اور کل ہی ان کا سفر آخرت ہے۔'' (۱)

---

(۱) تعمیر حیات محمد الحسنی نمبر/۱۷۴ و الفرقان لکھنؤ جولائی ۱۹۷۹ء (باقی اگلے صفحہ پر)

وفات(☆)

"إنا لله وإنا إليه راجعون."

جان کر منجملۂ خاصان میخانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

دنیا میں جو آیا ہے اس کو مرنا ہے، ﴿کل نفس ذائقة الموت﴾ لیکن مرنے مرنے میں فرق ہوتا ہے، ایک مرنا اس کا ہوتا ہے جس کی دنیا کو کوئی ضرورت نہیں ہوتی، وہ رہے یا نہ رہے، سب کے لیے برابر ہے، لیکن بعض موتیں ایسی ہوتی ہیں، جن سے دنیا اور دنیا والوں کو بڑا دھکا لگتا ہے، اور ان موتوں سے جو خلا پیدا ہوتا ہے اس کا پر ہونا مدتوں مشکل ہوتا ہے، اہل تعلق اور اہل خاندان والوں کو تو فطری رنج ہوتا ہی ہے، ملک وملت کو بھی بڑا نقصان ہوتا ہے، ایسی جاں کاہ موتوں میں ایک موت میرے محبوب بھائی اور عزیز ترین عزیز "محمد میاں" کی موت ہے جس کا تصور بھی مشکل تھا۔

وہ محمد میاں جو اپنے پورے خاندان کے چشم و چراغ، ہر آنکھ کا نور اور دل کا سرور تھے، سراپا صفات حسنہ، مجسم شرافت، علم وعمل کے پیکر اور فضل وکمال کے نشان تھے، مجھ

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) اس مضمون کے بارے میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی اپنا تأثر یوں بیان کرتے ہیں:

"مرحوم کے انتقال کے بعد میں نے وہ مضمون پڑھا اور پڑھ کر مسرت کے ساتھ یہ حسرت ہوئی کہ میں نے یہ مضمون ان کی زندگی میں کیوں نہ پڑھ لیا تھا اگر میں ان کی زندگی میں یہ پڑھ لیتا تو ان کا ہاتھ چومتا اور پیشانی کو بوسہ دیتا، افسوس ہے کہ اس کی نوبت نہ آئی اور یہ حسرت دل ہی دل میں رہ گئی۔"

مضمون کے ترجمہ کے متعلق مولانا رقمطراز ہیں:

"خدا کو منظور تھا کہ یہ کام ان کے ہونہار فرزند سید عبداللہ حسنی ندوی سلمہ کے قلم سے تکمیل پائے، انھوں نے بڑی خوبی اور کامیابی کے ساتھ اس مضمون کو اردو میں منتقل کیا، جو الفرقان ماہ شوال ۱۳۹۹ھ میں "ایک تضاد جس کی توجیہ ممکن نہیں" کے عنوان سے شائع ہوا اور بہت پسند کیا گیا اور اس طرح فارسی کا وہ جملہ صادق آیا: "اگر پدر نہ تواند پسر تمام کند۔" (م)

(☆) یہ مضمون مؤلف نے صاحب سوانح کی وفات پر اپنے زیر ادارت نکلنے والے خواتین کے رسالہ ماہنامہ "رضوان" لکھنؤ (شمارہ جون ۱۹۷۹ء) میں خصوصی اداریہ کے طور پر سپرد قلم کیا تھا، اس کو تذکرہ محمد الحسنی کا جزء بنایا جا رہا ہے۔ (م)

سے دس سال چھوٹے، علم وعمل، فضل وکمال اور خوف خدا اور محبت الٰہی میں مجھ سے دس گنا زیادہ، خدا جانے کتنے گنا بڑھ کر تھے، عمر میں چھوٹے، علم وفضل میں بہت زیادہ بڑھے تھے، ان کے ساتھ خدا کا معاملہ سب سے زیادہ جدا تھا، ان کا علم کسبی نہ تھا، وہبی تھا، ایسا وہبی جو خال خال کرتا ہے، ان کے قلم میں اتنی طاقت، اتنی گہرائی، اتنی روانی اور اتنی اثر انگیزی تھی کہ جس کی مثال کم ملتی ہے، اہل عرب ان کی عربی تحریروں پر سر دھنتے، مصر وشام کا بڑے سے بڑا ادیب ان کی تحریروں کا قائل تھا، ان کے مضامین عربی اخبارات میں مسلسل نقل ہوتے تھے، ان کی اردو تحریر کا حال یہ تھا کہ اردو اخبارات ان کے مضامین کو نقل کرنا اپنے لیے باعث فخر سمجھتے تھے، ان کی تحریروں میں ''فکر اسلامی'' سرایت کیے ہوتی، کوئی مضمون ایسا نہ ہوتا جس میں دعوت نہ ہو، اور دینی فکر نہ ہو، اتنی کم عمری میں ایسا کمال پیدا کر لینا ان کی خصوصیت تھی۔

وہ ایک بڑے باپ ڈاکٹر سید عبد العلی حسنیؒ کے بیٹے اور ایک جلیل القدر شخصیت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے بھتیجے تھے، عمر صرف ۴۴/سال کی پائی، ۱۹۳۵ء میں پیدا ہوئے، اور ۱۳/جون ۱۹۷۹ء میں دنیا سے رخصت ہوئے، اور اتنی کم عمری میں ایک بڑا علمی کارنامہ انجام دے کر اپنے رب سے جا ملے اور ہم لوگ دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔

ان کے انتقال سے ہم اہل خاندان پر کیا گزری وہ تحریر کے باہر ہے، آنکھیں برابر اشکبار ہیں، اور دل سوگوار ہے، مگر زبان بند ہے، وہ وہی کہتی ہے جو شریعت کا حکم ہے، یا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے محبوب بیٹے حضرت ابراہیمؓ کے انتقال پر فرمایا تھا:

"إنا بفراقك يا إبراهيم لمحزونون، إن العين تدمع والقلب يحزن، ولا نقول إلا ما يرضي ربنا"

(کہ اے ابراہیم! تمہارے جانے پر ہم بہت غمگین ہیں، آنکھ رو رہی ہے اور دل اشکبار ہے، مگر زبان وہی کہے گی جس میں اللہ کی رضا ہے)۔

یا جس صبر کا مظاہرہ (آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے) حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت پر فرمایا تھا۔

ہم لوگوں کی ہستی سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے صبر و عزیمت کی کیا نقل کرے گی مگر اتباع کا حکم ہے، اس لیے خدا سے دعا ہے کہ اپنے پاک بندے اور سچے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی نقل کرنے کی توفیق دے۔

محمد میاں کے انتقال سے غم والم کا پہاڑ ہم گھر والوں پر گرا ہے، خصوصاً مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ذات، ان کی فکر اور قلمی جہاد کو جو دھکا پہنچا ہے اس کا اندازہ وہ سارے حضرات کر سکتے ہیں جو ان کی تحریر کو پڑھتے رہتے ہیں۔ وہ مولانا موصوف کو بیٹے سے زیادہ محبوب تھے، اور ان سے مولانا کو بڑی امیدیں تھیں، وہ محمد میاں کو اپنا ترجمان اور جانشین سمجھتے تھے، اور ان کو اطمینان تھا کہ وہ اپنے چچا جو باپ کی جگہ لیے ہوئے تھے، ان کے مشن کو بڑھاتے رہیں گے، مگر وہ ہوتا ہے جو خدا کرتا ہے، تیزی سے قدم بڑھاتا ہوا راہ حق کا مسافر اپنی حقیقی منزل پر جا پہنچا، اپنے چچا، اپنے بھائیوں، اہل خاندان اور ساتھیوں اور پوری ملت کو داغ مفارقت دے گیا۔

إنا لله و إنا إليه راجعون.

وہ سب کے محبوب تھے، اور سب کے محب، مگر مجھ کو یہی دعویٰ ہے کہ ان کو مجھ سے ایسا گہرا تعلق تھا جس کی یاد زندگی بھر رہے گی، انھوں نے کسی وقت مجھ کو فراموش نہیں کیا، انتہائی ادب، انتہائی محبت، انتہائی تعلق تھا، ۱۹۵۶ء میں مجھ پر زور ڈال کر "رضوان" نکلوایا، دوڑ دوڑ کر اس کا انتظامی کام پورا کیا، مضامین لکھتے اور لکھاتے رہے، اور جب بھی مجھ میں پست ہمتی ہوئی، انھوں نے ہمت افزائی کی، اور اس کی بقا کے لیے جدوجہد کی، اور میری ترقی، سربلندی اور عزت اور خوش حالی کی برابر فکر کی، میں اگرچہ ان کا ماموں زاد بھائی تھا مگر حقیقی بڑے بھائی سے زیادہ توقیر و عزت افزائی اور ادب و لحاظ کرتے تھے، اسی طرح وہ اپنے دوسرے قریب ترین بھائیوں کا خیال رکھنے والے، حد سے بڑھ

کر صلہ رحمی کرنے والے، اپنے اور پرائے سب کا خیال رکھنے والے، مفید ترین مشورہ دینے والے، نہایت خوش مزاج، خلیق اور حلم پسند تھے، وہ کہا کرتے تھے کہ سب سے بڑا گناہ میں دل شکنی کو سمجھتا ہوں۔ اس کم عمری میں وہ بزرگوں کے محبوب بن گئے تھے، اس دور کے سارے مشائخ اس جواں سال صاحب علم وقلم کو صاحب صفات حمیدہ خیال کرتے تھے، ان کے ساتھ خدا کو معاملہ سب سے جدا تھا۔

ان کی پیدائش پر خاندان نے بڑی خوشی کا اظہار کیا تھا، ۴/سال کی عمر میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ان کے گھر خود تشریف لا کر بسم اللہ کرائی تھی، ان کے والد ڈاکٹر سید عبد العلی حسنی ناظم ندوۃ العلماء نے اپنی نگرانی میں دینی تعلیم دی، مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے ان کے لیے "قصص النبيين للأطفال" جیسی کتاب لکھی، ایک ہونہار فرزند کی طرح انھوں نے نشو ونما پائی۔

اپنے والد کے اکلوتے فرزند تھے، اور پانچ بہنوں میں سب سے چھوٹے بھائی، مگر انھوں نے ہم بھائیوں کے ہر وقت ساتھ رہنے اور ایک ہی مربی کی تعلیم وتربیت سے حقیقی بھائیوں سے بڑھ کر معاملہ کیا، کسی وقت بھی حقیقی بھائی سے کمتر نہ جانا، ان کو ہم پر ناز تھا، ہم سب کو ان پر ناز تھا، یہی وجہ ہے کہ ان کی جواں سال موت نے ہمارے ٹکڑے کر دیے اور موت بھی ایسی اچانک موت کہ ہر آدمی انگشت بدنداں ہے کہ الٰہی ماجرا کیا ہے؟

قریب سے قریب لوگوں کو بیماری اور موت کی اطلاع بروقت نہ ہو سکی، ۹/بجے صبح تک ہنستے بولتے رہے، پیٹ میں درد اٹھا، اسپتال پہنچے اور ۹/بجے رات کو انتقال کر گئے، پورا دار العلوم ندوہ امڈ آیا، پہلی نماز جنازہ دار العلوم میں ہوئی، صبح کو خاندان والوں کو اطلاع ملی، ہر ایک حیرت زدہ رہ گیا، دوسری نماز جنازہ رائے بریلی میں دائرہ شاہ علم اللہ میں ہوئی، اور اپنے والد کے پہلو میں سپرد خاک کر دیے گئے، علم وعمل کا آفتاب غروب ہو گیا۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی بمبئی میں تھے، ان کو اطلاع کی گئی وہ دوسرے دن پہنچ سکے، اور تدفین میں شریک نہ ہو سکے، مولانا موصوف پر اس جاں کاہ موت کا بڑا اثر ہے، اللہ ان کو، ہم کو، سارے خاندان اور پوری ملت کو صبر کی توفیق دے، ان کے تین فرزند ہیں، سب سے بڑے مولوی عبداللہ جو دارالعلوم سے فارغ شدہ ہیں، اور درس و تدریس کا مشغلہ اختیار کیے ہیں، دوسرے حافظ عمار سلمہٗ، تیسرے نو سالہ بچہ بلال سلمہٗ ہے، خدا بچوں کو اور ان کی والدہ کو صبر جمیل کی توفیق دے اور اپنے باپ کا نعم البدل فرمائے۔(۱)

---

(۱) اہلیہ محترمہ (سیدہ زکیہ بنت ڈاکٹر سید حسن مثنی حسنی) بھی ۱۷/ اپریل ۱۹۹۳ء (شوال ۱۴۱۳ھ) کو وفات پاگئیں، رحمها الله تعالىٰ رحمة واسعة.

اولاد میں مولانا سید عبداللہ حسنی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء و مدیر جریدہ ''الرائد'' نے زندگی کی ۵۶ بہاریں دیکھ کر ۱۷/ ربیع الاول ۱۴۳۴ھ ۳۰/ جنوری ۲۰۱۳ء کو رحلت جاودانی فرمائی، اور اس مختصر زندگی میں اصلاح و دعوت کا جو عظیم کام انجام دیا اس کی نظیر ملی مشکل ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کی زبان و بیان میں غیر معمولی تاثیر دی تھی اور ان کے ہاتھ پر بہت سے غیر مسلم مشرف بہ اسلام ہوئے تھے، دو حج اور تین چار عمرے کے سفر کی سعادت حاصل کی، جنوبی افریقہ، ملیشیا، متحدہ عرب امارات کے دعوتی دورے کیے اور ملک کے ایک ایک حصہ میں جا کر تبلیغ دین کا صور پھونک دیا اور انتقال کے بعد غیر معمولی مقبولیت و محبوبیت ظاہر ہوئی، اللہ تعالیٰ اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور رضا و غفران سے نوازے، آمین۔

مولانا حافظ سید عمار محمد عبدالعلی حسنی ندوی مدرسہ مظہر الاسلام بلوچپورہ لکھنؤ کے مہتمم و استاد حدیث اور مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی مدرسہ ضیاء العلوم رائے بریلی کے نائب ناظم اور استاد حدیث ہیں، اور اپنے والد کے قائم کردہ ادارے ''دار عرفات'' تکیہ کلاں رائے بریلی کے تحت ایک علمی و تحقیقی ادارہ ''مرکز الامام ابی الحسن الندوی'' کے نام سے قائم کر کے اس کے مدیر ہیں، مرکزی حج کمیٹی کے چھ سال رکن رہ کر حجاج کرام کی خدمت کر کے خوب سعادت حاصل کی اور اب ندوۃ العلماء لکھنؤ کی مجلس انتظامی کے رکن بھی ہیں اور یہ سب بھائی ماشاءاللہ صاحب اولاد ہیں۔

مولانا سید عبداللہ حسنیؒ کے ایک فرزند حافظ سید محمد الحسنی (محمد میاں) و مولانا عمار محمد عبدالعلی کی چار صاحبزادیاں اور ایک فرزند محمد زکریا اور مولانا بلال عبدالحی کے دو فرزند حافظ سید عبدالعلی اور سید ابوالحسن علی اور ایک بیٹی خولہ ہے، بارك الله في حياتهم. (م)

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا ایک نادر اطلاعی مکتوب

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کا یہ نادر مکتوب قاہرہ مصر میں مقیم دار العلوم ندوۃ العلماء کے دو استادوں مولانا عبد النور ندوی اور مولانا نذر الحفیظ ندوی کے نام ہے، گرامی نامہ ملاحظہ کیجیے:

برادران عزیزان مولوی عبدالنور و نذر الحفیظ سلمہما اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

معلوم نہیں، آپ لوگوں کو کسی ذریعہ سے ہمارے خاندان ہی نہیں عالم اسلام کے عظیم حادثہ کی خبر ملی یا نہیں؟ شاید یہ ناشاد چچا ہی کے لیے مقدر ہے کہ وہ اپنے قوت بازو، قرۃ عین اور سرمایۂ نازش و افتخار باکمال بھتیجے کی خبر وفات دے، بہرحال خلاصہ یہ ہے کہ ۱۳ ارجون کو چند گھنٹوں کی علالت کے بعد محمد میاں ہم سب کو داغ مفارقت دے گئے، میں ان سے تقریباً ایک ہزار میل دور بمبئی میں تھا، ما أشبه الليلة بالبارحة، میں بھائی صاحب مرحوم کی طرح سارے مراحل طے ہو جانے کے بعد رائے بریلی پہنچا، بمبئی و دہلی ہر جگہ خبر تھی لیکن مجھ سے چھپایا گیا، آپ دونوں کو خوب اندازہ ہے کہ یہ حادثہ کیسا تھا؟ ع

آنچہ من گم کردہ ام گر از سلیماں شدے؟

اب یہ خط اس تعلق خاص کی بنا پر میں خود لکھ رہا ہوں جو آپ دونوں کو ہم دونوں سے ہے، اور اس درخواست کے ساتھ کہ دعائے مغفرت اور ایصال ثواب کے ساتھ ساتھ ان کی کتابوں کی طباعت و اشاعت میں پورا پورا زور صرف کر دیں گے، "الإسلام الممتحن" کی توزیع اور اس کو مناسب جگہوں تک

پہنچانے کی پوری پوری کوشش کریں گے، یہی ان کی سب سے بڑی یادگار ہے، "مصر تتنفس" اور "الإسلام بين لا و نعم" کی طباعت کی بھی کوشش کریں گے، اب زخم دل کے لیے یہی مرہم ہے۔

والسلام

دعا گو

ابوالحسن علی

۲۰/جون ۱۹۷۹ء(۱)

(۱) تعمیر حیات محمد الحسنی نمبر/ ۲۹۷-۲۹۸

باب چہارم

انداز نگارش، علمی وفکری ذوق اور قلمی جہاد

محمد میاں کا انداز نگارش بڑا اچھوتا، بڑا مؤثر اور دلکش تھا، ان کا سب سے پہلا مضمون شام سے نکلنے والے اخوانی مجلّہ ''المسلمون'' میں جب شائع ہوا تو اس کے پڑھنے والے علماء اور ادباء، اہل قلم حضرات نے مضمون نگار کے متعلق جو تصور قائم کیا وہ یہ تھا کہ اس کا لکھنے والا ایک بڑا فاضل، ایک بڑا ادیب اور علامہ قسم کا کوئی عمر رسیدہ شخص ہوگا، محمد میاں کے اس پہلے ہی مضمون نے، ان کے قلم کی تاثیر، حلاوت اور جذب وکشش نے مشہور سے مشہور اہل قلم کے دلوں کو موہ لیا، وجہ اس کی یہ تھی کہ انھوں نے جب اپنے قلم کی کشتی کو باطل کی تحریکوں کے خلاف جہاد کے لیے وقت کے سمندر میں ڈالا تو اپنے قلم کی اس کشتی کا ناخدا اپنے عم محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے قلم کو بنایا، اس وقت مولانا مدظلہ کے قلم کی حکمرانی تھی، اور اس کا سکہ مصر وحجاز اور مغرب اقصیٰ میں چل رہا تھا، محمد میاں نے اپنے شفیق ومہربان چچا کی تحریروں، مقالات اور کتابوں کو اتنا پڑھا کہ گویا ان کو پی گئے، ان کے اسلوب کو اپنے قلم میں جذب کرلیا، ان کے خیالات وافکار کو اپنی تحریروں میں تحلیل کرلیا، حتی کہ ظاہری رسم الخط کو بھی اپنالیا، اور دونوں کے رسم الخط میں ایسی یکسانیت پیدا ہوگئی کہ دیکھنے والا فرق کرنے میں دشواری محسوس کرتا، وہ اپنے چچا کی ہر تحریر کو غور سے پڑھتے، اس کے اسلوب نگارش کو اختیار کرتے، اور اس لائن پر اپنے قلم کو رواں دواں کرتے جو مشفق و

مربی چچا کی تھی، خدا نے ان کو ذہن رسا اور حافظہ کی نعمت سے بھی نوازا تھا، انھوں نے شہد کی مکھی کی طرح چچا کی تحریرات کی حلاوت، ان کے حسن و جمال، طرز نگارش اور فکرو خیال کے حسین پھولوں کے رس کو اس طرح چوسا کہ شہد ہی شہد حاصل کیا، اب گویا وہ اپنے چچا کے ترجمان بن گئے، اور ان کی تحریروں میں وہی حلاوت پیدا ہوگئی جو ان کے محبوب چچا کی تحریروں میں ہے، مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نے اس سلسلہ میں اپنے تأثر کا ان الفاظ میں اظہار کیا ہے:

> ''وہ زبان و اسلوب میں (عربی میں بھی اور اردو میں بھی) مولانا علی میاں کا ایسا اتباع کرتے تھے کہ گویا ان کا ثنی اور دوسری کاپی بن گئے تھے، لیکن ادھر کچھ دنوں سے بعض وہ حضرات جن کا احساس و اندازہ اس باب میں معتبر ہوسکتا ہے، محسوس کرتے تھے کہ ان کے قلم میں خاص کر عربی تحریر میں مولانا سے بھی زیادہ طاقت آگئی ہے، خود مولانا علی میاں بھی اس کا کبھی کبھی اظہار فرماتے تھے۔''

محمد میاں کے قلم نے اپنا باقاعدہ سفر ۱۹۵۱ء سے شروع کیا، اس وقت ان کی عمر ۱۶ رسال کی تھی، سفر نہایت دشوار گزار گھاٹیوں کا تھا، اس کا زادراہ یقین محکم، عمل پیہم اور عزم مصمم تھا، انھوں نے اس زادراہ کو حاصل کرنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں کی، کوہ کندن وکاہ برآوردن کے منازل سے وہ نہیں گزرے، ان کو یہ متاع گراں مایہ اپنے والد اور اپنے چچا سے حاصل ہوئی، اور وہبی طور پر ان کو "اباً عن جدٍ" ملی، ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء والله ذو الفضل العظيم، ان کی کئی پشتوں سے ان صفات حمیدہ کے دیار کی حکمرانی اور قلم کی شہسواری چلی آرہی تھی، اور ہر آنے والے زمانے میں گزرے ہوئے زمانے سے زیادہ اس سلسلہ کی گرفت مضبوط ہوتی جارہی تھی، ۱۹۵۱ء سے لے کر آخر عمر تک جو زمانہ آتا تھا ان کے قلم میں تندی و تیزی، شوخی و

خوداعتمادی بڑھتی جارہی تھی، ان کا فکری ذوق نکھرتا جارہا تھا۔

ان کے قلم میں گہرائی وگیرائی، ان کی تحریر میں تندی وشوخی کیوں پیدا ہوئی، باطل تحریکوں پر گرفت اوران پر بھرپور حملہ کرنے کی طاقت، بڑھتے ہوئے طوفانوں کے مقابلہ میں اپنی کشتی کے ڈال دینے کی قوت، عربی قومیت، اشتراکیت اوراستعماریت کی تندوتیز ہواؤں میں ایمان ویقین کا چراغ روشن رکھنے بلکہ خداناشناس طاقتوں کے ظلمت کدہ کومنور کرنے کا داعیہ کیوں اورکس زمانہ میں پیدا ہوا، اور جہاد بالقلم کا فریضہ کن حالات میں انجام دیا، اس کا نقشہ مولانا ابوالحسن علی ندوی ان الفاظ میں کھینچتے ہیں:

> ''جب وہ عقل وشعور کی منزل میں پہنچے اورعرب ادباء واہل قلم کی تحریریں پڑھنی شروع کیں تو ان کی نظر بہت سے ایسے مضامین اورتحریروں پر پڑی کہ اگران کے نیچے ان عرب اہل قلم کی جگہ مغربی مصنفین، مستشرقین اورمخالف اسلام ادیبوں اورفلسفیوں کے نام لکھ دیے جائیں تو پڑھنے والے کو اس بارے میں کوئی الجھن محسوس نہیں ہوگی، انھوں نے دیکھا کہ اکثر عرب مصنفین کا ذہن اسلام کے بارے میں صاف نہیں ہے، وہ اسلام کے بارے میں یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ وہ تاریخ انسانی میں اپنا برا بھلا رول ادا کرچکا، وہ ایسی تاریخ ہے جس کا مسالہ ختم ہوچکا ہے، اب اس کا دم بھرے جانا اور اس کی دعوت دینا کوئی عقل و دانشمندی کی بات نہیں۔ انھوں نے چونکہ ایسے ماحول میں پرورش پائی تھی جس کا عقیدہ تھا کہ اسلام ایک زندہ جاوید دین ہے، جس میں نوع انسانی کی قیادت وسیادت کی پوری صلاحیت ہے، اورعرب ساری دنیا میں اس دعوت کے علمبردار اول ہیں، صورت حال کا یہ جدید انکشاف ان کے لیے ایک ذہنی صدمہ اور

قطعاً ایک خلاف توقع واقعہ تھا، انھوں نے اس بات کا بیڑا اٹھایا کہ وہ مسلمانوں کو ایسے اسلام کی دعوت دیں جو ہر صاحب حق کو اس کا حق دلاتا ہے، عقل کو روشنی اور شعلہ جگر کو تابنا کی بخشتا ہے، جو اخلاق کو سنوارتا ہے، زندگی کو ایک نظام عطا فرماتا ہے، قوموں کو آوارہ اور شتر بے مہار بننے سے بچاتا ہے، تہذیب وتمدن کو صحیح راہ پر لگاتا ہے، دبی ہوئی صلاحیتوں کو ابھارتا ہے، مردان کار کو میدان میں لاتا ہے، قائدین ملت کو اور عبقری انسانوں کو (Genios) پیدا کرتا ہے، اور پھر ۱۹۵۲ء کے بعد مصر میں قومیت عربیہ کی تند وتیز آندھی اٹھی اور اس نے دیکھتے دیکھتے عرب نوجوانوں کی اکثریت کو اور پختہ کار عربوں کی بھی ایک بڑی تعداد کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تو انھوں نے مجلّہ ''البعث الاسلامی'' کی ادارت سنبھالی، اور مقالات کا ایک سلسلہ شروع کیا تاکہ اپنے مجروح جذبات سوختہ جگر کی ترجمانی کے ذریعہ پیغام اور دنیا میں ان کی مرکزیت کا بھولا ہوا سبق یاد دلائیں، اور ان کے اندر شعور پیدا کریں کہ اس نازک گھڑی میں وہ کیا قائدانہ کردار ادا کر سکتے ہیں۔''

''البعث الاسلامی'' اور اس کی ادارت

۱۹۵۵ء کا وسط تھا کہ محمد میاں کی بے چین طبیعت اور باطل تحریکوں سے ٹکرانے کے عزم اور ان کے قلم کی طاقت اور جولانی نے میدان کارزار میں ایک کامیاب قدم رکھا، اپنے چند معتمد رفقاء اور ایک ہی راہ کے مسافروں کے مشورہ سے مجلّہ البعث الاسلامی کا ڈکلریشن داخل کر دیا اور ایسے موقع پر جبکہ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی صاحب اور راقم السطور سفر پاکستان پر تھے، اس کا پہلا شمارہ منظر عام پر لے آئے،

سب سے پہلا جو شمارہ نکلا اس پر بحیثیت مدیر کے محمد الحسنی اور بحیثیت معاونین کے محمد راشد ندوی، محمد اجتباء ندوی اور سعید الرحمن اعظمی ندوی (۱) کے نام چھپے اور ان سبھی رفقاء نے اس قلمی جہاد کو ایک ساتھ شروع کیا۔

یہ رسالہ لیتھو پریس میں چھپا، اس کا پہلا نمبر مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی صاحب کو بذریعہ ڈاک بھیجا گیا، تو انھوں نے اس کو دیکھ کر اپنے برادر مکرم ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی صاحب کو تحریر کیا:

"البعث" کا پرچہ مجموعی حیثیت سے خاصا رہا اور توقع سے بہتر، امید ہے کہ آئندہ نمبر اور بہتر ہوں گے۔" (۱۷/ اکتوبر ۱۹۵۵ء)

شروع شروع میں البعث الاسلامی کے ذریعہ عربی زبان اور اسلامی و دینی دعوت کی راہ میں بڑی مالی دشواریاں آئیں، چونکہ محمد میاں نے یہ رسالہ اپنے ذاتی خرچ پر نکالا تھا، اس لیے ہر ماہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا، راقم السطور کو اچھی طرح یاد ہے کہ بعض دفعہ پرچہ چھپا ہوا اور پیک کیا ہوا رکھا ہے مگر پوسٹ کے پیسے نہیں ہیں، اور وقت گزرتا جارہا ہے، محمد میاں نے طبیعت اتنی غیور پائی تھی کہ قرض لینا بھی گوارا نہیں کرتے تھے، ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ پرچہ چھپ کر آیا، صبح سے اس کی پیکنگ ہو رہی تھی اور تین بجے تک یہ کام بھی مکمل ہو گیا، پانچ بجے تک پوسٹنگ کا وقت تھا، محمد میاں بار بار کمرے میں آتے اور چلے جاتے، ایک بار آئے اور مطب میں جا کر بیٹھ گئے، وقت تنگ سے تنگ ہونے لگا، راقم السطور نے ان کو تلاش کیا، وہ مطب میں

---

(۱) مولانا ڈاکٹر سعید الرحمن اعظمی ندوی کچھ عرصہ کے لیے شیخ تقی الدین ہلالی مراکشی کی خدمت میں استفادہ کے لیے بیرون ملک مقیم رہے، پھر ندوۃ العلماء واپس ہو کر اپنی تدریسی، دعوتی وصحافتی ذمہ داریوں میں لگ گئے، اس وقت دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مہتمم ہیں، اور انٹگرل یونیورسٹی لکھنؤ کے چانسلر ہیں، البتہ مولانا ڈاکٹر محمد اجتباء ندوی بعض مصلحتوں سے دہلی منتقل ہوئے، شام (سوریا) کا بھی سفر کیا، اور مدینہ منورہ میں جامعہ اسلامیہ میں خدمات انجام دیں، اور زندگی کے آخری ایام دہلی میں گزارے، اور ایک آپریشن کے کامیاب نہ ہونے کی صورت میں ۷۲ سال کی عمر میں انتقال کیا، ڈاکٹر محمد راشد ندوی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے وابستہ رہے، اور متعدد بار شعبہ عربی کے صدر رہ کر ریٹائر ہوئے، عربی کی اعلیٰ صلاحیت رکھتے تھے۔

ملے، پوسٹ نہ کرنے کی وجہ پوچھی، انھوں نے ٹال دیا، اصرار سے پوچھا تو وجہ بتلائی مگر چہرہ پر نہ تو ناگواری تھی نہ پریشانی کا کوئی اثر تھا، بہرحال رسالہ پوسٹ کردیا گیا۔

مد و جزر کا یہ سلسلہ کئی سال تک چلتا رہا، مگر محمد میاں کے پائے ثبات کو نہ کوئی لغزش آئی نہ ان کے قلم کی روانی میں کوئی فرق آیا، پورے عزم و ہمت کے ساتھ یہ خدمت انجام دیتے رہے، عزیزی مولوی محمد رابع سلمہ کے قیمتی مشوروں اور مولوی سعیدالرحمٰن صاحب ندوی کے عملی تعاون سے رسالہ برابر نکلتا رہا، محمد میاں کا گھر اس رسالہ کا دفتر تھا، وہیں مرتب ہوتا، وہیں سے پوسٹ ہونے کو جاتا، اس رسالہ کو ہندوستان کے عربی مدارس اور حلقوں میں تو کم، عرب ممالک کے علمی اور دینی حلقوں میں زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔

محمد میاں کی ٹھوس علمی خدمت کا یہ پہلا قدم تھا، جو بڑا کامیاب رہا، اور ترقی و عروج کی منزل کی طرف رواں دواں رہا، اس رسالہ سے علمی اور دینی خدمت تو بہت ہوئی مگر محمد میاں کے معاشی مسئلہ کا حل اس سے ایک مدت تک نہ نکل سکا، بلکہ ہر ماہ اس پر خرچ کرنا پڑتا تھا۔

پہلے ہی شمارہ کے بعد محمد میاں اور مولوی سعیدالرحمٰن صاحب نے اس کی اشاعت کی خاطر علی گڑھ، دہلی، سہارنپور، دیوبند، مرادآباد اور رامپور کا سفر کیا، اکثر علمی حلقوں میں جانا ہوا، اور مشہور علمی، ادبی اور دینی شخصیتوں سے ملاقاتیں کیں، یہ دورہ محمد میاں کا پہلا طویل دورہ تھا، وہ اس سے پہلے لکھنؤ سے سوائے رائے بریلی، کانپور اور فتح پور کے اور کہیں نہیں گئے تھے، اس سفر سے ان کا علمی اور دینی فائدہ بھی پہنچا، وہ اس سفر سے واپس ہوئے تو نیا عزم، نیا ولولہ اور حوصلہ لے کر واپس ہوئے، مشائخ کی زیارت کی، علماء و ادباء سے ملاقاتیں کیں اور مشہور مدارس کو بھی دیکھا، مولوی سعیدالرحمٰن صاحب جو اس سفر میں ساتھ تھے، اس سفر کی روداد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"البعث الاسلامی کا پہلا شمارہ ۵/اکتوبر ۱۹۵۵ء کا تھا، مگر ستمبر کی

آخری تاریخوں میں نکل گیا تھا، اور ہم لوگوں نے یکم اکتوبر کو سفر شروع کیا تھا، پہلے کانپور پھر آگرہ جانا ہوا، وہاں سے علی گڑھ گئے، علی گڑھ میں کئی دن بہت مفید قیام رہا، اور کافی خریدار بنے، اس زمانہ میں شیخ مامون دمشقی وہاں تھے، ڈاکٹر علیم اسلامک اسٹڈیز کے سربراہ تھے، خریدار بنے تو کہنے لگے کہ یہ چل بھی جائے گا؟ آج تک کوئی اس طرح کا کام شروع ہونے کے بعد بہت کم مدت میں ختم ہوگیا ہے، ہم لوگوں نے کہا: ان شاء اللہ ضرور چلے گا، علی گڑھ میں حکیم ظل الرحمٰن صاحب جو اس زمانہ میں طبیہ کالج میں زیر تعلیم تھے، ان کے یہاں ہوسٹل میں قیام رہا، پھر بہت سے لوگوں سے ملاقات ہوئی، وہاں سے بذریعہ بس ہم لوگ دہلی گئے، دہلی میں مولانا واضح رشید ندوی صاحب (۱) کے کمرہ میں قیام کیا، اور جامعہ ملیہ، فتح پوری اور حوض قاضی میں کسی مدرسہ میں جانا ہوا، ان کے علاوہ جگہ جگہ جا کر لوگوں سے ملے اور کافی خریدار بنائے، تین دن دہلی میں رہ کر پھر دیوبند گئے، دیوبند میں حضرت مولانا مدنی کے گھریلو مہمان خانہ کے قریب مولوی محمد سالم ہنسوی (جو محمد میاں کے ماموں زاد بھائی ہیں اور اس وقت دیوبند میں برائے تعلیم مقیم تھے) کے کمرہ میں ٹھہرے تھے، اس وقت مولانا مدنی کہیں باہر تشریف لے گئے تھے، مولانا اسعد صاحب بھی غالباً نہیں تھے، اگر تھے تو ان سے ملنا یاد نہیں، البتہ مولوی رشید الوحیدی اور مولوی فرید الوحیدی صاحب سے ملاقات ہوئی تھی، کئی دن کے قیام کے دوران وہاں کے طلبہ کی انجمن کے افریقی سربراہ مولوی ابراہیم افریقی نے بہت تعاون

---

(۱) مولانا محمد واضح رشید ندوی حال معتمد تعلیم ندوۃ العلماء لکھنؤ و سکریٹری رابطہ ادب اسلامی عالمی۔ (م)

کیا تھا خریدار بنوانے میں، مولانا فخر الدین صاحب (۱) تو پرچہ نکلنے سے پہلے ہی بذریعہ مراسلت خریدار اول بن چکے تھے، دیو بند کے بعد سہارنپور گئے، وہاں مظاہر علوم کے مدرسہ کے ایک کمرہ میں قیام کیا، اور نئے دار الاقامہ میں جاکر خریدار بنائے، زیادہ تر طلبہ خریدار بنے تھے، سہارنپور سے رڑکی گئے، وہاں خوب بارش ہورہی تھی، اس دوران وہاں کی یونیورسٹی اور کچھ دوسری یادگاراتری چیزیں دیکھنے گئے، وہاں کے مدرسہ میں قیام رہا تھا، اور کچھ لوگ خریدار بنے تھے، رڑکی سے بحالت بارش مرادآباد کے لیے روانہ ہوئے، وہاں رات کو بارش ہوتے ہوتے پہنچے، اور مولانا منظور علی صاحب سے ملاقات ہوئی، انھوں نے اپنے کمرہ میں ٹھہرایا، اور رات کو کھانے کا خود انتظام کیا، خود چائے بنائی، اور کچھ ناشتہ وغیرہ بھی تیار کیا، دوسرے دن وہیں رہے، کچھ لوگوں نے خریداری قبول کی، مدرسہ شاہی کے علاوہ دوسرے مدارس بھی گئے، ایک جگہ ایک صاحب نے البعث الاسلامی کو البحث الاسلامی پڑھا تو طلبہ نے کہا: البعث الاسلامی ہے، وہاں سے رامپور گئے اور مولوی رضوان ندوی (۲) کے مکان پر ٹھہرنا ہوا، رامپور میں جو ندوی بزرگ ملے تھے وہ غالباً رضوان صاحب ہی کے مکان پر ملے تھے، اور ان کے کوئی عزیز تھے، انھوں نے کچھ سوالات کیے تھے، اور ان کا جواب دیا گیا تھا، حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی کے صاحبزادہ مولانا

---

(۱) دار العلوم دیو بند کی ممتاز علمی شخصیت مولانا سید فخر الدین صاحب جو حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے بعد دار العلوم دیو بند کے شیخ الحدیث ہوئے۔(م)

(۲) حال مقیم کراچی پاکستان، لیبیا اور ریاض سعودی عرب میں تدریسی خدمات انجام دیں، پھر کراچی منتقل ہو گئے، تحریر و تصنیف اور علمی نقدان کا محبوب مشغلہ ہے۔(م)

عبدالمومن صاحب فاروقی یہیں ملے تھے، اور انھوں نے دعوت
کی تھی، انھوں نے کچھ نحوی صرفی سوالات کیے تھے، اس کے
علاوہ مدرسہ عالیہ بھی جانا ہوا تھا، اور وہاں بھی کچھ لوگ ملے تھے،
رامپور تک مولوی سالم ہنسوی بھی ساتھ رہے تھے، رامپور سے
لکھنؤ واپسی ہوئی، واپسی ۱۶/اکتوبر کو ہوئی تھی، اس سفر میں سو
خریدار بنے تھے، اور ساٹھ خریدار سفر کرنے سے پہلے بنے تھے۔"

ندوۃ العلماء کا ترجمان اور تحریک ندوۃ العلماء کا آرگن

چندسال تک یہ رسالہ محمد میاں کا ذاتی پرچہ تھا، اور لیتھو پر چھپتا تھا، اس کو جب دن دوگنی رات چوگنی مقبولیت حاصل ہونے لگی تو ندوۃ العلماء کے ارباب حل وعقد نے اس کو ندوۃ العلماء کا آرگن بنانا چاہا، اس راہ کی منزلیں کیسے طے ہوئیں وہ مولانا سیدابوالحسن علی حسنی صاحب ندوی کے الفاظ میں پڑھیے:

"البعث الاسلامی محمد میاں نے ذاتی طور پر نکالا تھا، بعد میں اس کی اہمیت و افادیت دیکھ کر بھائی صاحب "ڈاکٹر عبدالعلی صاحب" کو اس پر راضی کرلیا گیا کہ وہ ندوۃ العلماء کی طرف سے نکلے اور اس کی ترجمانی کی خدمت انجام دے، محمد میاں بدستور اس کے چیف ایڈیٹر تھے، لیکن ان کی تنخواہ ان کے مضامین کے عرب قدرداں باہر سے بھیجتے رہے، جس میں انھوں نے اپنے رفیق کار اور عزیز دوست مولانا سعیدالرحمٰن صاحب کو شریک کرلیا تھا، مولانا محمد منظور صاحب نعمانی (۱) جو رسالوں کی اشاعت اور اس کی راہ میں گوناگوں دشواریوں کا تجربہ رکھتے

---

(۱) حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ (م-۱۹۹۷ء) بانی ومدیر ماہنامہ "الفرقان" لکھنؤ ومصنف "معارف الحدیث" و کتب کثیرہ وخلیفہ حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ۔ (م)

ہیں، البعث الاسلامی کے اجراء اور اس کی دشواریوں، محمد میاں کی ثبات قدمی اور رسالہ کی ترقی اور اس کے مختلف مراحل کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''محمد میاں کی عمر کا بیسواں سال تھا کہ انھوں نے خود اپنا ایک عربی رسالہ جاری کرنے کا فیصلہ کیا، اور البعث الاسلامی کے نام سے ایک بلند معیار عربی ماہنامہ اکتوبر ۱۹۵۵ء سے جاری ہوگیا، اس وقت وہ ان کا ذاتی رسالہ تھا، ان کا گھر ہی اس کا دفتر تھا، وہ خود ہی اس کے لیے مضامین لکھتے، خود ہی کتابت کرتے اور چھپواتے اور خود ہی ڈاک سے اس کو روانہ کرنے کا اہتمام کرتے؛''خودکوزہ وخودکوزہ گروخودگل کوزہ''

راقم السطور کی طرح جو لوگ اس لائن سے کچھ واقفیت رکھتے ہیں کہ اپنی ذات کے بل بوتے پر ہندوستان سے عربی رسالہ نکالنے کا فیصلہ کیسی ہمت مردانہ اور مالی اعتبار سے کتنے خسارہ کا سودا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے بیس سالہ محمد میاں کو یہ ہمت مردانہ بخشی، جلد ہی البعث الاسلامی عرب ممالک میں مقبول اور ساتھ ہی خود کفیل ہونے لگا، پھر ۱۹۵۹ء میں جبکہ اس کی عمر کا چوتھا سال تھا اور جیسا کہ عرض کیا گیا عرب ممالک میں اس کو اچھی مقبولیت حاصل ہوگئی تھی ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ کے ایک جلسہ میں جس میں راقم السطور بھی بحیثیت رکن انتظامی شریک تھا اس تجویز پر گفتگو ہوئی کہ البعث الاسلامی کو ندوۃ العلماء کی تحویل میں لے لیا جائے اور اس کی اشاعت کا اہتمام وانتظام ندوۃ العلماء کی طرف سے ہو اور محمد میاں اسی طرح اس کے مدیر اور ذمہ دار رہیں تو یہ ندوۃ

العلماء اور اس کے دار العلوم کے لیے خاص کر عرب ممالک میں ان کے تعارف کے لیے بہت مفید ہوگا، غور و بحث کے بعد مجلس نے اس تجویز کو منظور کرلیا، مولانا محمد میاں صاحب کی طرف سے ان کے والد ماجد ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی صاحب نے جو ندوۃ العلماء کے ناظم تھے اس کی منظوری دے دی اور البعث الاسلامی کی ملکیت ندوۃ العلماء کی طرف منتقل ہوگئی، کسی معاوضہ کا کوئی ذکر ہی نہیں آیا بلکہ مولانا محمد میاں کے لیے ان کی محنت اور کارکردگی کا کوئی الاؤنس بھی مقرر نہیں کیا گیا اور وہ اسی شغف اور عرق ریزی کے ساتھ دن رات ایک کر کے اس کا کام کرتے رہے، اور اس کا معیار بلند سے بلند تر ہوتا چلا گیا، قریباً دو سال کے بعد جب ان کے والد ماجد ڈاکٹر عبدالعلی حسنی صاحب وفات پاگئے تو ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ کے ایک جلسہ میں ان کے لیے البعث الاسلامی کی ادارت اور تمام تر کارکردگی کے سلسلہ میں صرف سو روپئے کا الاؤنس منظور کیا گیا، انھوں نے اس کو بخوشی قبول کرلیا، حالانکہ اس وقت بھی ندوۃ العلماء کے دفتر کے بعض محرروں کی تنخواہ اس سے زیادہ تھی، اللہ تعالیٰ نے ان کی فطرت کو ان چیزوں سے بالکل بے نیاز بنایا تھا، لیکن ان کی اس قناعت اور قربانی کا صلہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی شان عالی کے مطابق ملا، اور البعث الاسلامی ہی کے سلسلہ سے ان کے لیے "یرزقه من حیث لا یحتسب" کی ایک شکل پیدا ہوگئی۔ وہ صرف ونحو سے بالکل ناواقف تھے، راقم السطور نے خود مولانا علی میاں سے سنا ہے کہ غالباً ان کو ماضی کی پوری گردان بھی یاد نہ ہوگی، البتہ ان کی

جو تحریریں شائع ہوتی تھیں وہ زبان کے لحاظ سے عالم عربی کے
مشاہیر اہل قلم کی تحریروں کے ہم پلہ ہوتی تھیں۔''

البعث الاسلامی کو علمی اور دینی حلقوں میں جو مقبولیت حاصل ہوئی اس کی مثال کم ہی ملتی ہے، عجمی اہل قلم نوجوان کی تحریروں کا ایسا شاندار اور پرتپاک استقبال ''الضیاء'' کے بعد پہلا تھا، فرق اتنا تھا کہ الضیاء کے لکھنے والوں میں مولانا مسعود عالم ندوی، مولانا عبدالرحمٰن کاشغری، علامہ سید سلیمان ندوی، شیخ تقی الدین ہلالی مراکشی جیسے اصحاب قلم تھے، اور البعث الاسلامی کے نکالنے اور چلانے والوں میں محمد میاں ''محمد الحسنی'' مولوی سعید الرحمٰن ندوی، مولوی اجتباء ندوی اور ان کے دوسرے رفقاء تھے، الضیاء کی سرپرستی علامہ سید سلیمان ندوی کے سپرد تھی اور البعث الاسلامی مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے زیر سرپرستی میں نکلتا، اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ البعث الاسلامی کو الضیاء سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی، ایک تو اس وجہ سے کہ پوری دنیا اس وقت ایک آنگن کی طرح بن گئی ہے اور عرب وعجم ایک ملک کے دو حصے معلوم ہونے لگے ہیں، دوسرے مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے عرب ممالک کے مسلسل اسفار اور عرب علماء کی مسلسل آمد دارالعلوم ندوۃ العلماء کی شہرت اور فرزندان ندوہ کی عربی زبان وادب پر قدرت کا نتیجہ ہے، خود محمد میاں کا تعارف بحیثیت مضمون نگار اور عربی زبان وادب اور تحریر میں بالکل اہل زبان کی طرح ملکہ رکھنے والے کے عرب ملکوں میں ہوا، البعث الاسلامی کی ایک خصوصیت جو ساری خصوصیتوں سے بلند وبالا ہے کہ وہ ایک دعوت کامل، روحانی اقدار کا علمبردار اور دین حق کا داعی ہے، وہ اسی کے ساتھ بلاغت وفصاحت اور دعوت اسلامی کا ترجمان ہے، اس کے سرورق پر ''شعارنا الوحید إلیٰ الإسلام من جدید'' کا ہر ماہ اعلان ہوتا رہتا ہے۔

قلمی جہاد اور غیرت ایمانی، حق گوئی وبے باکی

محمد میاں نے شروع ہی سے اپنے عم مکرم ہی کے نقش قدم پر چل کر ۱۹۵۵ء ہی

سے البعث الاسلامی کے ذریعہ پوری جسارت وحق گوئی و بے باکی اور غیرت ایمانی کے ساتھ عرب قومیت، سوشلزم اور استعماریت کے خلاف قلمی جہاد کرنا شروع کیا، اور ان شخصیات اور حکومتوں کا پوری جسارت و جرأت کے ساتھ محاسبہ کیا جو اسلام کی دعویدار اور مسلمانوں کی قیادت سنبھالے ہوئے ہیں۔ روز بروز ان کے قلم میں شوخی و تندی وتیزی اور ان کے ساتھ ساتھ نکھار پیدا ہوتا اور بڑھتا ہی گیا اور انھوں نے اپنی تحریر کے ذریعہ احتساب کی حد وہاں تک پہنچادی کہ "کلمة حق عند سلطان جائر" کے مصداق بن گئے اور کہنے والے کو کہنا پڑا ؎

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

محمد میاں نے اکتوبر ۱۹۵۵ء سے لے کر آخری وقت (۱۹۷۹ء) تک بلاخوف "لومة لائم" یہی فریضہ انجام دیا اور راہ کا سب سے بڑا روڑا جو خوف وطمع کی شکل میں اکثر مسافر کے قدم کو ڈگمگا دیتا ہے اور بڑے بڑے صاحب استقامت کے قدم بھی ڈگمگا جاتے ہیں اس نوجوان راہی اور مجاہد کے قدم کو نہ روک سکا اور اس کا قلم راہ جہاد میں رواں دواں رہا اور تیز رفتاری کے ساتھ چلتا ہوا اس کی زندگی کی آخری سانس کے رکنے پر اس کو بھی مجبوراً ٹھہرنا پڑا۔

عربوں کا احتساب

اپنی زندگی کے اس آخری شمارہ میں جو بلاشرکت غیر انھوں نے البعث الاسلامی کا مرتب کیا تھا، اپنے قلم سے دو مضمون ایسے تحریر کیے تھے جو احتساب، حق گوئی و بے باکی کا اعلیٰ ترین نمونہ ہیں، ایک مضمون کا عنوان ہے: "سؤال حائر يحتاج إلى جواب" اس میں سعودی حکومت کے سامنے ایک سوال رکھا اور بہت صفائی کے ساتھ اس کا محاسبہ کیا ہے وہ محاسبہ کرتے کرتے لکھتے ہیں:

"أيها الجزيرة وأيها الحراس عليها والأمناء على أبنائها

وبناتها ويا بنات تاريخها الحديث! إن مؤاخذتنا عليكم ستكون أشد وأقسى بالنسبة إلى البلاد العربية الأخرى ما دمتم داعين إلى دين الله الحنيف وما دمتم متمسكين بالكتاب والسنة وما دمتم تتخذون الإسلام منهجا و دستورا ونبراسا، وبما أن دعوتكم إلى الإسلام أقوى، فإن مؤاخذتنا عليكم على هذا القدر اشد وأنكى وهي أن لا تجعلوا أقوالكم متناقضة مع الحياة العامة في البلد وما يجري في داخل البيوتات والأسر وما تعرضه النشاشة الفاتنة لأنظار الناشئين ...... أفلاذ أكبادكم التي تمشي على الأرض فإن هذه الدعوة الصارخة المستمرة العلنية المكشوفة إلى الإسلام بل إلى التوحيد والكتاب والسنة، وهذا العطف النافع المبارك على النشاطات الإسلامية والحركات الإسلامية وتوزيع الكتب الإسلامية وإرسال المعونات والوفود والبعثات وطبع المصاحف وانشاء مدارس جديدة لتحفيظ القرآن الكريم تتناقض كليا مع هذا الترف الذى يوهن العقيدة ويوهن العزم بل ويوهن الجسم ومع هذه الأغنيات ومسلسلات الغرام ومظاهر العرى في الاذاعات المرئية والمسموعة انها تتناقض مع هذا التفاوت الطبقي الفاحش بين المدنية والبادية وبين الأغنياء والفقراء ومع هذه العيشة الغربية الاستقراطية الإباحية المترفة الغارقة في الملاهي واللذات التي قد تشعرون بها وتلمسونها

بالبنان."

اسی شمارہ میں "صور و أوضاع" کے تحت اپنے مضمون "يا مصر اشكري ولا تكفري" میں مصر کو خطاب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"فهلمي إلى الإسلام قبل أن تشق العودة أو تطول الطريق، كوني دولة تعيش للإسلام لا دولة تعيش للقمة العيش، دولة تطمح إلى القيادة العالمية وهداية البشرية لا دولة تغير الازياء وتغير الاسيار بعد كل سنوات قليلة، إلى الإسلام من جديد، والإسلام سيمنحك الأمن والعزة والرخاء إلى جانب الثبات والاستقامة والوفاء."(۱)

وہ کتنے جوش کے ساتھ لکھتے ہیں:

"ما لي أراك تستنكرين لابنك البار الامام الشهيد حسن البناء وتضمين إليك بسجن الارهابى وتهددين شباب الاخوان المسلمين شباب الطهر والعفاف وتعانقين الشباب الامريكى الهزيل المائع والشباب الاسرائيلى الخبيث الماكر."

اپنے ایک مضمون میں "الإسلام منهج شامل" کے عنوان کے تحت اسلام کی ترجمانی ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"إن الإسلام ثقافة ولكنها ثقافة قرآنية، فقد سئلت عائشة رضى الله عنها عن خلق النبي الكريم صلى الله عليه وسلم فقالت : كان خلقه القرآن. وإن الاسلام حضارة ولكنها حضارة إلٰهية وإن للإسلام مجتمعا

---

(۱) البعث الاسلامی، رجب ص/ ۹۸-۹۹

ولـكـنـهـا مـجـتـمـع رباني وان الذين يريدون ان يفصلوا الإسـلام عن الثقافة والحضارة وعن الاجتماع والسياسة ويـقـطعوا صلته بالمجتمع والبرلمان والمحكمة والإدارة والاقتـصـاد والتجـارة لا يفعلون ذلك إلا جهلوا بالإسلام ديـاسـا مـن عودته وهو عائد إن شاء الله وقد سـمعنا وقع اقـدامـه فـى بـعـض الـبـلاد الإسلامية البعيدة عن معاقل العروبة والإسلام."

اکابرین ومعاصرین کا اعتراف

محمد میاں نے عربی زبان میں جس طرح دین و اخلاق کی خدمت کی ہے اور عرب ممالک میں اپنے مقالات اور البعث الاسلامی کے اداریوں کے ذریعے عرب قومیت، استعماریت، صہیونیت اور سوشلزم کے خلاف جو کامیاب جہاد کیا ہے، اس کے اثر اور جذب وکشش کو سارے ادباء اور علماء عرب نے تسلیم کیا ہے اور اس نوجوان مجاہد کے فکر ونظر اور اس کی تحریروں کی زود اثری، حلاوت اور قوت وطاقت کا دل کھول کر اعتراف کیا ہے۔

مولانا محمد الحسنی کی کتاب "الإسلام الممتحن" جس میں ان کے اداریوں کو جمع کیا گیا ہے اور جس کے کئی ایڈیشن مصر میں چھپے ہیں کے متعلق ایک تبصرہ نگار کا تبصرہ ہے:

> "ان کی وہ کتاب جس نے عالم عربی میں ان کی شہرت کو بام عروج پر پہنچادیا "الإسلام الممتحن" ہے، جس کے چار ایڈیشن مصر سے شائع ہوئے، اس کتاب کی عرب نوجوانوں میں بڑی پذیرائی ہوئی، جو بہت کم کتابوں کو نصیب ہوئی، اس کتاب نے مشرق وسطیٰ سے مشرق بعید تک دینی اور دعوتی حلقوں کو متاثر کیا، انڈونیشیا کی ممتاز شخصیتوں نے اس کی خوب اور خوب

تعریف کی اور وہاں کے بڑے بڑے اجتماعات میں اس کے مضامین سنائے گئے۔

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی اس پر اپنے مبسوط مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''پیش نظر کتاب کے مقالات دعوتِ غور وفکر دیتے ہیں اور اسلامی طرز تفکیر کے نئے گوشے کھولتے ہیں اور دعوتی میدان میں کام کرنے والے حضرات کے لیے بعض جدید معلومات مہیا کرتے ہیں، وہ مادی فلسفہ حیات کی بے مائیگی اور مغربی تہذیب کے کھوکھلے پن اور اس کے افلاس کا پردہ چاک کرتے ہیں۔''

مولانا موصوف آخر میں صاحب کتاب (محمد الحسنی) کے متعلق لکھتے ہیں:

''صاحب کتاب کے ذہنی وفکری، ادبی اور دینی نشو ونما وارتقاء میں ان کے مخصوص ماحول، خاندان، والد ماجد کی یگانہ شخصیت کی تعلیم وتربیت اور اس لٹریچر کا جوان کے گرد وپیش موجود ہے کا فیض شامل ہے، اس کا تذکرہ تفصیل سے آچکا ہے، آخر میں اس واقعہ کا اظہار ضروری ہے کہ ان کا زورتحریر، جوش بیان، ہندوستان سے قدم باہر نکالے بغیر عربی تحریر وانشاء پر ایسی قدرت جوان کے بزرگوں اور معاصرین سب کے لیے موجب حیرت بلکہ ایک طرح کا حیرت انگیز انکشاف ہے، بڑے بڑے اہم موضوع پر قلم برداشتہ اور برجستہ لکھنے کی صلاحیت، تحریر کی تاثیر اور دل آویزی تنہا اس ماحول اور تعلیم وتربیت کا نتیجہ نہیں ہے اور نہ ان کی باقاعدہ تعلیم ودرسیات کو (جو نا قابل قیاس حد تک مختصر محدود اور ان کے والد ماجد کے مجتہدانہ طریق تعلیم پر ہے) اس سے کوئی مناسبت ہے، ان کا معاملہ بالکل وہبی اور خداداد ہے، ان کے مضامین میں جو زور (اور آمد ہی آمد) اور ان کی تحریر میں جو تاثیر

ہے وہ محض زور قلم اور حسن بیان کا نتیجہ نہیں، بلاد عربیہ خصوصاً مصر وشام میں بڑے بڑے اہل قلم اور اہل فکر موجود ہیں، جن کی زبان عربی، اور تحریر وانشاء ان کا شب وروز کا مشغلہ ہے، لیکن ان کی تحریر میں وہ حلاوت و بلاغت اور قوت وحرارت نہیں جو اس ہندنژاد اور نوخیز داعی اور انشاء پرداز کے قلم میں ہے، یہ اس کے سوز دروں اور جذب اندروں کا نتیجہ ہے، اور اس کو اقبال کے الفاظ میں یہ کہنے کا حق ہے ؎

خون دل وجگر سے ہے میری نوا کی پرورش
ہے رگ ساز میں رواں صاحب ساز کا لہو''

''البعث الاسلامی'' میں محمد میاں کے شریک ادارت اور دار العلوم ندوۃ العلماء کے استاد مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی یوں خراج تحسین پیش کرتے ہیں:

''مولانا کے قلم میں ایسی طاقت وتاثیر تھی جو مردہ دلوں میں زندگی پیدا کردیتی تھی، ان کے عربی اور اردو کے مضامین زبان وبیان اور اسلوب نگارش کے لحاظ سے اعلیٰ ترین معیار پر پورے اترتے تھے، البعث الاسلامی کے ہر شمارہ میں ان کا افتتاحیہ ہی دراصل پرچہ کی جان ہوتا تھا، مجھے ذاتی طور پر معلوم ہے کہ عرب نوجوانوں اور اہل قلم کی ایک بڑی تعداد ان کے اداریوں کے لیے بے چین رہتی تھی، جب ان کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ تحریر ایک ایسے نوجوان عالم وادیب اور صاحب قلم کی ہے جس نے عرب ممالک میں کوئی تربیت نہیں حاصل کی ہے اور نہ کسی عرب ملک میں وقت گزارا ہے تو ان کے تعجب کی انتہا نہیں رہتی تھی، مصر وشام اور اردن وحجاز کی دینی جماعتوں سے تعلق رکھنے والے عرب علماء و ادباء اور

اخوانی نوجوانوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ جب دنیا کے کسی حصہ میں جمال عبدالناصر کے غلط تصرفات اور اس کی اسلام کشی کے خلاف کوئی آواز اٹھانے کی ہمت کسی میں نہیں تھی تو تنہا محمد الحسنی مرحوم نے عبدالناصر کی حقیقت کو آشکارا کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا، اور باوجود خطرات وموانع کے وہ اس مقدس فریضہ سے باز نہیں آئے، جس کا جی چاہے ''البعث'' کے وہ مضامین اور افتتاحیے پڑھ لے جس میں انھوں نے قومیت کے بت تراش آزر کے ساتھ پنجہ آزمائی کی ہے اور اسے آخری انجام تک پہنچا کر دم لیا ہے۔

یہی نہیں بلکہ جب بھی عالم اسلام کے کسی گوشے میں کوئی آزرو مانی، کوئی فرعون ونمرود، کوئی مسیلمہ کذاب، کوئی چنگیز و ہلاکو، کوئی ہٹلر ومسولینی، کوئی لینن واسٹالن نمودار ہوا یا کوئی غلط تحریک و دعوت ظاہر ہوئی تو بلا تاخیر مولانا کے قلم کا سیل رواں جوش میں آیا اور پوری قوت کے ساتھ اس کو کچلنے اور حقیقت آشکارا کرنے کی کوشش کی، وہ قلم کو ایک مقدس امانت سمجھتے تھے اور اس کو بہت ہی احتیاط کے ساتھ دعوت حق اور فکر اسلامی کی ترویج واشاعت میں اور باطل کی سرکوبی اور اس کو پسپا کرنے میں صرف کرتے تھے، ان کا قلم عربی اور اردو دونوں زبانوں میں یکساں مہارت رکھتا تھا، اور وہ اپنی اس صلاحیت کو بروئے کار لانے میں کوئی پس و پیش کبھی نہیں کرتے تھے۔'' (۱)

ان کے ایک دوسرے رفیق کار اور صاحب فکر ونظر صحافی وداعی (۲) یوں لکھتے ہیں:

(۱) تعمیر حیات/محمد الحسنی نمبر، ص ۲۳۸

(۲) مراد مولانا اسحاق جلیس ندوی ایڈیٹر تعمیر حیات ہیں جو آئندہ مہینے خود بھی وفات پاگئے۔ (م)

''مغربی تہذیب، قومیت وطنیت اور اشتراکیت کا سحر جس نے عالم اسلام خاص طور پر ممالک عربیہ کو مسحور کردیا تھا، کامل واکمل دین اور ابد تک نوع انسانی کی رہنمائی کرنے والے ضابطہ حیات کی حیثیت سے اسلام پر بے یقینی کے عمومی سیلاب نے عالم اسلام اور دنیائے عرب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، اس دور میں ایسے پرزور قلم کی ضرورت تھی جو شک وارتیاب میں مبتلا اذہان میں ازسرنو ایمان ویقین کی مشعل روشن کرے، جو غیر اسلامی نظریات کے کھوکھلے پن کو بے نقاب کرے، جو امت مسلمہ کو اس کے اصل منصب ومقام سے آشنا کرے، جس میں لذت و کردار اور جرأت اندیشہ ہو، جو زبان وادب کو ایک نیا دعوتی اسلوب بخشے، اللہ تعالیٰ کی توفیق، ماحول کی تربیت اور وقت کی ضرورت نے مرحوم کو صرف بیس سال کی عمر میں ایک عربی ماہنامہ کے اجراء پر آمادہ کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ''البعث الاسلامی'' کے نام سے جلائی ہوئی اس جوت نے نہ جانے کتنے تاریک دل ودماغ کو ایمان ویقین کی روشنی سے منور کیا، اس صوراسرافیل نے نہ جانے کتنے غفلت کے متوالوں اور نیند کے مدہوشوں کو بیدار کیا، اوران میں نئی روح پھونک دی، اس ضرب کلیمی سے الحاد ودہریت، قومیت واشتراکیت کے کتنے ہی بت پاش پاش ہوئے، البعث الاسلامی کے سرورق کا یہ جملہ "شعارنا الوحيد إلى الإسلام من جديد" عالم اسلام کی نوجوان نسل کے دلوں کی دھڑکن بن گیا، نوجوانوں کی حد تک مرحوم کے سلسلہ میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ

شورش عندلیب نے روح چمن میں پھونک دی
ورنہ کلی کلی یہاں مست تھی خواب ناز میں

محمد الحسنی بھلائے نہیں جاسکتے کیونکہ وہ معرکہ ابھی برپا اور وہ محاذ ابھی گرم ہے جس کے ہراول دستے کے وہ سپاہی بلکہ صف اول کے رہنما تھے، دین و لادینیت اور حق و باطل کی کشمکش اب فیصلہ کن موڑ پر پہنچ چکی ہے، ایسے نازک موقع پر محمد الحسنی کیوں کر یاد نہ آئیں، پچیس سال تک انھوں اپنے قلم کے ذریعہ جو جہاد کیا تھا، جو دعوت دی تھی، جو صدا لگائی تھی اس پر عالم اسلام کے لاکھوں نوجوان لبیک کہہ کر پیش قدمی کر رہے ہیں، مراکش سے انڈونیشیا تک ملت اسلامیہ کی نئی نسل میں دینی بیداری کے آثار، مسلم ممالک میں اسلامی شریعت کے نفاذ کے مطالبات اور دیار غرب میں اسلام کی طرف بازگشت کی علامتوں کو اپنی زندگی کے آخری ایام میں دیکھ سن کر مرحوم بہت مسرور ہوتے تھے، سال گزشتہ ان ہی دنوں میں پاکستان میں اسلامی ایشیائی کانفرنس میں رفاقت رہی، مختلف شہروں میں جانا ہوا، ہر سطح کے عوام و خواص سے ملاقاتیں رہیں، مرحوم کو ہر موقع پر دین کے غلبہ اور دین داروں کے ہاتھ ملکوں کی زمام قیادت کا متمنی اور دعا گو پایا۔'' (۱)

محمد الحسنی نے کتابوں کی تصنیف، تلخیص اور ترجمے کیے، ان کے علاوہ اپنی زندگی میں بے شمار مقالات اور مضامین لکھے جو ہند و پاک کے مجلّات اور رسالوں میں برابر نقل ہوتے رہے اور لاکھوں انسانوں نے ان کو پڑھا اور محمد الحسنی کے ادب، تحریر کی تاثیر، فکر

(۱) تعمیر حیات صفحہ ۲۶۲-۲۶۳ (خصوصی اشاعت جنوری ۱۹۸۹ء)

ونظر اور ذوق سلیم اور دعوت وتبلیغ کے جذبے اور بہتر سے بہتر حالات حاضرہ کے تجزیہ کے قائل ہوئے، مولانا حکیم عبدالقوی صاحب مدیر ''صدق جدید'' لکھتے ہیں:

''اردو تصانیف کے ساتھ ساتھ ''تعمیر حیات'' ''ندائے ملت'' میں اہم ملی وملکی سیاست پر مواد لکھتے رہے، اوران کی تحریر موثر و جاندار اور بہت سی صورتوں میں ایمان تازہ کرنے والی ہوتی...... ان کی استعداد وقابلیت کسبی کے ساتھ وہبی بھی تھی اس شعر کے عین مطابق ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ''(۱)

جدید افکار ونظریات کا مقابلہ

مولانا محمد الحسنی نے جدید افکار ونظریات کا جو اسلامی فکر وتعلیم سے متصادم تھے اور ایک قسم کے ارتداد کی دعوت دے رہے تھے، پوری قوت ایمانی سے مقابلہ کیا، ان کا یہ قلمی جہاد عربی زبان کے ذریعہ جس طرح تھا اور اردو زبان کے ذریعہ بھی رہا، ان کی تحریرات ومقالات کے چند نمونے پیش ہیں جن کے مطالعہ سے ان کی تحریر کی گہرائی و گیرائی اور ان کے فکر وذوق کی بلندی ولطافت اور کلمہ حق کے بے باکانہ اظہار کا اندازہ ہوگا، رضوان، الفرقان، ندائے ملت، تعمیر حیات کے ذریعہ انھوں نے یہ صدا بلند کی اور پھر تصنیف وتالیف کے ذریعہ بھی، لکھنؤ کے ہفتہ وار ''ندائے ملت'' میں لکھتے ہیں:

''آج اپنے خیالی جزیروں میں پناہ لے کر یا ساحل کے خاموش تماشائی بن کر ہم علم وادب اور سیاست وقوت کی دنیا میں کوئی دیرپا نقش ہرگز قائم نہیں کرسکتے، اس کے لیے بڑی زندگی اور

(۱) ندائے ملت لکھنؤ، یکم جولائی ۱۹۷۹ء۔

زندہ دلی، بڑے ایمان ویقین، بڑے اخلاق وکردار، بڑے علمی رسوخ اور امتیاز، اور بڑی کاوش اور ریاض کی ضرورت ہے، اور یہ مقدس فرض وہی خوش نصیب وباہمت نوجوان انجام دے سکتے ہیں جن کے سینوں میں علم نبوت کا نور، جن کے دلوں میں خیالات کو بدلنے کا عزم وحوصلہ، جن کی رگوں میں زندگی کا ابلتا ہوا نیا خون، جن کے قدموں میں فاتح کا اعتماد وسرفروشی، جن کی آنکھوں میں عزم ویقین کی روشنی اور جن کی دمکتی ہوئی پیشانیوں پر ستارۂ اقبال وہوش مندی ہویدا ہو۔"(۱)

حقیقت پسند کون؟

"پروگریسو یعنی حقیقت پسند کون ہے؟" کے عنوان سے تیز اور تند لہجے میں ان کو جو اپنے کو ترقی پسند یا حقیقت پسند کہتے ہیں خطاب کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"دنیا میں ایک گروہ ہے جو اپنے کو پروگریسو (Progressive) کہتا ہے اور اس کا دعویٰ ہے کہ وہ سب سے زیادہ حقیقت پسند (Realist) ہے، حقیقت (Fact) کا لفظ اس کے نوک زبان رہتا ہے اور اس کو اس پر بڑا ناز ہے، کچھ سیدھے سادے لوگ اس سے مرعوب بھی ہیں، یہ گروپ صرف دہلی، بمبئی، کیرالا یا لاہور وکراچی میں نہیں بلکہ کسی نہ کسی درجہ میں ہر جگہ پایا جاتا ہے، اور عرب ممالک میں بھی ان کا بڑا زور ہے، ہمیں دیکھنا چاہیے کہ اس کی اس حقیقت پسندی کا جغرافیہ اور حدود اربعہ کیا ہیں؟ اس سلسلہ میں سب سے پہلا سوال جو ہمارے سامنے آتا ہے وہ یہ

---

(۱) ندائے ملت ۸؍جولائی ۱۹۷۹ء۔قارئین نے تاریخ سے محسوس کرلیا ہوگا کہ ان کا یہ مضمون وفات کے بعد ندائے ملت میں شائع ہوا۔(م)

ہے کہ اس دنیا کی سب سے بڑی حقیقت کیا ہے؟ اگر دنیا والوں سے عام طور سے یہ سوال کیا جائے کہ اس دنیا میں سب سے بڑا (Fact) کیا ہے جس سے انکار کسی کو بھی ممکن نہیں؟ تو ان کا جواب صرف ایک ہوگا۔ موت، سورج، چاند بھی یقیناً نظر آتے ہیں لیکن اس میں بھی انسانوں نے ہمیشہ اختلاف کیا ہے، زمین کے متعلق بہت سے اختلافات رہے ہیں، خود یہ کہ انسان نے اپنے وجود تک کو شک کی نگاہ سے دیکھا ہے، اور ایک پورا مکتب خیال ہے جو اپنے وجود کا منکر رہا ہے، اس کو فلسفہ کی زبان میں لاارادی اور متشکک (Agnostics) وغیرہ کہا جاتا ہے، لیکن ایک حقیقت ایسی ہے جس سے کسی کو انکار نہیں، جس میں کوئی اختلاف نہیں اور وہ ہے موت کا واقع ہونا۔

اس نقطۂ نظر سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ ان ترقی پسندوں سے زیادہ حقیقت سے منہ چرانے والا اور دامن بچانے والا شاید کوئی اور نہیں، یہ لوگ سب سے زیادہ موت کے تذکرے سے چڑھتے ہیں، چنانچہ ان کے لٹریچر میں ہر چیز کا ذکر مل جائے گا لیکن اس بہت بڑے (Fact) کا ذکر نہیں ملے گا، یہ دانشور شترمرغ کی طرح ریت میں منہ چھپا کر یہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے موت سے نجات حاصل کرلی، اس کی ترکیب انھوں نے یہ نکالی کہ دنیا کی چھوٹی چھوٹی حقیقتوں پر اس قدر زور دینا شروع کردیا کہ اصل حقیقت پر غور کرنے کی فرصت ہی کسی کو نہ ملے، روٹی، کپڑا، مکان؛ یہ وہ حقیقتیں ہیں جو اس سب سے بڑی حقیقت کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتیں، اور اس میں تھوڑی بہت کمی بیشی

سے صورت حال میں کوئی فرق نہیں پڑتا، لیکن ان دشمنان عقل کا سب سے بڑا قومی جرم یہ ہے کہ انھوں نے لاکھوں انسانوں کو فریب میں رکھا اور حقیقت پسندی کے نام پر ان کو حقیقت سے اتنا دور کر دیا کہ آج یہ صدا ان کے لیے نامانوس ہو چکی ہے، روس اور چین کے بدنصیبوں کو چھوڑیے ان کی تو دنیا بھی گئی، عقبیٰ بھی، خود عالم اسلام میں ان دوست نما دشمنوں نے ایسی سوسائٹی پیدا کر دی جو عالم خیال میں یا عالم انتظار میں زندگی گزار رہی ہے، فریب نظر کا شکار ہے، حقیقت پسندی اور سچائی سے اس کو دور کا بھی واسطہ نہیں، جو سب سے زیادہ کم عقل ہے اور اپنے کو سب سے زیادہ عقل مند سمجھ رہا ہے، جہل مرکب میں مبتلا ہے، دو روٹی کی بات اس کی سمجھ میں آجاتی ہے لیکن موت کی حقیقت سمجھنا سمجھانا تو درکنار اس حقیقت کا اعلان بھی اس کو سخت ناگوار اور بارخاطر ہوتا ہے۔

بعض بادشاہوں، نوابوں اور بڑے جاگیرداروں کے متعلق سنا ہے کہ ان کے یہاں اس کی باقاعدہ ہدایت ہوا کرتی تھی کہ ان کی مجلس میں موت کا نام بھول کر بھی نہ آئے، یہاں تک کہ جو واعظ یا قاری کبھی مجلس میں بلائے جاتے ان کو اس کی ہدایت کی جاتی کہ وہ اس کا خیال رکھیں، چنانچہ وہ ہر بات کہتے لیکن یہ نہیں کہتے، مصاحب بھی دل سے چاہتے تھے کہ بادشاہ سلامت یا نواب صاحب کے کان موت کے تذکرے سے ناآشنا ہی رہیں، ایسا نہ ہو کہ یہ حقیقت ان کے دل میں اتر جائے اور یہ ساری رنگینیاں اور آزادیاں یک قلم موقوف ہو جائیں، لیکن دنیا جانتی ہے کہ ایک

حقیقت پسند اور نڈر عالم نے اس کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنی پوری تقریر موت ہی پر کی اور بادشاہ کے یہ سن کر کان کھل گئے کہ وہ اب تک اتنی بڑی حقیقت سے غافل تھا، چنانچہ وہ اسی وقت تائب ہوا اور نئی زندگی اختیار کی۔

جاگیرداری کا پرانا اور فرسودہ اور احمقانہ روایتی نظام اب اشتراکیت اور ترقی پسندی کے دم قدم سے زندہ ہے بلکہ پہلے سے زیادہ طاقتور ہے، شخصی نظام میں کسی کے دل پر یہ بات اثر کرتی تو اس کے حدود اختیار اور دائرہ سلطنت کی حد تک دنیا بدل جاتی، پارٹی سسٹم اور اشتراکی آمریت میں اس طرح کی گنجائش بھی نہیں رہی، ان لوگوں نے پوری دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے، ترقی پسند (Progressive) اور رجعت پسند (Reactionary)، سرمایہ دار (Apitalist) اور محنت کش (Workers) یہ تقسیم انھوں نے اس مقصد سے قائم کی تاکہ کسی تیسرے خیالی کو دراندازی کا موقع نہ مل سکے، ہمارا کہنا صرف یہ ہے کہ یہ لوگ سب کچھ ہوسکتے ہیں حقیقت پسند بہرحال نہیں ہوسکتے ہیں، ان کو چاہیے پہلے موت کے خلاف ایجی ٹیشن (Agitation) کریں، محنت کش عوام کو موت کے خلاف متحد (Mobilize) کریں، جو دبے پاؤں چلی آتی ہے، پہلے موت کو موت سے ہمکنار کریں، اس کے بعد یہ دعویٰ ان کے لیے زیب دے گا کہ وہ واقعی حقیقت پسند ہیں، حقیقت پسند تو وہ ہیں جو اس (Fact) سے کسی وقت غافل نہیں، جو سب سے پہلے اس کی فکر کرتے ہیں اس کے بعد روٹی کپڑے اور دوکان کی۔

ان ترقی پسندوں نے مزدوروں سے روٹی بھی چھینی اور آخرت بھی، کتنے مزدور موت کے منھ میں چلے گئے اور ان کو کمیونسٹوں کی خیالی جنت کی خیالی امیدوں کے سوا کچھ اور نہ ملا، آج وہ لوگ جو فیشن پرستی اور ترقی پسندی کے شوق میں اپنی زندگی سے جوا کھیل رہے ہیں، اور اپنا مستقبل تاراج کر رہے ہیں، اس کی سب سے بڑی حقیقت سے منھ موڑ رہے ہیں، جس سے نہ ماسکو میں مفر ہے نہ تاشقند میں، نہ صفدر جنگ کے اسپتال میں، جو آزربائیجان اور ازبکستان میں زور لگا لگا کر ان کوششوں میں مصروف ہیں کہ عمریں ساٹھ ستر کے بجائے اسی نوے تک پہنچ جائیں، لیکن ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ موت ہی سے چھٹکارا حاصل کرلیا جائے اور اس دنیا کی فکر کی جائے جہاں سب کو جانا ہے اور ہمیشہ رہنا ہے، جس کے مقابلہ میں پوری دنیا کی عمر ایک ساعت سے زیادہ نہیں، ان کو کبھی فرصت کے وقت، کبھی رات کو سونے سے پہلے یہ سوچنا چاہیے کہ وہ اس طرح حقیقت سے آنکھیں بچار ہے ہیں یا مردانگی کے ساتھ اس کا سامنا کرنے کو تیار ہیں اور اس کو شیریں بنانے کا ذریعہ بھی جانتے ہیں۔

قرآن مجید نے موت (Fact) کے بارے میں کہا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ﴾ (خدا کی عبادت کرتے رہو اس وقت تک کہ یقینی چیز (موت) تمہارے سامنے آجائے)

دوسری جگہ آیا ہے:

﴿وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَى فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَى﴾ (جو اللہ کے سامنے حاضری اور جواب دہی سے ڈرتا ہے اور نفس کو خواہشات سے باز رکھتا ہے تو بے شک اس کا ٹھکانہ جنت ہے)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"الکیس من دان نفسہ وعمل لما بعد الموت" (عقل مند اور ہوشیار وہ ہے جو اپنی زندگی کا حساب رکھے اور موت کے بعد کی تیاری کرے)۔

یہ وہ چیلنج ہے جو قرآن مجید دنیا کے انسانوں کو دیتا ہے، جو خدا کی ہدایت، خدا کی کتاب اور نبوت کی روشنی سے بے نیاز ہو کر اپنی زندگی سے مسائل حل کرنا چاہتے ہیں، ہماری دعوت اور درخواست ہے کہ وہ صحیح معنوں میں حقیقت پسند بننے کی کوشش کریں، اور اس کی رٹ لگانے کے بجائے کبھی سنجیدگی کے ساتھ غور کریں۔" (۱)

عرب قومیت کی دعوت پر تنقید

مصر کے صدر اور عرب قومیت کے علمبردار جمال عبدالناصر کے انتقال پر بعض حلقوں کی طرف سے اظہار افسوس کرتے ہوئے سوگ منائے جانے اور انھیں قائد و مجاہد خیال کرنے پر سخت ردعمل ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جمال عبدالناصر کے انتقال پر بعض حلقوں میں جس طرح سوگ منایا گیا اور ان کو غازی اسلام، صلاح الدین ایوبی، محسن انسانیت، اور بطل حریت جیسے مختلف خطابات سے نوازا گیا ہے وہ اس لیے قابل مذمت اور قابل افسوس ہے کہ اس میں زیادہ تر دخل

---

(۱) رضوان محمد الحسنی انتخاب نمبر ص ۱۶

بے خبری، بے بصری کا ہے، ان لوگوں کا مبلغ علم اور منتہائے نظر اس سلسلہ میں چائے کی پیالی یا پان کی ڈبیہ کے ساتھ صبح کے اخبار سے زیادہ نہیں، حیرت کی بات ہے کہ وہی اس کی راہ میں سنگ گراں تھے اور ہندوستان کے ارباب علم ودانش ان کو اتحاد اسلامی کا داعی، ملت کا محسن وغیرہ وغیرہ قرار دیں۔

اس وقت جبکہ بعض لوگ ﴿لَا یَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فِی الْبِلَادِ﴾ (آل عمران: ۱۹۵) اور ﴿أَذْهَبْتُمْ طَیِّبَاتِكُمْ فِیْ حَیَاتِكُمُ الدُّنْیَا﴾ (الاحقاف: ۱۹) کے قرآنی اعلان اور تنبیہ اور تصریح کے باوجود محض ان کے دنیاوی دور دورہ یا صحافتی پروپیگنڈہ سے مرعوب ہورہے ہیں، ہمیں ذرا سنجیدگی اور ٹھہراؤ کے ساتھ مسئلہ کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

عربی قومیت سے ہمارے اختلاف کی اصل بنیاد یہ ہے کہ وہ اسلام کی حریف اور نبوت محمدی کی رقیب بن چکی ہے، وہ محض حب الوطنی، جذبۂ آزادی اور استعماری قوتوں سے نفرت کا مظہر نہیں، جیسا کہ عام طور پر سادہ لوح اور نیشنلسٹ مسلمان سمجھتے ہیں، بلکہ اس نے ان جذبات کے سہارے پر اور ان سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک ندا، اور متوازی مذہب کی داغ بیل ڈالی، جو اب تک نبوت محمدی (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے حساب پر پھلتا پھولتا رہا، اسی طرح جمال عبدالناصر سے ہمارے اختلاف کی اساس یہ ہے کہ وہ اس وقت اس نئے مذہب کے سب سے بڑے علم بردار اور سب سے بڑے ذمہ دار ہیں، اور ان کی شخصیت اس کے ساتھ اس طرح گھل مل گئی ہے کہ ایک کو دوسرے سے

علاحدہ کر کے صحیح رائے نہیں قائم کی جا سکتی ہے، عرب اسرائیل جنگ کے موقع پر جب مصر کی مجلس الامۃ نے جمال عبدالناصر کو کئی اختیارات سپرد کیے تو اس وقت انور السادات صدر مجلس نے تقریر کرتے ہوئے ان کے متعلق یہ الفاظ کہے تھے:

"صهر تاريخه فى قلب التاريخ الحديث للأمة العربية حتى أصبح بحق شيئاً واحداً هو الإرادة الثورية العربية القومية والقادرة على صياغه الحياة من جديد."

(ان کی تاریخ عرب قوم کی جدید تاریخ کے قلب میں ڈھل گئی ہے اور وہ دونوں بجا طور پر ایک چیز بن گئے ہیں وہ ہے طاقتور انقلابی عربی عزم وارادہ جو اپنی آرزوؤں اور امنگوں کے مطابق زندگی کو از سر نو ڈھالنے پر قوی اور قادر ہے)۔

یہ نیا مذہب فرعونی تہذیب پر فخر، قومیت کے جاہلی اور ملحدانہ تصور، مارکسی اشتراکیت اور جاسوسی و دہشت پسندی کے ستونوں پر قائم ہے اور یہی اس کے حدود اربعہ یا عناصر اربعہ ہیں، ان کے نبی جمال عبدالناصر، اس کا صحیفہ آسمانی ''میثاق وطنی'' (مصر کا مشہور قومی منشور) اور اس کے حواری ''انقلابی قیادت'' کے ممبر، اخباروں و رسالوں کے ایڈیٹر اور ''صوت العرب'' کے اناؤنسر ہیں، اس لیے عربی قومیت کو سمجھنے کے لیے جمال عبدالناصر اور ان کے افکار و خیالات اور جذبات ورجحانات کو سمجھنا ناگزیر ہے۔

جمال عبدالناصر کی شخصیت، ان کے افکار و خیالات، بیانات و اعلانات اور ان کے طریقۂ کار کے مطالعہ سے پہلا تأثر ہم کو یہ حاصل ہوتا ہے کہ وہ نہ کمیونسٹ ہیں نہ سوشلسٹ، نہ رجعت پسند

ہیں نہ ترقی پسند، وہ سب سے پہلے انانیت پسند ہیں، جس کو قرآن مجید میں فرعون کی زبان سے "أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَى" (میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں) کہا گیا ہے۔ "أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَى" وہ شاہ کلید ہے جس کو لگاتے ہی ان کی پراسرار شخصیت کے پردے ایک ایک کر کے اٹھنے لگتے ہیں، اور ان کی شخصیت ان کے محبوب فراعنہ کے ساتھ ہم آہنگ ہوتی چلی جاتی ہے۔" (۱)

مغربی فکر و تہذیب پر تنقید

مغربی فکر و تہذیب پر تنقید کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"مغربی دنیا نے جس وقت ترقی کے میدان میں اپنا سب سے پہلا قدم رکھا تھا اس وقت اس کے سامنے مستقبل کا بہت درخشاں حسین اور خوش آئند پہلو تھا، جس طرح پہاڑ کی چوٹی پر برف کی موٹی تہہ جم جاتی ہے اور سورج کی شعاعوں سے اس میں طرح طرح کے رنگ پیدا ہو جاتے ہیں اور اس کی وجہ سے اس کا منظر بہت دل فریب اور سحر آگیں ہو جاتا ہے، لیکن ایک وقت وہ بھی آتا ہے جب برف پگھلنے لگتی ہے اور بسا اوقات کھردری اور چٹیل چٹانیں بے پردہ ہو کر سامنے آجاتی ہیں، اسی طرح مغربی دنیا کے سامنے ایک بلند دشوار اور حسین چوٹی تھی مادی ترقی کی، لذت و راحت کی، تعیش کی، جس نے اس کے سارے سفر اور ساری جدوجہد کو ایک دلچسپ اور پر لطف ایڈوانچر بنا دیا تھا، اس کے پاس یہ سوچنے کی فرصت ہی نہ تھی کہ جس منزل کی طرف ہم اپنی محویت اور سرعت کے ساتھ بڑھ رہے ہیں اس کی حقیقت کیا ہے؟ وہ

(۱) تعمیر حیات ۸/ شعبان المعظم ۱۳۹۰ھ (۱۰/ اکتوبر ۱۹۷۰ء)

ایک نشہ تھا جس میں مغربی دنیا کا ہر فرد ڈوبا ہوا تھا، ہر فرد سمجھتا تھا کہ اس چوٹی کو سر کرنے کے بعد اس کی ساری مشکلات خود بخود حل ہو جائیں گی، وہاں اس کو وہ چشمۂ حیواں مل جائے گا جو اس کو زندگی کی حقیقی کامرانی اور لطف سے ہمکنار کر دے گا، اور وہ ہوگی بنی نوع انسانی کی آخری منزل، زندگی کے پر لطف سفر کا آخری اسٹیج، انسان کی سب سے بڑی کامیابی اور منتہائے پرواز۔

لیکن اب جب کہ مغربی دنیا اس کی بلند چوٹی پر پہنچ چکی ہے یا پہنچنے والی ہے اور مادی طاقت کا وہ چشمۂ حیواں اس کی دسترس میں ہے اور وہ اس کو پی کر بڑی حد تک آزما چکی ہے، دیکھ چکی ہے، پرکھ چکی ہے، اب جب کہ سر رشتہ تلافی اس کے ہاتھ سے نکل چکا ہے، اور وہ صرف دوسروں کے لیے سامان عبرت ہے اس کو مایوسی نے گھیر لیا ہے، مایوسی اس کے رگ و ریشہ میں پیوست ہو چکی ہے، اکتاہٹ اور احساس تنہائی نے اس کے پورے نظام زندگی میں اپنے پنجے گاڑ دیے ہیں۔

اس نے جس منزل کی طرف رخ کیا تھا اور جس کے لیے اس نے صدیوں کی مسافت برسوں میں طے کی تھی، جس کے لیے اس نے اپنی زندگی کا لحہ لحہ صرف کر دیا تھا، اپنی ساری صلاحیتوں کو نچوڑ کر رکھ دیا تھا، اس منزل کے آگے اس چوٹی کے سامنے اب صرف خلا ہی خلا ہے، ظلمت ہی ظلمت ہے، ایک مہیب لا متناہی خلا، ایک ابدی ظلمت۔

اس نے اپنے لیے جس منزل کا انتخاب کیا تھا وہ منزل بہر حال مادی تھی؛ اس لیے محدود تھی، فانی تھی، عارضی تھی، اب مغربی

دنیا کے پاس زندگی کا کوئی جواز نہیں ہے اور نہ کوئی اس کی منزل ہی ہے۔"(۱)

جدید تہذیب اور اسلامی تہذیب کا فرق

مغربی تہذیب اور اسلامی تہذیب کا فرق بتاتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"جدید دنیا میں خود غرضی کا نام تہذیب ہے، اسلام میں ایثار و بے غرضی کا- جدید دنیا میں خود پرستی کا نام تہذیب ہے، اسلام میں خود شکنی کا- یہ وہ بنیادی نقطۂ اختلاف ہے جو اسلام کے معیار تہذیب کو موجودہ و گزشتہ تمام ساختہ معیاروں بلکہ صحیح الفاظ میں مفروضات سے بالکل جدا کر دیتا ہے، اس لیے اگر کوئی اسلام کے ضمن میں تہذیب و تمدن کا بار بار ذکر کرتا ہے تو اس کو اچھی طرح سوچ لینا چاہیے کہ اس کے ذہن میں تہذیب کا مفہوم کیا ہے، کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ وہ اپنی بے خبری میں تہذیب کے اس چلتے ہوئے بازاری مفہوم کو مراد لے رہا ہے جس کا علم بردار مغرب ہے، اگر ایسا ہے تو وہ اسلام کی طرف ایک ایسی چیز منسوب کر رہا ہے جس سے اسلام بالکل بری ہے۔

اسلامی تہذیب و تمدن کی جلوہ گری دیکھنے کے لیے ہمیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے جھونپڑے کی طرف دیکھنے کی ضرورت ہے، دمشق و بغداد کے درباروں یا غرناطہ و اشبیلیہ کے زرنگار محلوں کی طرف نہیں، اس کی تشریح کے لیے ابن رشد اور فارابی کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت نہیں، اس کے لیے صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین اور علماء و اولیاء امت رحمہم اللہ کی پاکیزہ اسلامی زندگی

---

(۱) رضوان/محمد الحسنی انتخاب نمبر، ص ۱۰۹

کے عملی نمونے کافی ہیں۔

اسلامی تہذیب' فنون لطیفہ، فن تصویر اور فن تعمیر کے نازک پیچ وخم میں نہیں ملے گی، اس کی تلاش اہل حق کی سیرت، سنت اور عزیمت اور ایثار وخدمت کے ان زندہ جاوید نمونوں میں کرنی چاہیے جن کو امام احمد بن حنبل، شیخ عبدالقادر جیلانی، حضرت نظام الدین اولیاء، مجدد الف ثانی اور حضرت سید احمد شہید رحمہم اللہ جیسے ناموں سے یاد کرتے ہیں۔''(۱)

سیرت نبوی کی لامحدود نافعیت

سیرت نبوی کی ابدی ولامحدود نافعیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مسلمان اگر مظلوم ہیں، پسماندہ ہیں، مغرب کے مقلد ہیں، کمزور و بے بس ہیں، تو یہ قصور اسلام کا، شریعت کا، اور سیرت نبوی کا نہیں، یہ قصور انسانیت کے اس طبیب اور روحانی معالج کا نہیں ہے جس نے ایک ایک بات کھول کر بیان کردی ہے، اور اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے عمل سے اور اپنے ہزاروں لاکھوں ساتھیوں اور جاں نثاروں کے عمل سے اس کو برت کر دکھایا اور فتح و ناکامی، امن اور جنگ، اقلیت واکثریت، تنگی وخوش حالی، خلوت و جلوت ہر حالت میں اس پر چلنے کا طریقہ مسلمان کو سمجھا دیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم جس سوسائٹی میں تشریف رکھتے تھے وہ فرشتوں کی جماعت نہ تھی، گوشت پوست کے ان انسانوں کی جماعت تھی جو دل و دماغ رکھتے تھے، جذبات رکھتے تھے، ان کو ملکوں کا انتظام کرنا پڑتا تھا، سرحدوں کی حفاظت کرنی ہوتی تھی،

---

(۱) رضوان/محمد الحسنی انتخاب نمبر،ص ۵۱-۵۲

تعلیم کی فکر کرنی پڑتی تھی، حدود کا اجرا کرنا پڑتا تھا، نازک فیصلے کرنے ہوتے تھے، ان کے اندر ہر طرح کے مسائل پیدا ہوتے تھے، لیکن ہم میں اور ان میں جو اصل فرق تھا وہ اس نتیجہ کے استعمال کا تھا اور ہدایات پر عمل کے ساتھ اس نسخہ کے استعمال نے ان کو اس مرتبہ تک پہنچادیا کہ فرشتے بھی ان پر رشک کریں۔

اس روشنی میں اگر ہم سیرت نبوی کا پھر سے مطالعہ کریں اور یہ دیکھیں کہ فتح کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا کیفیت تھی، اور دعا کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا حال ہوتا تھا، طائف کی وادی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر کیا گزری، اور فتح مکہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دشمنوں سے کیا سلوک کیا، اقتدار سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا رویہ تھا، اقتدار کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا روش تھی، انصار کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا سلوک تھا، مہاجرین کے ساتھ کیا معاملہ تھا، وفود کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح پیش آتے تھے، اور صلح و معاہدہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مسلک کیا تھا، تو ہم خود اس نتیجہ پر پہنچ جائیں گے کہ انسانیت جس طرح اس زمانہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کی محتاج تھی آج بھی اسی طرح محتاج ہے، اور جب تک یہ دنیا قائم ہے یہ احتیاج بھی قائم رہے گی۔"(۱)

---

(۱) رضوان/ محمد الحسنی انتخاب نمبر، ص ۲۵-۲۶

باب پنجم

دینی، علمی، سیاسی اور رفاہی تحریکات سے وابستگی

محمد میاں کو اللہ تعالیٰ نے گرم دل وگرم نفس بنایا تھا، ان کے اندر زندگی تھی اور زندگی کی ساری صلاحیتیں تھیں، وہ صرف قلم کے شہسوار نہ تھے بلکہ علم وعمل اور سیف وقلم کے جامع تھے، اس کی مثال خال خال ملتی ہے کہ کوئی نوجوان زندگی کے ہر میدان میں یکساں طور پر سرگرم عمل رہا ہو، اس کا ذہن کشادہ ہو اور اس کا دل وسیع، اس کا قلم برسر پیکار ہو اور اس کی جدوجہد رواں دواں ہو، سیاسی میدان ہو یا علمی اور دینی، خدمت خلق اور رفاہی تحریک ہو، ہر ایک میں انھوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اور اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا، جن جن تحریکات سے ان کی وابستگی رہی ہے اور ان کی خدمت میں جو انھوں نے کوششیں کیں، ان کا اجمالی طور پر جائزہ لیا جاتا ہے، سب سے پہلے دینی دعوت اور تبلیغی تحریک سے ان کی دلچسپی اور ان کی بعض کوششوں کو پیش کیا جاتا ہے:

تحریک دعوت وتبلیغ

۱۹۳۹ء میں ان کی عمر چار سال کی تھی کہ ان کے عم مکرم مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی نے دینی اداروں اور دینی تحریکات کے مرکزوں کا دورہ کیا، اس دورہ میں ان کے ہمراہ مولانا محمد منظور صاحب نعمانی اور ماسٹر عبدالواحد ایم اے تھے، اس دورہ میں تبلیغی مرکز بستی حضرت نظام الدین دہلی بھی گئے، جہاں داعی الی اللہ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ سرگرم عمل تھے، اور میوات کو اپنی محنت

اور دعوت الی اللہ کا مرکز بنا رکھا تھا، ان کی کوششوں سے محیر العقول مفید نتائج برآمد ہو رہے تھے، اس دورہ کے بعد انھوں نے اپنے برادر مکرم مولانا ڈاکٹر سید عبد العلی حسنی کو حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلوی کی کوششوں اور میوات میں بڑی دینی تبدیلی کی مفصل رپورٹ دی، جس کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب اس تحریک سے وابستہ ہو گئے، اور انھوں نے اس سلسلہ میں بڑی دلچسپی کا اظہار کیا۔

ان دونوں بھائیوں کی ہمہ وقت توجہ اور کوششوں سے تبلیغی تحریک کا تعارف یوپی کے مشرقی اضلاع میں ہونے لگا اور اس کے نتیجہ میں ۱۹۴۳ء میں دہلی کی مرکزی جماعت لکھنؤ آئی جس میں مرکز کے سارے پرانے کام کرنے والے اور خود حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی بنفس نفیس تشریف لائے، ایک ہفتہ دار العلوم ندوۃ العلماء میں قیام فرمایا اور پورے شہر میں گشت ہوئے اور اجتماعات ہوئے، خصوصی طور پر مولانا ڈاکٹر صاحب کے گھر تشریف لائے، ان کی مسجد کے غسل خانہ میں غسل فرمایا، مسجد میں نماز ادا کی اور محلہ کی طرف پوری توجہ فرمائی، محمد میاں کی عمر اس وقت آٹھ سال کی تھی، وہ مولانا کی خدمت میں پیش ہوئے، مولانا نے سر پر ہاتھ رکھا، دعائیں دیں، شام کو بعد نماز عصر محلّہ کا گشت ہوا، وہ گشت بڑا تاریخی تھا، اس گشت میں تقریباً ڈیڑھ دو سو آدمی تھے، گلی گشت کرنے والے حضرات سے بالکل بھر گئی تھی، آگے آگے مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی اور مولانا محمد منظور صاحب نعمانی تھے، کون متکلم تھا یہ یاد نہیں، اتنا یاد ہے کہ گشت کرنے والے ذرا آہستہ آوازوں سے ذکر کر رہے تھے جن کی بھنبھناہٹ سے محلّہ گونج رہا تھا، ڈاکٹر صاحب اور دوسرے علماء بھی شریک تھے، اور ہم گھر کے سارے خورد و کلاں جن میں آٹھ سالہ محمد میاں بھی تھے، انھوں نے اس سے پہلے ایسا مبارک مجمع اس طرح گشت کرتا ہوا نہیں دیکھا تھا، ان کے معصوم دل و دماغ پر اس وقت کے کیف و سرور اور نورٌ علیٰ نور کے اثرات ثبت ہو رہے تھے، پھر وہ جو اپنے والد ماجد کے ساتھ دار العلوم بھی گئے اور حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کی مجلس میں

شریک ہوئے، مسجد میں مولانا قاری محمد طیب صاحب (مہتمم دارالعلوم دیو بند) کی تقریر ہوئی جو بہت مفصل تھی۔

یہ تھا آغاز محمد میاں کے تبلیغی تحریک میں دلچسپی لینے اور اس سے متاثر ہونے کا، برسات کا زمانہ تھا اور بارشوں کا زور، لوگوں کا یہ حال تھا کہ سخت بارش میں بھیگتے ہوئے بازاروں کا گشت کرتے، چھوٹے بڑے سب ہی ان میں شرکت کرتے، ایک شام کا واقعہ ہے کہ بعد مغرب مولوی گنج کے بازار کا گشت ہو رہا تھا کہ ایک دوکان پر ایک مجمع دیکھا، جماعت قریب گئی تو معلوم ہوا کہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کی خبر آئی ہے، اور پھر آناً فاناً لوگوں کا مجمع بڑھتا گیا۔

۱۹۴۴ء میں ڈاکٹر صاحب خود دہلی تشریف لے گئے، مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ ڈاکٹر صاحب کی آمد سے بہت خوش ہوئے اور ان کے رخصت ہونے پر فرمایا:

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
بوئے گل سیر ندیدم و بہار آخر شد

ڈاکٹر صاحب کا اس سفر سے واپسی پر حضرت مولانا محمد الیاس صاحب اور ان کی تبلیغی تحریک سے تعلق بہت بڑھ گیا، خود تو پیرانہ سالی اور طبی مشغولیتوں کی وجہ سے سفر نہیں کرتے تھے مگر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے سفروں اور تبلیغی کوششوں میں ان کا بڑا دخل ہوتا تھا، مولانا محمد الیاس صاحب کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادہ مولانا محمد یوسف صاحب سے تعلق رکھا، خط و کتابت کی اور ان کو لکھنؤ آنے کی دعوت دیتے رہے، آخر کار ۱۹۴۶ء میں رحیم آباد ضلع لکھنؤ میں ایک بڑا تبلیغی اجتماع ہوا جس کے سلسلہ میں مولانا محمد یوسف صاحب لکھنؤ تشریف لائے، ڈاکٹر صاحب سے ملے، اور دونوں کا ربط و ضبط بڑھتا گیا، اب محمد میاں گیارہ سال کے ہو چکے تھے اور سوجھ بوجھ ان میں آچکی تھی، وہ مولانا محمد یوسف صاحب اور ان کے تبلیغی دوروں اور اپنے گھر پر مسلسل ان کی آمد سے متاثر ہوتے جا رہے تھے اور ان کا نشو و نما اس مبارک ماحول

میں ہورہا تھا، اس کے بعد لکھنؤ میں کئی بڑے بڑے اجتماعات ہوئے، جن میں محمد میاں خود شریک ہوئے اور آخر کے اجتماعات میں جبکہ ان کی عمر ۳۰-۳۵ سال تک پہنچ چکی تھی ان کی عملی شرکت رہی، اس تحریک کی افادیت پر تعمیر حیات میں اداریے لکھے اور دوسروں کو متوجہ کیا، کئی گشتوں میں شرکت کی، تقریر کرتے نہ تھے، صرف شرکت کرتے تھے، خصوصاً محلّہ کی مسجد میں جو جماعت آتی اس کے اجتماع میں شریک ہونا ان کا سب سے محبوب مشغلہ تھا، اس سلسلہ میں ایک لطیفہ قابل ذکر ہے: ایک دن مغرب کی نماز کے بعد اجتماع تھا، مسجد میں محلّہ کے جوان اور بوڑھے سب موجود تھے، محلّہ میں ایک صاحب جن کا نام عبدالواحد صاحب تھا وہ خوش طبع بھی تھے اور منکسر المزاج بھی، ان کا تعلق ڈاکٹر صاحب سے بہت معتقدانہ تھا، وہ مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے اور اپنی جان تک فدا کرنے کو تیار رہتے تھے، وہ بھی اس مجمع میں تھے مگر الگ تھلگ وظیفہ پڑھ رہے تھے، ایک صاحب ان کے پاس پہنچے اور کہنے لگے: آپ بھی نام لکھائیے، کہاں چلیں گے اور کتنے دنوں کے لیے، وہ پہلے تو چپ رہے، جب بہت اصرار ہوا تو جان چھڑانے کے لیے بے سوچے سمجھے محمد میاں کی طرف اشارہ کرکے کہنے لگے: یہ ہمارے جدامجد ہیں یہ جو فرمائیں گے کروں گا، جدامجد کے لفظ پر سب کھل کھلا کر ہنس پڑے، میں نے عرض کیا: عبدالواحد صاحب! جدامجد کے معنی بھی جانتے ہیں؟ محمد میاں آپ کے جدامجد ہیں؟ وہ کہنے لگے: کیوں نہیں! وہ ہمارے مقتدا ہیں، پیشوا ہیں، ہمارے پیر کے پوتے ہیں، بیٹے ہیں، بزرگ ہیں، امجد کسے کہتے ہیں! اس پر محمد میاں بھی مسکرا دیے، اور کچھ دیر تک یہ اجتماع بے تکلف مجلس بن گئی اور کسی نے بڑی بے تکلفی سے محمد میاں سے کہا: کہیے جدامجد صاحب! خیر یہ تو ایک واقعی لطیفہ تھا جو پیش آیا۔

ایک پر کیف تبلیغی سفر

محمد میاں نے تبلیغی کاموں میں مقامی طور پر کافی شرکت کی، خصوصاً کوئی عربی

جماعت آتی تو اس کے اہل علم حضرات سے ضرور ملتے اور ہفتہ واری اجتماع میں شریک ہوتے مگر اپنی گوناگوں علمی مشغولیتوں کی وجہ سے سفر دو ایک بار ہی کیا ہے، ایک سفر کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے جو بڑا دلچسپ اور بڑا پر کیف تھا۔

بنگال کی ایک جماعت لکھنؤ آئی ہوئی تھی، اس کے ساتھ لکھنؤ کے پرانے اور اہل علم حضرات دو چار روز کے لیے بہرائچ کے علاقہ قیصر گنج کے بعض دیہاتوں میں گئے، ایک گاؤں جس کا نام غالباً عینی تھا وہاں ایک بڑا اجتماع تھا، شروع میں حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نے بھی شرکت فرمائی اور عزیزی مولوی محمد رابع سلمہ نے بھی، راقم سطور اور محمد میاں بعد میں پہنچے، بارش کا زمانہ تھا اور موسم نہایت خوش گوار، لکھنؤ سے ریل سے روانہ ہوئے، جرول روڈ پر اترے، راستہ میں ایک دریا پڑا، کشتی سے دریا پار ہوئے، عینی پہنچے، اجتماع ہو رہا تھا، وہ دن اس گاؤں میں گزارا، شام کو آگے روانہ ہوئے اور ایک گاؤں لوگھیاں میں قیام کیا، دوسرے دن ایک بیل گاڑی پر جماعت کا ایک مختصر سا قافلہ بیٹھا، بارش کی وجہ سے گاڑی پر برساتی پڑی تھی، قافلہ میں راقم سطور، محمد میاں، فریدالدین صاحب وکیل، سید مسعود حسن صاحب وکیل مرحوم، جناب ماسٹر کلیم اللہ خاں صاحب اور رائے بریلی کے ایک کپڑے کے تاجر عبدالسلام صاحب مرحوم تھے، ہلکی ہلکی بارش بلکہ پھوار پڑ رہی تھی، خنک ہوا چل رہی تھی، دونوں طرف کھیت تھے، کیف ہی کیف محسوس ہوتا تھا، دوپہر کو منزل مقصود پہنچے، ظہر بعد گشت ہوا، اور بعد عصر اجتماع۔ راقم حروف نے امیر جماعت ماسٹر کلیم اللہ خاں صاحب سے عرض کیا کہ آج کسی طرح محمد میاں سے تقریر کرائیے، ماسٹر صاحب نے محمد میاں سے تقریر کرنے کو کہا، انھوں نے بہت عذر کیا اور کہا کہ ہم نے کبھی تقریر نہیں کی، مگر امیر صاحب کے پیہم اصرار پر انھوں نے اس شرط پر اپنی رضامندی ظاہر کی کہ منجھلے بھیا (راقم سطور) مجمع میں نہ ہوں، میں نے اس تجویز کو منظور کرلیا، اور مجمع سے اٹھ کر چلا گیا، کچھ دیر بعد میں واپس آگیا، مسجد کی کرسی بلند تھی، میں نیچے آڑ میں کھڑا ہو کر ان کی تقریر سننے لگا۔

یہ ان کی پہلی تقریر تھی مگر بڑی سلجھی ہوئی تھی، خود اعتمادی بھی تھی اور اطمینان و سکون بھی، ان کی اس تقریر سے اندازہ ہوا کہ اگر وہ برابر تقریر کرتے رہیں تو کامیاب مقرر ہو سکتے ہیں، دوسرے دن جماعت دوسرے گاؤں گئی، وہاں بھی ان سے تقریر کو عرض کیا گیا تو کہنے لگے: بس بس وہی تقریر کافی ہے اور بہت دنوں تک کافی ہے۔

واپسی شام کو ہوئی، کشتی سے دریا پار کیا، پار ہوتے ہوتے مغرب ہوگئی، ہر طرف سناٹا اور ہُو کا عالم، ہمارے ساتھ ایک قاری صاحب بھی تھے، جن کا نام قاری عبدالغفور صاحب تھا، ایک جگہ سب بیٹھ گئے اور اندھیرا چھا رہا تھا، ان سے عرض کیا گیا کہ قرآن شریف کی کچھ آیات تلاوت کردیں، انھوں نے تلاوت کی، بڑے درد و سوز کے ساتھ پڑھا، ایک سماں بندھ گیا، تھوڑی دیر بعد پیدل چلتے چلتے جرول روڈ کے اسٹیشن پہنچ گئے، گاڑی پکڑی اور لکھنؤ "آئبون تائبون عابدون لربنا حامدون" پڑھتے ہوئے پہنچ گئے، محمد میاں کے والد ماجد ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کو اس سفر کی روداد سنائی اور محمد میاں کی تقریر کا حال بیان کیا، ڈاکٹر صاحب بہت خوش ہوئے۔

مولانا محمد یوسف صاحب کاندھلویؒ سے تعلق اور ایک مؤثر تحریر

حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کا انتقال ہوا تو اس وقت محمد میاںؒ کی عمر صرف ۹ رسال تھی، ان کے جانشین مولانا محمد یوسف صاحب کاندھلویؒ کا انھوں نے زمانہ پایا، ان کی تقریریں سنیں، ان کے پاس بیٹھے، ان کی اچانک وفات سے سبھی متاثر ہوئے، محمد میاں پر بھی اثر پڑا، انھوں نے اپنے تأثرات واحساسات "دعوت وتبلیغ انسانی پیکر میں" کے عنوان کے تحت سپرد قلم کیے جو پیش کیے جا رہے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

"پروانے کا حال اس محفل میں، ہے قابل رشک اے اہل نظر
اک رات میں یہ پیدا بھی ہوا، عاشق بھی ہوا اور مر بھی گیا"

حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ کی زندگی کا سب سے بڑا وصف اور سب سے بڑا کارنامہ نہ تبلیغی کام کی وسعت و

عمومیت ہے اور نہ مردم سازی و تربیت، ان کا امتیاز یہ نہیں کہ انھوں نے اس کام کو نکال کر ممالک عربیہ، چین، جاپان اور یورپ وامریکا تک پہنچادیا اور نقل وحرکت اور دوروں کو اس قدر وسعت دی کہ اگر اس کا مالی حساب لگایا جائے تو شاید کروڑوں تک پہنچے، اس کام کی وسعت و اہمیت اور اس کے زبردست نتائج سے کوئی انکار نہیں کرسکتا، لیکن مولانا کا سب سے بڑا وصف اور ان کا اصل امتیاز دو چیزوں میں مضمر ہے، اور یہ وہ چیزیں ہیں جن میں تبلیغی و اہل دعوت و اصلاح کے حلقہ میں ان کا کوئی شریک و ہمسر نظر نہیں آتا، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ''رتبۂ بلند'' اس عہد میں ان ہی کے ساتھ مخصوص رہا؛ ایک یقین کی طاقت، دوسرے تبلیغ ودعوت میں مکمل فنائیت۔

ان کا اصل موضوع اور ان کی آواز یہی ''یقین'' تھا، اور یہ یقین ان کے رگ وریشہ میں اس طرح پیوست ہوگیا تھا کہ ان کی زندگی کا کوئی لمحہ یا کوئی گوشہ اس سے خالی نہ تھا، ایسا نہ تھا کہ گوشہ تنہائی یا عبادت وریاضت کے وقت تو یہ یقین ان کو حاصل ہو لیکن اقتدار کی قوت، وجاہت ودولت، علم اور فلسفہ کے سامنے یہ یقین ان کا ساتھ چھوڑ دے، اپنے مبلغین اور محبین کے سامنے یہ یقین پوری قوت کے ساتھ جلوہ ریز ہو اور وزراء اہل حکومت یا اہل دولت کے سامنے اس میں اتنی قوت باقی نہ رہ جائے، یہ یقین اس وقت تو حاصل ہو جب تک اس کو آزمانے کا موقع نہ آئے اور امتحان وآزمائش کے وقت بے یار ومددگار چھوڑ دے۔

مولانا نے ایک مرتبہ دعوت کے شرائط وآداب تقریر کرتے ہوئے

بیان فرمائے: کہ جب دو آدمی ملتے ہیں تو ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ کوئی کسی سے متاثر نہ ہو یا آدمی متاثر کرتا ہے یا متاثر ہوتا ہے، درمیان کا کوئی درجہ نہیں ہے، اس لیے اگر تم مخاطب کو متاثر نہیں کر سکے تو یہ سمجھو کہ غیر ارادی طور پر خود اس سے متاثر ہو چکے ہو۔

یہ بات سب سے پہلے مولانا علیہ الرحمہ پر صادق آتی ہے، وہ بڑی سے بڑی شخصیت کے سامنے اسی قوت، اسی یقین، اسی صراحت، اسی دل سوزی اور اسی سطح سے بات کرتے جو کارِ نبوت کے شایان شان اور منصب علماء کے لائق اور مناسب ہو، وہ جس طرح ایک عامی سے بات کرتے تھے، اسی طرح ایک وزیر یا سفیر یا کروڑ پتی اور بڑے سے بڑے سیاسی سے بات کرتے تھے، بلکہ شاید اس سے زیادہ صراحت اور قوت کے ساتھ، پاکستان میں ایک مرتبہ بعض مخلص اہل تعلق نے جو حکومت کے اعلیٰ مناصب پر فائز تھے ایک مخصوص اجتماع کیا، اور اس میں وزرائے حکومت کے اعلیٰ عہدیداروں اور ممتاز ترین شخصیتوں کو مدعو کیا، مولانا تشریف لائے تو ان سب کا تعارف کرایا گیا کہ آپ فلاں وزیر ہیں، آپ اس محکمہ کے سکریٹری ہیں، آپ فلاں جگہ کے ڈائرکٹر ہیں، جب تعارف کا سلسلہ ختم ہوا تو مولانا نے بات اس طرح شروع فرمائی:

''بھائیو! ابھی آپ نے معلوم نہیں کن کن عہدیداروں کا تعارف کرایا، اس کے بعد آپ نے چند جانوروں کا نام لے کر فرمایا: ہاں اگر آپ یوں تعارف کراتے تو شاید میں زیادہ سمجھ پاتا، جن حضرات نے ان لوگوں کو مدعو کیا تھا، ان کے سر، مارے ندامت اور خوف کے جھکے ہوئے تھے کہ اس بات کا کیا اثر ہوتا ہے،

مولانا نے عجیب مؤثر اور دل نشیں انداز میں فرمانا شروع کیا کہ میرے بھائیو! وزیر تو مسلم بھی ہوتا ہے غیر مسلم بھی، ڈاکٹر غیر مسلم بھی ہوتا ہے مسلم بھی، اسی طرح تمام عہدیداروں کا حال ہے، اس میں ہماری آپ کی کوئی خصوصیت نہیں، ہمارے اسلاف کا جب بھی تعارف کرایا جاتا تو یہ نہیں کہا جاتا تھا کہ اتنی مِلوں کا مالک ہے، اتنی کوٹھیوں کا مالک ہے، اور اتنی موٹروں کا مالک ہے، بلکہ یوں تعارف ہوتا تھا کہ یہ بدری ہیں، انھوں نے بدر میں حصہ لیا تھا، انھوں نے فلاں غزوہ میں حصہ لیا تھا، اور یہ اتنے غزوات میں شریک ہوئے تھے، اور انھوں نے دین کے لیے یہ قربانیاں دیں۔'' اسی دردمندانہ اور مخلصانہ انداز میں ساڑھے تین گھنٹے تقریر کی۔

جن لوگوں نے یہ جلسہ بلایا تھا وہ منتظر تھے کہ دیکھیں کہ مولانا کی اس تقریر کا کیا ردعمل ہوتا ہے، اور یہ لوگ کتنے غیظ وغضب کے عالم میں واپس جاتے ہیں، لیکن اس کا ردعمل صرف یہ ہوا کہ شام کے عمومی اجتماع میں نہ صرف خود وہ لوگ موجود تھے بلکہ اپنے ساتھ دوسرے عہدیداروں کو بھی لائے تھے، اور اسٹیج پر وزراء کی تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی جو اس مخصوص اجتماع میں تھی۔''(۱)

مولانا کے اسی یقین کے متعلق وہ آگے لکھتے ہیں:

''یہ یقین مولانا کی طرف سے چشمہ کی طرح ابلتا اور کسی وقت (کسی دن یا کسی ہفتہ کا ذکر نہیں) اس کا سوتا خشک نہ ہوتا، اور ایسا معلوم ہوتا کہ وہ یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور ان کا ایسا حال اور واقعہ ہے جس کے لیے کسی تصنع اور کسی تکلف کی

(۱) محمد الحسنی انتخاب نمبر (ماہنامہ رضوان لکھنؤ) ص/۱۰۳

ضرورت نہیں، یہ یقین ان کے پاس بیٹھنے والوں یا ان کی تقریر سننے والوں کو اس طرح متاثر کرتا کہ بعض وقت وہ لوگ ان کے مضامین اور ان کی تقریریں پوری طرح نہ سمجھنے اور ذوق وطرز بیان کے اختلاف کے باوجود اس گرمی اور حرارت کو اپنے سینے میں منتقل ہوتے ہوئے محسوس کرتے تھے یا کم از کم اتنا ضرور سمجھ لیتے تھے کہ اس شخص کو یقین کی جو دولت حاصل ہے، وہ کم لوگوں کے پاس ہے، نجی بات چیت ہو یا عمومی، ایک لاکھ کا مجمع ہو یا سو کا، مولانا ہمیشہ یکساں طرز اور یکساں قوت کے ساتھ بات کرتے تھے، اور ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے موضوع سے نہ ہٹتے تھے، وہ باتیں جو اس مادیت کے دور میں نامانوس ہیں اور جن سے اچھے اچھے علماء اور دینی رہنما مصلحت کے خیال سے یا زمانہ کے رجحان سے مجبور ہو کر یا انسان کی مادی ترقی سے مسحور ہو کر پرہیز کرنے لگے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کا ذکر ان کی تحریروں اور تقریروں میں کم سے کم آئے اور زیادہ زور مسلمانوں کے سیاسی ومعاشی مسائل اور اسلام کے جمہوری وتمدنی مسائل پر دیا جائے، اور اس کو محض ایک سیاسی تحریک، ایک معاشرتی نظام، ایک اقتصادی تنظیم، ایک تمدنی ارتقاء کے طور پر پیش کیا جائے، وہ باتیں مولانا کسی جھجک کے بغیر اور کسی معذرت کے بغیر اپنی پوری قوت کے ساتھ پیش کرتے تھے، بلکہ یہی ان کی گفتگو اور تقریر کا محور ہوتا۔

آخرت پر یقین، خدا کے وعدوں پر اعتماد، توکل، جنت کا تذکرہ، اہل جہنم کے واقعات، غیبی حقائق، اور انسان کی روح کی اہمیت،

مادیت کا انکار، دنیا اور آخرت کا مقابلہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی اور ان کی مثالیں اور نمونے، دعوت کی طاقت، اور اس کی تاثیر وتسخیر، یقین کی اہمیت، اور اس کے محیر العقول واقعات؛ یہ چیزیں تھیں جس پر مولانا کی تقریر مشتمل ہوتی تھی، لیکن اس عقل پرست بلکہ ہوس پرست عہد میں اور اس کے بدلے ہوئے ذوق ورجحان کے باجود ان کی یہ باتیں ہر طبقہ اور ہر حلقہ کو کسی نہ کسی پہلو سے ضرور متأثر کرتی تھیں، اور ان کا سب سے بڑا راز مولانا کی قلبی قوت اور یقین کی طاقت تھی جو ان کے لفظ لفظ سے ظاہر ہوتی تھی، اور پرستاران عقل اور گرفتاران نفس کو متأثر کیے بغیر نہ رہتی تھی۔

اسی دوران گفتگو اور دوران تقریر میں ایسے معانی کا ورود ہوتا جس کو آورد یا تکلف یا نکتہ آفرینی سے کوئی علاقہ نہیں تھا بلکہ صاف معلوم ہوتا کہ کوئی اور طاقت ان سے مضامین اور حقائق و معارف بیان کروارہی ہے، وہ صرف اس کے ناقل ہیں ؎

گفتہ او گفتہ اللہ بود
گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

مولانا کو اس بات کا کامل یقین تھا کہ ایمان ویقین کے بغیر امت محمدیؐ میں کوئی انقلاب پیدا ہی نہیں ہوسکتا، اور اگر اس کے بغیر کوشش کی گئی تو وہ اسلام کی روح اور امت کے مزاج اور اس کی تاریخ وتجربہ کے خلاف ہوگی، جس کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ ایمان ہی کے سہارے یہ امت آگے بڑھی اور بحر وبر پر چھا گئی، اور ایمان میں کمزور ہونے اور خدا سے برگشتہ ہونے کے بعد اس کا

شیرازہ منتشر ہوا، اور اس کو اپنی کمین گاہوں میں جانا پڑا۔

ع خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمیؐ" (۱)

مولانا کی فنائیت کے متعلق ان کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

"مولانا کی دوسری اہم خصوصیت دعوت میں انہماک کامل بلکہ فنائیت تامہ ہے، اور یہ دراصل اس پہلی خصوصیت کا پرتو اور عکس ہے، اس یقین نے مولانا کو اس درجہ بے چین مضطرب اور سیماب روش بنا دیا تھا کہ ان کو کسی پہلو قرار نہیں آتا تھا، اور اس یقین کی اشاعت اور تبلیغ و دعوت ان کے لیے اتنی ہی ضروری ہوگئی تھی جیسے انسان کے لیے غذا اور ہوا، ان کی پوری زندگی اسی دعوت سے عبارت تھی، وہ اسی کے سہارے جی رہے تھے۔" (۲)

رابطہ عالم اسلامی

نوجوانوں کی دعوتی وحدت کی خاطر ایک بین الاقوامی ادارہ کی تشکیل "الرابطة الاسلامية الدولية" (ICIO) کے نام سے کی، اور ایک سہ لسانی پندرہ روزہ بھی اس ادارہ نے نکالا جو مسلم نوجوانوں میں جذبہ یکجہتی پیدا کرنے میں معاون بنے، مولوی سعید الرحمٰن صاحب ندوی جوان کے علمی ادبی اور دعوتی کاموں میں معاون اور شریک کار رہتے تھے اس کی یوں تفصیل بیان کرتے ہیں:

"جنوری ۱۹۵۹ء کے اواخر میں میں اپنے عراق کے سفر سے واپس آیا تو دوران گفتگو ہم لوگوں نے ایک ایسی انجمن بنانے کے بارے میں سوچا جو عالم اسلام کے حالات و واقعات سے تعلق رکھے، اور اس کے ذریعہ ایک دعوتی اور ثقافتی رابطہ قائم کیا

---

(۱) محمد الحسنی انتخاب نمبر (ماہنامہ رضوان لکھنؤ) ص/۱۰۵

(۲) محمد الحسنی انتخاب نمبر (ماہنامہ رضوان لکھنؤ) ص/۱۰۵

جاسکے، کافی غور وخوض کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ سردست اس کو باہر ہی کے کام کے لیے خاص رکھا جائے، اور ممبران بھی سب باہر کے ہوں چنانچہ اس کا نام عربی میں "الرابطة الاسلامية الدولية" اور اردو میں ''انجمن رابطہ اسلامی'' رکھا گیا، اس کے لیے ایک مضمون تیار کرنا پڑا، جس میں سارے مقاصد اور انجمن قائم کرنے کے دواعی ومحرکات کی تفصیل آگئی، وہ مضمون عربی ٹائپ میں چھپوا کر بطور خط بہت سے منتخب لوگوں کے پاس بھیجا گیا، اور کچھ دنوں کے بعد جوابات آنے کا سلسلہ شروع ہوا، لوگوں نے اس کی بڑھ چڑھ کر ترحیب کی اور ایسا معلوم ہوا کہ جیسے ایک خلا ہو جسے پر کرنے کے لیے لوگ بے چین ہوں، ان جوابات سے ہم لوگوں کی زبردست ہمت افزائی ہوئی، اور اللہ کا نام لے کر یہ انجمن قائم کردی گئی، اس کا دفتر گوئن روڈ ہی پر دفتر نظامت ندوۃ العلماء والی عمارت میں اوپر کے حصہ میں قائم ہوگیا، اور الحمدللہ انجمن کی سرگرمیاں بھی شروع ہوگئیں، ہم دو ہی آدمی اس کے بھی سارے کام کو انجام دیتے تھے، ایک خبرنامہ بھی شائع کرنا شروع کیا گیا جو عربی، انگریزی میں ہوتا تھا، اس کا نام بھی "الرابطة الاسلامية الدولية" رکھا گیا، بعد میں جب لوگوں نے انجمن کی افادیت محسوس کی تو مقامی طور پر بھی اس کی ایک شاخ قائم کردی گئی اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اس کے صدر منتخب ہوئے، اس کے اجتماعات بھی ہوتے رہے، اس میں زیادہ تر طلبہ نے حصہ لیا، میڈیکل کالج کے طلبہ ڈاکٹر صاحب کی وجہ سے کافی مانوس ہوئے، اسی زمانہ میں ایک طالب علم جناب

محسن جلیل شمسی صاحب بہت سرگرم رکن تھے، اب وہ ڈاکٹر محسن جلیل شمسی صاحب ہیں اور لکھنؤ کنٹونمنٹ کے علاقہ میں ایک سرکاری فوجی اسپتال میں اپنی خدمت انجام دے رہے ہیں۔(۱) انجمن رابطہ اسلامی کی سرگرمیاں عرصہ تک قائم رہیں، لیکن کام کے آدمیوں کی کمی اور سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے افسوس کے ساتھ اس کام کو موقوف کرنا پڑا، اس کے فوراً بعد مکہ مکرمہ میں "رابطة العالم الاسلامي" کا قیام بھی عمل میں آیا، اس کے مقاصد اور کاموں اور ہماری انجمن کے مقاصد میں بہت حد تک یکسانیت تھی۔" (۲)

ان کے عم مکرم مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی اس کام کو سراہتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"محمد میاں کا ذہن شروع سے وسیع تھا، ان میں کہیں سے سید جمال الدین افغانی کے آتش کدہ کی ایک چنگاری اڑ کر آگئی تھی جوان کو بے چین بنانے اور وسیع خطوط پر سوچنے پر مجبور کرتی تھی، انھوں نے ہندوستان سے تو کیا اپنے شہر لکھنؤ سے بھی بہت کم باہر قدم نکالا تھا، ان کے سفروں کی حد یہی دو تین قریبی اضلاع

(۱) ڈاکٹر شمسی صاحب کے نام سے اب جانے پہچانے جاتے ہیں، پہلے اپنے حلقہ احباب میں کرنل شمسی کے نام سے متعارف تھے، اصلاً گونڈہ (یوپی) کے رہنے والے ہیں، مگر اب لکھنؤ میں گومتی نگر میں رہائش پذیر ہیں، پہلے فوج سے وابستہ تھے، اب تعلیمی اور دعوتی سرگرمیاں رکھتے ہیں، اور دارالعلوم ندوۃ العلماء میں استاذ انگریزی اور شعبہ انٹرنیٹ کے ذمہ دار ہیں اور ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی کے رکن بھی ہیں، ۱۹۵۲ء سے ان کا حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے رابطہ ہوا، اور تبلیغ میں کچھ وقت لگایا، بیعت وارادت کا تعلق (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب قدس سرہ سے ہے، ذکر و معمولات کے پابند شروع سے ہیں، مولانا محمد الحسنیؒ اور مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی کے ساتھ ملی و دعوتی کاموں میں بہت سے معاملات میں مشیر و معاون رہے، اطال اللہ بقاءہ۔(م)

(۲) تعمیر حیات (محمد الحسنی نمبر) ص/۲۳۶-۲۳۷

تھے، جن سے ان کو وطنیت یا قرب کا تعلق تھا، لیکن وہ لکھنؤ میں بیٹھے بیٹھے عالم اسلام کے اسلام پسند اور حوصلہ مند نوجوانوں کی تنظیم کے خواب دیکھتے تھے، رجب ۱۳۷۹ھ (جنوری ۱۹۶۰ء) میں انھوں نے اپنے رسالہ ''البعث الاسلامی'' میں سالِ نو کے تحفہ کے طور پر اس تنظیم کے قیام کی تجویز پیش کی، پھر اگلے شمارے شعبان ۱۳۷۹ھ (فروری ۱۹۶۰ء) میں "المشروع الإسلامی الکبیر" کے عنوان سے انھوں نے اس کے قیام کا اعلان کردیا، اور نوجوانوں کو اس کی رکنیت کی دعوت دی، عربی میں اس کا نام "جمعیة الرابطة الاسلامیة" تھا اور انگریزی میں "International Cultural Islamic Organization"، یہ نوجوانوں کی بین الاقوامی اسلامی تنظیم تھی جس کا مقصد آپس میں تعارف، ایک دوسرے کے حالات سے واقفیت، مسلمانوں میں بیداری پیدا کرنے کے کام میں تعاون، ان کو صحیح مشورہ اور رہنمائی پیش کرنا تھا، اس کی طرف سے عربی انگریزی میں رسائل ومضامین بھی شائع ہوئے، اور وہ دوسرے ملکوں تک پہنچے، بہت سے نوجوانوں نے اس کا خیر مقدم کیا، اور رکنیت قبول کی، یاد رہے کہ ''رابطہ عالم اسلامی'' مکہ معظمہ کے قیام سے دو سال پہلے کی یہ بات ہے۔'' (۱)

''جامعة البعث الاسلامی'' کا تصور

محمد میاں اسلامی بیداری اور دینی وحدت کے لیے بڑی عالی فکر رکھتے تھے، وہ اس کے لیے اسکیمیں اور منصوبے بناتے اور خاکے تیار کرتے، بین الاقوامی تنظیم کا

---

(۱) تعمیر حیات (محمد الحسنی نمبر) ص/۱۶۱

تصور دیا اور اسے عملی شکل دے کر محدود پیمانہ پر کام بھی شروع کیا جو اگرچہ وسائل کے فقدان کی وجہ سے آگے نہ بڑھ سکا، اسی طرح انھوں نے جامعۃ البعث الاسلامی کا تصور پیش کیا اور تجویز رکھی، عزیزی مولوی محمد رابع ندوی (جو ان کے پھوپھی زاد بھائی ہیں) اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

''محمد میاں کو نوجوان مسلم نسل میں زندگی کا صحیح شعور پیدا کرنے اور ان کو دعوت اسلامی کے لیے متحد کرنے کا بے حد جذبہ تھا، اس سلسلہ میں ان کا ذہن نئی اسکیمیں سوچتا، جن کے بنیادی اشارے وہ اکثر صفحہ قرطاس پر بھی لے آتے، اور ان کے ذہن میں ایک ایسی تربیت گاہ کی بھی ضرورت ابھرتی رہتی جس کے ذریعے نئی نسل میں صحیح دینی شعور، حقائق زندگی کا صحیح فہم، تجرباتی علوم میں امتیاز و کمال اور دعوت اسلامی کا جذبہ اور حکیمانہ مہارت پیدا کیا جانا آسان ہو، اس سلسلہ میں عربی کے پندرہ روزہ ''الرائد'' میں ان کا آخری مضمون ''جامعۃ البعث الاسلامی'' ان کے مطمح نظر کی پوری تصویر پیش کرتا ہے۔'' (۱)

ان کے دوسرے بھائی عزیزی مولوی محمد واضح ندوی لکھتے ہیں:

''اس مضمون میں انھوں نے تعلیم و تربیت اور مستقبل کے باشعور و ذمہ دار افراد ڈھالنے کا ایک وسیع خاکہ پیش کیا ہے، کیونکہ وہ سمجھ چکے تھے کہ وہ دور بہت قریب ہے اور جلد ہی ظہور پذیر ہونے والا ہے۔'' (۲)

---

(۱) تعمیر حیات (محمد الحسنی نمبر) ص/۲۱۲

(۲) مولانا محمد واضح رشید حسنی ندوی حال معتمد تعلیم ندوۃ العلماء ان کی اس تحریر کو ان کی فکری تحریروں میں سب سے اعلیٰ نمونہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''مولانا محمد میاں کی پختہ فکر، وسیع اور متوازن ذمہ دارانہ تحریر کا سب سے عمدہ نمونہ ان کا آخری مضمون ہے جو انھوں نے ''جامعۃ البعث الاسلامی'' کے نام سے تحریر کیا۔'' (تعمیر حیات (محمد الحسنی نمبر) ص/۲۵۱)

تحریک پیام انسانیت سے وابستگی

غیر مسلموں میں اسلام کے تعارف کے کام کی فکر ان کو ورثہ میں اپنے والد ماجد مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی سے ملی تھی، ان کے عم مکرم مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کے اندر بھی یہ درد و فکر شروع ہی سے موجزن تھا، اور انھوں نے ۵۵-۱۹۵۴ء میں ہی اپنے طور پر ایسے اجتماعات کا انعقاد شروع کر دیا تھا جس میں مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلموں کی بھی بڑی تعداد اکٹھا ہوتی، ملک کو درپیش خطرات اور بڑھتی ہوئی فرقہ وارانہ منافرت کو دیکھتے ہوئے اس کام کو پھر ۱۹۷۴ء میں باقاعدہ تحریکی شکل دی گئی، یہ محمد میاں مرحوم کے دل کی آواز تھی، وہ اس سلسلہ میں بھی خاکے بناتے، مشورے دیتے، اور اس کے پروگراموں میں پس پردہ حصہ لیتے، وہ نمائش سے بہت دور رہتے تھے، اس لیے ان کے کام کی نوعیت دوسروں کے سامنے نہ آپاتی، پیام انسانیت کے ایک سرگرم داعی مولانا عبدالکریم پاریکھ صاحب لکھتے ہیں:

> ''پیام انسانیت مولانا علی میاں مدظلہ کی دعوت ہے، جو ملک میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سبھی سے خطاب کرتی ہے، اس دعوت سے لاکھوں لوگ روشناس ہیں، لیکن کیا کوئی یہ بھی جانتا ہے کہ اس دعوت کے نقش نگار، حسن و آرائش میں مولانا محمد میاں مرحوم کا کتنا حصہ تھا، میں آپ کو بتاؤں کہ وہ اس قافلہ کی پوری رہنمائی کرتے تھے لیکن اپنے آپ کو کبھی نمایاں نہیں کیا، ہم جیسے آگے بڑھتے اور داد حاصل کرتے، لیکن محمد میاں مرحوم پردہ کے پیچھے آخر وقت تک پیام انسانیت کی دعوت کی خبر گیری کرتے، مشورہ دیتے، خاکے بناتے، نشیب و فراز، خطرات اور مشکلات کی نشاندہی کرتے، لیکن اخباروں میں نام ان کا کبھی نہیں آیا۔'' (۱)

---

(۱) تعمیر حیات، ص/۲۶۰

بانی تحریک مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی اس سلسلہ میں ان کی اور ان کے رفیق کار مولانا محمد اسحاق جلیس ندوی کی خدمات کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ”یہاں بھی وہ اور محمد میاں دونوں ایک دوسرے کے کلی طور پر ہم خیال اور شریک حال تھے، دونوں نے مل کر وہ حلف نامہ تیار کیا جو ہر طبقہ پر حاوی اور ہمہ گیر ہے، تحریک کا تعارف کرانے میں بھی دونوں کا قلم یکساں رواں دواں تھا۔“ (۱)

دینی تعلیمی کونسل

مسلمانوں کو اس ملک میں جب اپنی نئی نسل کے ایمان وعقیدہ کی حفاظت اور دینی تشخص کے مسئلہ میں حکومت کی طرف سے دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا تو ملت کے کچھ دردمند حضرات نے دینی تعلیمی کونسل کے نام سے ایک ادارہ کی داغ بیل ڈال کر تعلیمی تحریک شروع کی کہ پرائمری سطح پر دینی تعلیم کا نظام بنا کر اس کو جاری کیا جائے اور جگہ جگہ مکاتب قائم کیے جائیں، دسمبر ۱۹۵۹ء میں بستی میں ایک بڑی تعلیمی کانفرنس کا انعقاد ہوا، اور کونسل کا قیام عمل میں آیا، جس کے صدر مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی منتخب ہوئے، قاضی محمد عدیل عباسی جو اس تحریک میں پیش پیش تھے جنرل سکریٹری ہوئے، مولانا محمد منظور نعمانی کی بھی خدمات اس میں حاصل کی گئیں، ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی نے بھی سرگرمی سے حصہ لیا، محمد میاں مرحوم کے بھی دل کی یہ آواز تھی، انھوں نے بھی اپنے مشوروں اور تحریروں سے اس تحریک میں شرکت کی، محب گرامی ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی (جن سے ان کے گہرے مراسم تھے) (۲) محمد میاں کی

---

(۱) تعمیر حیات (مولانا اسحاق جلیس نمبر) ص/۴۷-۴۸۔

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی ”کاروان زندگی“ میں تحریک پیام انسانیت سے مولانا محمد الحسنی کے گہرے تعلق کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ”تحریک پیام انسانیت میں میرا قلمی ترجمان اور اس سے سو فیصد اتفاق و توارد رکھنے والا رفیق جدا ہو گیا، جس سے ہمیشہ بیش قیمت مدد ملی۔“ کاروان زندگی ۲/۲۷۴ (م)

(۲) ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی جو اس تعلیمی تحریک کے بڑے ہی سرگرم کارکن تھے، اور بعد میں (باقی اگلے صفحہ پر)

خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہر اچھے کام کی ہمت افزائی گویا ان کا دن رات کا مشغلہ تھا، کبھی اپنی شخصیت کو نمایاں کرنے کی کوشش نہیں کی، ہمیشہ بیک گراؤنڈ میں رہتے، ''ندائے ملت'' ہو، پیام انسانیت کا کام ہو، یا مشاورت کا، مسلم مجلس ہو یا دینی تعلیمی کونسل، ندوہ کا ۸۵ رسالہ جشن ہو یا عرب مہمانوں کی آمد، ہر موقع پر پوری طرح شریک، لیکن اس طرح جیسے خود انھوں نے کچھ نہیں کیا۔''(۱)

اس سلسلہ میں محمد میاں کی فکر اور بے چینی کو سمجھنے کے لیے ان کی ایک تحریر نقل کی جاتی ہے جو ''رضوان'' (ستمبر ۱۹۷۳ء) سے ماخوذ ہے، ملاحظہ ہو:

''ایک مسلمان کے لیے معاش کا مسئلہ، ملازمت کا اور کاروبار کا مسئلہ حتی کہ فسادات اور جان و مال کا مسئلہ اتنا اہم نہیں جتنا اس کے دین و ایمان کا مسئلہ اور ایمان پر خاتمہ، عذاب سے نجات اور جنت میں داخلہ کا مسئلہ ہے، قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا قُوْآ اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ نَاراً﴾

(اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں اور اہل وعیال کو آگ کے عذاب سے بچاؤ)

لیکن جہنم سے نجات اور جنت میں داخلہ کا مسئلہ، عقیدہ وایمان کی درستی وصحت سے متعلق ہے، اور عقیدہ وایمان کی درستی وصحت صحیح دینی تعلیم پر منحصر ہے، اس لحاظ سے دیکھیے تو مسلمان بچوں کی تعلیم

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ) ذمہ داری کے اہم منصب پر بھی فائز ہوئے کہ وہ تاحیات جنرل سکریٹری رہے، اور اپنی علالت کے زمانہ میں بھی اس کام سے پہلو تہی نہیں کی، لکھنؤ میں ۲۰۰۱ء کو انتقال کیا۔(م)

(۱) تعمیر حیات (محمد الحسنی نمبر) ص/۲۵۶

کی اہمیت ہم پر پوری طرح واضح ہو جاتی ہے، اور اس کی مزید تفصیل اور تشریح کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ کیا اس دینی تعلیم کا نظام ہماری ملت میں صحیح معنی میں موجود ہے یا نہیں؟

اگر ہم اس ملک کی ۲۵ رسالہ تاریخ کا جائزہ لیں تو ہمیں اندازہ ہو جائے گا کہ سیکولر یا سرکاری نظام تعلیم میں اس کی کوئی گنجائش نہیں، گنجائش نہ ہوتی تب بھی کوئی شکایت کی بات نہ تھی، مصیبت یہ ہے کہ جو نصاب تعلیم بچوں کو پڑھایا جارہا ہے وہ اس قدر زہریلا، مشرکانہ اور مضر ہے کہ نہ صرف ہمیں ایک متوازی نظام تعلیم کا انتظام کرنا ہے بلکہ اس زہر کا تریاق بھی مہیا کرنا ہے۔

اس وقت جو نصاب تعلیم سرکاری مدارس میں پڑھایا جارہا ہے وہ ایسا ہے کہ جس کو پڑھنے کے بعد کوئی مسلمان بچہ (اگر وہ صرف اسی نصاب پر انحصار کرے) مسلمان باقی نہیں رہ سکتا، اس لیے اس نصاب تعلیم پر تکیہ کر کے بیٹھ جانا خودکشی کے مرادف ہے۔

بنیادی بات جو اس پورے مسئلہ میں ہمیں طے کرنا ہے وہ یہ ہے کہ خود ہم مسلمانوں کو اس اہم مسئلہ میں کیا کرنا ہے؟ درحقیقت اس معاملہ میں سب سے بڑا قصور مسلمانوں کا ہے، اور سب سے زیادہ ذمہ داری بھی مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے، آج ضرورت اس بات کی ہے کہ اپنے تمام مسائل کے ساتھ ہم اس مسئلہ کو بھی حل کریں اور ہر مسلمان خواہ وہ کسی بھی مدرسۂ خیال، مکتب فکر، برادری اور کسی بھی شہر یا قصبہ سے متعلق ہو اس میں بھرپور حصہ لے، اور یہ محسوس کرے کہ حالات کتنا سنگین رخ اختیار کرنے

والے ہیں، اور اگر بروقت توجہ نہ کی گئی تو خدانخواستہ ایسا وقت آئے گا کہ نئی نسل اپنی تہذیب، ثقافت، مذہب، کلچر اور زبان سے بالکل بیگانہ ہو جائے گی۔

دینی تعلیم کا مسئلہ مسلمانوں کے ہر مکتب فکر کے لوگوں کو آواز دے رہا ہے کہ وہ اپنے سارے اختلافات بالائے طاق رکھ کر اس اہم مسئلہ میں یکسو ہو جائیں اور ایک متوازی نظام تعلیم کا جال بچھا دیں جو ان کو غلامی سے بے نیاز کر دے، ایک زندہ قوم کی حیثیت سے ہمیں یہ کام اس سے قبل کر لینا ہو گا کہ لگام ہمارے ہاتھوں سے جاتی رہے اور کف افسوس ملنے کے سوا کچھ باقی نہ رہے۔"

باب ششم

تحریک ندوۃ العلماء

محمد میاں کا تعلق تحریک ندوۃ العلماء سے پشتینی تھا، ان کی نشو ونما اور تعلیم و تربیت اسی گہوارہ میں ہوئی جو درحقیقت تحریک ندوۃ العلماء کا گہوارہ تھا، ۱۳۱۱ھ میں فیض عام کالج کانپور میں اس تحریک کا آغاز ہوا، مولانا محمد علی مونگیری نے ہر مکتب خیال کے علماء کے مجمع میں اس کو پیش کیا اور پھر اس کی پذیرائی ہوئی اور ایسی ہوئی کہ تحریک باوجود مخالفتوں کے دن دونی رات چوگنی ترقی کرتی رہی اور اس تحریک کے مشعل کو مولانا محمد علی مونگیری، علامہ شبلی نعمانی اور محمد میاں کے جد امجد مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی صاحب نے تھامے رکھا اور پھر کچھ وقفہ کے بعد ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی ناظم ہوئے اور تقریباً ۳۰ رسال ناظم رہے، ڈاکٹر صاحب کی نظامت کے دوران ندوۃ العلماء نے اور اس کے دارالعلوم نے بیش از بیش ترقی کی، ۱۹۶۱ء میں ڈاکٹر صاحب کا انتقال ہوا، ان کے بعد ان کے فاضل بھائی مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی باتفاق رائے ناظم مقرر ہوئے، خدا ان کی عمر میں برکت دے اور ان کے دم سے ندوۃ العلماء کی تحریک اور دارالعلوم کو ترقی پر ترقی نصیب فرمائے، محمد میاں پیدا ہوئے تو والد ماجد کی نظامت کے دور میں اور انتقال کیا تو اپنے عم مکرم کی نظامت کے دوران، اپنی پوری زندگی اسی ماحول میں گزاری، اس تحریک کو سنا، اس کو پڑھا، اس کو دیکھا، اس کو سمجھا اور پھر اس کی محبت اور اس سے تعلق کو اپنے دل و دماغ میں بسایا، انھوں نے اس تحریک کو عام سے عام تر کرنے کے لیے

اکتوبر ۱۹۵۵ء میں ''البعث الاسلامی'' نام کا ایک عربی ماہنامہ اپنے دوستوں (ڈاکٹر مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی وڈاکٹر مولانا سید محمد اجتباء ندوی) کی مدد سے نکالا اور ۱۰ رنومبر ۱۹۶۳ء میں ایک اردو پندرہ روزہ ''تعمیر حیات'' کے نام کا پرچہ نکالا اور دونوں پرچوں کے وہ مدیر ہوئے اور ان دونوں پرچوں کے ذریعہ انھوں نے تحریک ندوۃ العلماء اور دار العلوم کی علمی خدمات کی بڑی اشاعت کی، اور اس سلسلہ میں ان کا قلم بڑا رواں رہا، وہ اول سے آخر تک اس تحریک کے پرجوش داعی اور مبلغ رہے، ان کی ہر ہر سطر سے اس تحریک کی حمایت اور اس کی زندہ ترجمانی ظاہر ہوتی ہے۔

تحریک ندوۃ العلماء کی ترجمانی

انھوں نے تعمیر حیات میں اپنے پہلے ہی اداریہ میں اس تحریک کی تاریخ بیان کرتے ہوئے ان الفاظ میں ترجمانی کی، وہ لکھتے ہیں:

> ''آج پھر ہم اس عہد کی تجدید کرتے ہیں جو ہندوستان کے مخلص اور روشن ضمیر علماء نے آج سے ۷۰ ربرس پہلے کانپور کے مدرسہ فیض عام میں کیا تھا، وہ یقیناً ایک مبارک اور تاریخی گھڑی تھی جس کو ہندوستان کی اسلامی تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔
>
> انھوں نے اپنی ایمانی فراست سے وقت کی جس آواز کو سمجھا تھا اور اپنی نگاہ بصیرت سے جن انقلابات اور تغیرات کا مشاہدہ کیا تھا اس کا عمل ابھی ختم نہیں ہوا، بیسویں صدی کے اس نصف آخر میں بھی (جو مادہ پرستی، الحاد و بے دینی اور غیر اسلامی نظریات و تحریکات کی سخت یورش کا عہد ہے) ان کی جلائی ہوئی شمع روشن ہے اور ماحول کی کثافت اور تاریکی کے ساتھ ساتھ اس کی روشنی بھی برابر بڑھتی جارہی ہے۔
>
> یہ دراصل اس عہد کی تجدید ہے کہ ندوۃ العلماء نے جو دعوت،

نصب العین اور نظام عمل مسلمانوں کے سامنے پیش کیا اور جس نے ان کے اندر زندگی کی ایک نئی لہر پیدا کردی تھی وہ دعوت اور نصب العین ایک طرف علوم نبوت کا حامل و داعی اور شارح و ترجمان اور مسلمانوں کی معاشرتی ودینی اصلاح، رفع نزاع باہمی اور اخوت اسلامی کا آئینہ دار ہے، اور دوسری طرف مغرب کے چیلنج کا ٹھوس اور عملی جواب بھی ہے، یہ اس کے دو ایسے شہپر ہیں جو اس کی بلند اور نتیجہ خیز پرواز کے لیے ضروری ہیں، وہ نہ مرعوبیت کا قائل ہے نہ فرار کا داعی، نہ مغربی علوم اور مادی وسائل وترقیات کا بالکلیہ منکر ہے نہ اس کا مقلد جامد اور خوشہ چیں، وہ نہ ان علوم و وسائل اور صنعتی ترقیات سے وحشت رکھتا ہے نہ ان سے مقاصد کا سا معاملہ کرنا چاہتا ہے، وہ مغربی تہذیب کی قوت و وسعت و جاذبیت اور اثر انگیزی کا معترف بھی ہے اور اس کے معنوی افلاس، باطنی ظلمت اور بے مقصدیت اور بے یقینی کی اس کیفیت سے بھی واقف ہے جو یورپ کے حسین وجمیل مظاہر کے اندر پوشیدہ ہے اور جس نے اس کو حقیقی سکون، قلبی اطمینان اور باطنی مسرت سے یکسر محروم کر رکھا ہے۔

ندوۃ العلماء کے یہ دو ایسے بازو ہیں جو اس کی متوازن ترقی اور پیش قدمی کے لیے بے حد ضروری ہے اور دونوں کے صحیح تناسب کو ملحوظ رکھنا ندوہ کے ہر طالب علم، ہر ذمہ دار اور ہر بہی خواہ کا فرض ہے۔''

ندوۃ العلماء کی تحریک کی ابتدا اور ہندوستان میں اس کی پذیرائی کے متعلق محمد میاں اپنی کتاب ''سیرت مولانا محمد علی مونگیری'' میں لکھتے ہیں:

''۱۵، ۱۶، ۱۷؍شوال ۱۳۱۱ھ مطابق ۲۲، ۲۳، ۲۴؍اپریل ۱۸۹۴ء کو مدرسہ فیض عام کی دستار بندی کے موقع پر کانپور میں ندوۃ العلماء کا پہلا اجلاس بہت شان وشوکت کے ساتھ ہوا اور اس نے ملک کے طول وعرض میں زندگی کی ایک لہر دوڑا دی، یہ ایک نیا تجربہ تھا جس سے قوم آشنا ہو رہی تھی، اس جلسہ میں مختلف دینی جماعتوں اور مکاتب خیال کے نمائندے جس اتحاد اور جذبہ اسلامی کے ساتھ جمع ہوئے اور باہم شیر وشکر ہو گئے وہ بجائے خود ایک حیرت انگیز کارنامہ تھا۔''(۱)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''اس تحریک نے مختصر سے عرصہ میں ڈھاکہ سے پشاور اور حیدرآباد تک نہ جانے کتنے سرد دلوں کو گرما دیا اور کتنے سینوں میں امید ویقین کی شمع روشن کر دی۔''(۲)

تحریک ندوۃ العلماء نے نہ صرف یہ کہ ہندوستان میں اثر ورسوخ پیدا کیا بلکہ عرب ممالک میں اس کا جو شہرہ ہوا، اس کے متعلق محمد میاں رقم طراز ہیں:

''ندوۃ العلماء کی رودادوں سے معلوم ہوتا ہے کہ دو سال کے اندر اندر نہ صرف ہندوستان بلکہ مصر وشام میں بھی ندوہ کا خاصا تعارف ہو گیا تھا، عرب علماء بلا تأمل اس کے اغراض ومقاصد سے اتفاق کا اظہار کر رہے تھے، مصری اخبارات میں بھی اس کی تائید میں متعدد مضامین شائع ہوئے، خاص طور پر ''المؤید'' اور ''الرفیق'' نے اس کی پرزور حمایت کی، اصلاح نصاب اور اس میں علوم جدیدہ کا اضافہ یہ دو ایسی چیزیں تھیں جن کی وجہ سے

---

(۱) سیرت مولانا محمد علی مونگیری ص/۱۲۵ (۲) ایضاً/۱۳۳

عالم عربی کے علماء کو ندوہ سے غیر معمولی دلچسپی ہوگئی تھی، مغربی تہذیب کے اثر ونفوذ کی وجہ سے ان کے یہاں بھی اس قسم کے مسائل درپیش تھے جن سے ہندوستانی مسلمانوں کو واسطہ تھا، مخلص اور روشن ضمیر علماء اس صورت حال کو دیکھ کر فکر مند تھے اور ان کو کوئی سبیل نظر نہ آرہی تھی نہ ان علوم اور ان کے پس منظر اور ان کے محرکات ودواعی سے انکار تھا، اور نہ وہ ان کو بجنسہٖ قبول کرسکتے تھے، ندوۃ العلماء کے قیام سے ان کو اپنی یہ مشکل آسان ہوتی نظر آئی۔'' (۱)

ندوہ کا نصاب ونظام تعلیم

ندوۃ العلماء کی طرف سے اس کی درس گاہ دار العلوم کے لیے جو نصاب مرتب ہوا تھا اور جس کو مولانا محمد علی مونگیری بانی وناظم اول ندوۃ العلماء نے پیش کیا تھا، محمد میاں اس کی تائید میں کتنے بلند الفاظ استعمال کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

''مروجہ درس نظامی اور شروح وحواشی کے کتب خانہ کے مقابلہ میں یہ نصاب ایک انقلاب انگیز نصاب کہلانے کا مستحق ہے، اور اس کے حامیوں کی نظر میں بغاوت سے کسی طرح کم نہیں، اس میں اس کے سارے نظام کو پہلی بار درہم برہم کردیا گیا اور ان بہت سے اصولوں اور روایتوں کو توڑ دیا گیا ہے جن پر ان کی بنیاد تھی، ...... کتابوں کے انتخاب وترتیب اور حذف واضافہ کے وقت اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ یہ کتابیں طلبہ میں وہ صلاحیت وقابلیت اور وہ صفات وخصوصیات پیدا کرسکیں جو اس تغیر پذیر اور مادہ پرست دنیا کے لیے ضروری ہیں، یہ نصاب تعلیم

---

(۱) سیرت مولانا محمد علی مونگیری ص/۱۴۳

اور دارالعلوم کا خاکہ اور دستور العمل ندوۃ العلماء جیسے ادارے کے لیے اس وقت بلاشبہ موزوں ترین نصاب اور دستور العمل تھا . اور باوجود اس کے کہ اس پر نصف صدی سے زائد عرصہ گزر چکا ہے اور اب اس میں خاصے تغیر اور ترمیم واضافہ کی ضرورت ہے (اور جب تک زمانہ بدلتا رہے گا یہ ضرورت باقی رہے گی) اس کی اسپرٹ اور روح اور اس کا مزاج اور مقصد آج بھی نیا اور تازہ ہے اور اس کے بعض اجزاء اس مغربی، اشتراکی، لادینی اور مادہ پرست دنیا میں بھی قابل تقلید اور لائق استفادہ ہیں۔" (۱)

اپنی کتاب کے اسی صفحہ کے حاشیہ پر لکھتے ہیں:

"مسرت کی بات ہے کہ اب دارالعلوم اپنے نصاب کے معاملہ میں خاصی حد تک خود کفیل ہو گیا ہے، صَرف ونحو، ادب وانشاء اور جغرافیہ پر خود فضلائے ندوہ نے بیش قیمت کتابیں تیار کی ہیں جن میں جدید تقاضوں کی رعایت کے ساتھ طلبہ کی استعداد اور ذوق ومناسبت کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے، طبعیات، معاشیات اور سیاسیات کے درس ومطالعہ کا بھی انتظام ہے، اگرچہ خاطر خواہ نہیں ہے۔" (۲)

آگے چل کر محمد میاں ندوہ کے نظام تعلیم اور دستور کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جدید علوم وفنون اور جدید مسائل اور رجحانات سے واقفیت، جدید علم کلام کی طرف توجہ اور نئے ملحدانہ نظریات اور لادینی تحریکات کے مقابلہ کے لیے جن کی پشت پر ہزاروں انسانوں

---

(۱) سیرت مولانا محمد علی مونگیری ص/۱۶۰ (۲) ایضاً/۱۶۰

کی ذہانتیں اور دنیا کا عظیم و وقیع لٹریچر ہے، ہمیں یقیناً اپنے نظام تعلیم کو اختیار کرنے کی ضرورت ہے، لیکن ہمارے سارے فکری، اجتماعی، تعلیمی نظام میں یہ روح جاری و ساری ہونی چاہیے کہ اس کا اصل مقصد روح کی بالیدگی، خدا کی معرفت و محبت کا حصول اور اس کے احکام اور مرضی کے مطابق زندگی کی تشکیل ہے اور بس! اگر یہ بلند نصب العین ہم ہر وقت اپنی نظر کے سامنے رکھیں گے تو ہمارا ہر قدم لامحالہ اس روشنی میں اٹھے گا اور ہم اس بے مثال تجربہ میں کامیاب ہوسکیں گے جس کی جرأت اس عہد آخر میں صرف ندوۃ العلماء نے کی ہے۔''(۱)

اپنی کتاب ''روداد چمن'' حسب ذیل عبارت سے شروع کرتے ہیں اور وہ بڑے اعتماد سے لکھتے ہیں:

''ندوۃ العلماء درحقیقت ایک ہمہ گیر علمی، دینی، اصلاحی اور تعلیمی تحریک کی حیثیت سے قائم ہوا تھا، یہ ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۸۹۲ء کی بات ہے، اس تحریک کے بلند و عظیم مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک تجربہ گاہ کے طور پر دارالعلوم ندوۃ العلماء کا قیام اس کے چھ سال کے بعد ۱۳۱۶ھ مطابق ۱۸۹۸ء میں عمل میں آیا، یہ تجربہ اتنا کامیاب اور بابرکت ثابت ہوا کہ بعد میں اس دارالعلوم نے تحریک ندوۃ العلماء سے زیادہ شہرت و مقبولیت حاصل کرلی۔(۲)

---

(۱) سیرت مولانا محمد علی مونگیری ص/۲۸۰

(۲) روداد چمن ص/۱۲۵

دارالعلوم میں جس نصاب تعلیم نے رواج پایا اور جن شخصیتوں نے اس نصاب کو چار چاند لگائے، ان کے متعلق لکھتے ہیں:

''نصاب کے میدان میں جو کام ہوا، وہ ندوۃ العلماء کی تاریخ کا روشن اور تابناک ورق ہے، مولانا محمد علی مونگیری کے پیش کردہ نصاب تعلیم اور مجوزہ نقشہ دارالعلوم اور ان کے نامور رفقاء مولانا شبلی، مولانا شیروانی، مولانا سید عبدالحی وغیرہ کی کوششوں نے ندوۃ العلماء کو ایک نئے نظام تعلیم سے آشنا کیا جو قدیم وجدید کے محاسن کا جامع اور دونوں کے عیوب سے پاک تھا، بالخصوص مولانا شبلی اور ان سے بڑھ کر مولانا سید سلیمان ندوی نے ان کے دامن کو عطر بیز اور خوش رنگ پھولوں اور آبدار موتیوں سے بھر دیا جن کی آب وتاب اور چمک دمک آج بھی نظروں کو خیرہ کر رہی ہے اگرچہ اس سلسلہ میں اب بھی بہت کام باقی ہے اور زمانہ کے ساتھ ندوۃ العلماء کی ذمہ داریاں بھی برابر بڑھتی جارہی ہیں۔'' (۱)

نشر وتحقیق کے ادارے اور ان کا کام اور مقصد

دارالعلوم ندوۃ العلماء نے تعلیم کے ساتھ مختلف علمی، دینی میدانوں میں مفید خدمات انجام دی ہیں، ایک نفیس کتب خانہ کا قیام، تجارتی ادارہ کی تشکیل، مجلس تحقیقات شرعیہ کا قیام اور مفید ترین کتابوں کی اشاعت کا کام ان خدمات میں اولین جگہ رکھتا ہے، محمد میاں نے ان ساری خدمات کا کھلے دل سے اعتراف کیا اور ان کی تحسین کی۔

محمد میاں ندوۃ العلماء کی پوزیشن واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

(۱) تعمیر حیات ۱۰ر نومبر ۱۹۶۳ء (اداریہ)

''ندوۃ العلماء درحقیقت قدیم وجدید کی مصنوعی تقسیموں اور سطحی بحثوں سے بالاتر ہے، قدیم وجدید کا حقیقت میں کوئی وجود نہیں، اسلام نہ قدیم ہے نہ جدید، نہ مشرقی ہے نہ مغربی، نہ ندوی ہے نہ دیو بندی، نہ علی گڑھی ہے اور نہ کچھ اور، وہ پانی، ہوا، اور غذا کی طرح ہر زمانے میں یکساں ہر شخص کے لیے ضروری اور آفتاب کی طرح ہمیشہ سے زندہ و تابندہ ہے، وہ ایک ازلی اور ابدی آسمانی پیغام ہے جو زمانہ و تاریخ، زبان و ادب اور معاشرت و اجتماع کے اثرات سے آزاد اور ماوراء ہے، اس لحاظ سے ندوۃ العلماء کی دعوت کو بھی کبھی قدیم و جدید کے چھوٹے چھوٹے پیمانوں سے ناپنا درست نہیں جو عین اسلام کی دعوت، علوم نبوت کی ترجمانی واشاعت اور انبیاء علیہم السلام کی نیابت و وراثت ہے۔''(۱)

مجلس تحقیقات شرعیہ

وہ مجلس تحقیقات شرعیہ کے متعلق لکھتے ہیں:

''تحقیقات شرعیہ کے میدان میں ایک نئے سفر کا آغاز کرنا ہے اور اس کی ساری مشکلات اور الجھنوں کو برداشت کرنا ہے، اس میں جس قدر دین کی فہم اور توازن، تحمل اور دقیقہ رسی کی ضرورت ہے وہ اہل نظر سے مخفی نہیں، خدا کا شکر ہے کہ مولانا مونگیری کا دیکھا ہوا خواب اب شرمندۂ تعبیر ہوتا نظر آرہا ہے، مجلس تحقیقات شرعیہ کے نام سے ایک باضابطہ ادارہ کا وجود اسی کام کے لیے عمل میں آچکا ہے۔''(۲)

---

(۱) تعمیر حیات ۱۰؍نومبر ۱۹۶۳ء (۲) تعمیر حیات ۱۰؍نومبر ۱۹۶۳ء

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی کوششوں سے دارالعلوم میں جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے لیے اردو، عربی اور انگریزی زبان میں مفید کتابوں کے شائع کرنے کا انتظام کیا گیا اور ایک ادارہ کا قیام عمل میں آیا جس کا نام ''مجلس تحقیقات ونشریات اسلام'' رکھا گیا، اس نے چند سالوں کے اندر ہر سہ زبانوں میں مفید اور مقبول عام کتابیں شائع کیں اور اس وقت تک سیکڑوں کی تعداد میں کتابیں چھپ چکی ہیں، اور ان کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، اس ادارہ کی اہمیت وافادیت کے متعلق محمد میاں لکھتے ہیں:

> ''جدید تعلیم یافتہ طبقہ سے ربط واتصال اور اس کو جدید تقاضوں کی روشنی اور جدید اسلوب میں اسلام کی دعوت دینے اور اس کے دل ودماغ کو بیک وقت متاثر کرنے کے لیے مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کے نام سے ایک اہم تصنیفی واشاعتی ادارہ کئی سال سے قائم ہے، اور اس نے ملک میں اپنی ایک وقیع جگہ بنالی ہے۔''(۲)

''البعث الاسلامی'' اور ''تعمیر حیات'' کا اجراء

محمد میاں نے تحریک ندوۃ العلماء، اس کے دارالعلوم، اس کے نصاب تعلیم، اس کی علمی خدمات اور مختلف شعبوں کے قیام کو نہ صرف پوری طرح سراہا بلکہ رہی سہی صلاحیتوں کو اس میں لگا دیا، اور ان کی ترویج واشاعت میں اپنے قلم کی طاقت لگا دی، اس سلسلہ میں انھوں نے ۱۹۵۵ء میں اپنے اہل علم وقلم ساتھیوں کی مدد سے عربی مجلّہ نکالا جس کا نام ''البعث الاسلامی'' رکھا اور مسلسل اس کے ذریعہ تحریک ندوۃ العلماء کی اشاعت کی اور اس کی دعوت کو عالم عربی میں عام کیا، ۱۹۶۳ء میں ارباب حل وعقد کے

---

(۱) تعمیر حیات ۱۰ ارنومبر ۱۹۶۳ء (۲) ایضا

مشوروں اور ان کے تعاون سے ''تعمیر حیات'' کے نام سے ایک پندرہ روزہ مجلّہ کی اشاعت کی اور اس کے پہلے ہی اداریہ میں اس کے سفر کے راستہ اور جادہ و منزل کا تعین کیا اور اس کا اظہار کیا کہ یہ مجلّہ ندوۃ العلماء اور اس کی تحریک کا آرگن ہے، محمد میاں نے اس اداریہ میں تحریک ندوۃ العلماء کو تفصیل سے پیش کرتے ہوئے آخر میں لکھا:

> ''ایڈیٹر نے اس طویل داستان سے یقیناً کچھ لوگوں کی حق تلفی کی، لیکن آج کے دن اس کے پاس اس سے بہتر کوئی پیغام نہ تھا، تعمیر حیات کے آغاز کے ساتھ اس نصب العین اور تخیل کا ذکر لازمی تھا جس کی تبلیغ و اشاعت کے لیے اور جس کے نام پر اس کا اجراء ہو رہا ہے۔'' (۱)

تعمیر حیات کے ذریعہ محمد الحسنی علیہ الرحمہ نے ندوۃ العلماء اور اس کے دار العلوم کے نظام، نصب العین اور خدمات سے مسلمانوں کو روشناس کرایا، اور ہر موضوع پر بڑے مفید مقالات لکھے۔ (۲)

ترانۂ ندوہ

محمد میاں کو ندوۃ العلماء اور اس کے دار العلوم سے اتنا زیادہ شغف اور اس کے کاموں اور اس کی دعوت کی تشہیر میں اتنا زیادہ انہماک پیدا ہو گیا تھا کہ ہمہ وقت اس مادر علمی کی ترقی کی فکر ان کو دامن گیر رہتی تھی، ۱۹۷۴ء کی بات ہے کہ انھوں نے مولانا اسحاق جلیس ندوی کے مشورہ سے راقم سطور کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ ندوہ کا کوئی ترانہ ہونا چاہیے اور پھر انھوں نے مولانا اسحاق جلیس صاحب کے ذریعہ اس کا تقاضا کرایا، اور ان ہی کے ذریعہ مخدومی و معظمی مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی صاحب سے اس

---

(۱) تعمیر حیات ۱۰ر نومبر ۱۹۶۳ء ص/۲

(۲) انھوں نے آخر عمر میں ان مقالات اور اداریوں کو جمع کرنا بھی شروع کر دیا تھا، کہ ان کو کتابی شکل میں منظر عام پر لایا جائے گا۔

کی افادیت واہمیت کے متعلق اپنے خیال اور ارادے کا اظہار کیا اور پھر خود مسلسل تقاضے کیے بلکہ اپنی خداداد سخن فہمی اور ذوق شعری سے کام لیتے ہوئے ترانہ کی بحر کا انتخاب کیا، راقم سطور نے ان کے پیہم اصرار سے خدا کا نام لے کر ترانہ کہنا شروع کیا اور اس کے اعتراف میں کوئی باک نہیں کہ کہیں جب بھی کوئی دشواری ہوتی تو بے تکلف ان کے سامنے اس کا اظہار کر دیتا۔

ایک دن کی بات ہے کہ گھر کے نچلے حصہ میں جو ٹھنڈا کمرہ ہے، اس میں ہم دونوں دوپہر کا کھانا کھا کر بیٹھے تھے کہ وہ پوچھنے لگے: منجھلے بھیا! ترانہ شروع کیا کہ نہیں؟ راقم سطور نے کہ ترانہ کہنا آسان ہے کہ ایک دن میں کہہ ڈالا جائے؟ وہ بولے: اچھا جو شعر کہے ہیں سنایئے! کچھ شعر سنائے گئے، وہ ان کو سن کر بہت محظوظ ہوئے اور ان کے طرز، الفاظ اور بحر کو بہت پسند کیا۔

تھوڑی دیر بعد خود ایک مصرعہ کہہ کر بولے: منجھلے بھیا! اگر اس مصرعہ کو آپ ہر بند کے آخر میں رکھ دیں تو کوئی حرج ہے؟ اور پھر انھوں نے اس مصرعہ کو پڑھا ۔

ہم نازش ملک وملت ہیں، ہم سے ہے درخشاں صبح وطن

راقم سطور نے اس جاندار اور پر شوکت مصرعہ کو سن کر ان کے شعر وسخن کے ذوق اور شعر گوئی کی صلاحیت کی داد دی اور کہا کہ محمد میاں! تم شاعروں میں سے نہیں ہو مگر کیا خوب مصرعہ تم نے کہا۔

کچھ دیر بعد راقم سطور کے ذہن میں دوسرا مصرعہ آ گیا جو باہمی مشورہ سے تھوڑی بہت تبدیلی کے بعد حسب ذیل انتخاب کیا گیا وہ مصرعہ یہ ہے: ؎

ہم تابش دیں، ہم نور یقیں، ہم حسن عمل، ہم خلق حسن

اس دوسرے مصرعہ کے کہنے کے بعد دونوں نے یہ طے کر لیا کہ اس شعر کو جو دو ذہنوں اور زبانوں کا اختراع ہے ہر بند کے آخر میں رکھ دیا جائے۔

اور پھر اس ترانہ کے کہنے والے نے بلاتکلف ترانہ کے مختلف بندوں میں بعض

الفاظ کے الٹ پھیر اور تبدیلی اور مصرعہ اور بند کو جاندار بنانے کے لیے اپنے چھوٹے لیکن سخن فہم اور ذوق علم وادب سے مالا مال بھائی کے قیمتی مشوروں کو اپنے لیے سرمایۂ صد افتخار سمجھا، اور کئی تبدیلیاں ان کے مشورہ سے عمل میں آئیں۔

جشن ندوۃ العلماء

ندوۃ العلماء کے ارباب حل وعقد کے مشوروں سے طے ہوا کہ شروع دور میں ندوہ کے جو مسلسل جلسے ہوتے تھے ان سے ندوہ کی تحریک کو بہت فائدہ پہنچا تھا مگر بدقسمتی سے یہ جلسے مدت مدید سے نہیں ہو سکے، اس لیے اس کا ایک جشن تعلیمی منعقد کرنا چاہیے اور اس میں دنیائے اسلام کے اہل علم حضرات کو دعوت دینی چاہیے، اس تجویز کے پاس ہوتے ہی ندوہ کے سارے منتسبین اس کی کامیابی کے لیے کوششیں کرنے لگے، عرب ممالک کے علماء کو دعوت نامے بھیجے گئے، وفود روانہ کیے گئے اور جو بھی ظاہری اور باطنی کوششیں ہو سکتی تھیں کی گئیں، لیکن اصل تیاری صرف دو مہینے میں کی گئی، اس تیاری پر تبصرہ کرتے ہوئے محمد میاں لکھتے ہیں:

> ''تیاریوں کے یہ دو مہینے رمضان وشوال اپنے کام کی مقدار کے اعتبار سے شائد دو سال کے برابر تھے، ان دو مہینوں اور بالخصوص ماہ شوال میں اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اتنا کام ہو گیا جو شاید برسوں میں نہ ہوتا، اور بہت حسن ونزاکت اور سہولت و راحت کے ساتھ۔ ﴿ وَلِلّٰہِ جُنُودُ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ ﴾(۱)

وہ آگے سب سے زیادہ مؤثر اور کیف آور اور یقین پرور تیاری کی اہمیت اور اس کی اثر انگیزی کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''اجلاس ندوۃ العلماء کے انتظامات وتیاریوں میں سب سے

---

(۱) روداد چمن ص/۴۳

زیادہ اور بڑا حصہ ٹوٹے ہوئے دلوں، اٹھے ہوئے ہاتھوں اور خوف وامید کے ان آنسوؤں کا ہے جنھوں نے پورے ماحول کو پر کیف کر دیا تھا اور جن کی کرشمہ سازی اور مسیحائی کثیف سے کثیف دل نے بھی محسوس کی، اس دعا و توجہ اور انابت الی اللہ کا جو نتیجہ نکلنا چاہیے تھا وہی نکلا، اس سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ آج ندوۃ العلماء سے علماء و مشائخ اہل اللہ اور اللہ تعالیٰ کے مقبول و مخلص بندوں کو کتنا گہرا تعلق ہے، اور علاوہ تعلیم یافتہ طبقہ کے جو شروع سے اس کی زلف گرہ گیر کا اسیر اور اس کے علم وادب کا شیفتہ و دلدادہ ہے سیدھے سادھے سچے اور نیک طبیعت مسلمانوں کے دلوں میں اس کی کیسی محبت ہے اور وہ کیا موہنی اور کشش ہے جو آج ان کو کشاں کشاں اس کی طرف کھینچ رہی ہے ؎

قدم یہ اٹھتے نہیں اٹھائے جاتے ہیں!''

اس جشن سے پہلے مسجد کی توسیع کی گئی، از سر نو چمن بندی ہوئی، مختلف عمارتوں کی تکمیل تعمیر ہوئی اور علمی و تعلیمی نمائش کی تیاریاں کی گئیں، ان تیاریوں میں نہایت دلچسپ اور پر از معلومات علمی و تعلیمی نمائش تھی، جس کی ترتیب و تزئین میں محمد میاں اور مولوی اسحاق جلیس ندوی مرحوم کا بڑا حصہ تھا، محمد میاں کے الفاظ میں اس نمائش کا حال سنئے:

''علمی و تعلیمی نمائش (جس کو اس جشن تعلیمی کا ایک بہت اہم، ولولہ انگیز اور جاذب نگاہ حصہ قرار دیا جا سکتا ہے، اور جو بہت جلد مرکز توجہ بن گئی) بھی وقت کے ساتھ کشمکش اور جذبۂ فکر کے امتزاج کی ایک حسین و جمیل داستان ہے، پہلے اندازہ نہ تھا کہ اس کی افادیت اس طرح کھل کر سامنے آئے گی۔''(۱)

---

(۱) روداد چمن ص/۵۰

اس موقع پر انھوں نے ''پیام ندوۃ العلماء'' کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی جو ندوۃ العلماء کے نصب العین کو سمجھنے اور اس کی ضرورت اور مقاصد سے واقفیت کے لیے مختصر مگر بڑی جامع کتاب ہے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اس جشن تعلیمی کی روداد جس خوبی کے ساتھ ''روداد چمن'' میں محمد میاں نے پیش کی وہ ان کی بڑی کامیاب کوشش اور جشن کے حسن و جمال اور ترتیب و تزئین کا حسین مرقع ہے، جس کے متعلق حکیم عبدالقوی صاحب، اردو کے مایہ ناز صاحب طرز ادیب مولانا عبدالماجد دریابادی کا تبصرہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> ''جشن ندوۃ العلماء کی تفصیلی روداد کے سمندر کو ''روداد چمن'' کے کوزہ میں بند کیا، ان کی اس تصنیف پر مرحوم مدیر ''صدق جدید'' مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنی علالت کے آخری زمانہ میں تبصرہ کرتے ہوئے مرتب کو جو داد دی تھی وہ ان کے سے تنقید نگار قلم سے بہت کم نوعمر اہل قلم کو ملی ہوگی، یہ آخری مکمل تبصرہ تھا جو مولانا مرحوم کے قلم سے صدق جدید (اشاعت ۲۲/اکتوبر ۱۹۷۶ء) میں نکلا تھا، جس میں کتاب کو بہت ہی جید و بلیغ اور بہت ہی مؤثر قرار دینے کے بعد آخری فقرہ یہ بھی لکھا گیا تھا:
>
> ''لکھنے والے کے قلم کا اعجاز یہ ہے کہ کتاب لٹریچر تو خیر ہے ہی، باقی کتاب کے جو اجزاء پروپیگنڈے کے ہیں ان پر بھی گمان لٹریچر کا ہوتا ہے۔'' (۱)

---

(۱) تعمیر حیات (محمد الحسنی نمبر) ص/۲۲۴

باب ہفتم

تصنیفات، رسائل اور ترجمے

برادر عزیز محمد الحسنی مرحوم کے شفیق اور جان و دل سے عزیز رکھنے والے چچا مخدومی و معظمی مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی مدظلہ (جن کو مرحوم ''چچا میاں'' کے الفاظ سے یاد کرتے تھے) محمد میاں کی زوداثر تحریروں کے متعلق لکھتے ہیں:

''ان کا زورِ تحریر، جوشِ بیان ہندوستان سے قدم باہر نکالے بغیر عربی تحریر و انشاء پر ایسی قدرت جو ان کے بزرگوں اور معاصرین سب کے لیے موجبِ حیرت بلکہ ایک طرح کا حیرت انگیز انکشاف ہے، بڑے بڑے اہم موضوع پر قلم برداشتہ اور برجستہ لکھنے کی صلاحیت، تحریر کی تاثیر اور دل آویزی تنہا اس ماحول اور تعلیم و تربیت کا نتیجہ نہیں ہے اور نہ ان کی باقاعدہ تعلیم و درسیات کو (جو نا قابلِ قیاس حد تک مختصر محدود اور ان کے والد ماجد کے مجتہدانہ طریقِ تعلیم پر ہے) اس سے کوئی مناسبت ہے، ان کا معاملہ بالکل وہبی اور خداداد ہے، ان کے مضامین میں جو زور (اور آمد ہی آمد) اور ان کی تحریر میں جو تاثیر ہے وہ محض زورِ قلم اور حسنِ بیان کا نتیجہ نہیں، بلادِ عربیہ خصوصاً مصر و شام میں بڑے بڑے اہلِ قلم اور اہلِ فکر موجود ہیں، جن کی زبان عربی اور تحریر

وانشاء ان کا شب و روز کا مشغلہ ہے، لیکن ان کی تحریر میں وہ
حلاوت و بلاغت اور قوت وحرارت نہیں جو اس ہندنژاد اور نوخیز
داعی اور انشاء پرداز کے قلم می ہے، یہ اس کے سوز دروں اور
جذب اندروں کا نتیجہ ہے، اور اس کو اقبال کے الفاظ میں یہ کہنے
کا حق ہے ؎

خون دل وجگر سے ہے میری نوا کی پرورش
ہے رگ ساز میں رواں صاحب ساز کا لہو'

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے ان الفاظ کے بعد اس کے اعتراف میں کوئی باک نہیں کہ محمد الحسنی نے جس طرح زوداثر تصنیفات، اداریوں، مقالات سے عرب حلقوں کو متأثر کیا، اسی طرح اردو زبان میں بعض کتابوں کے کامیاب ترجموں، تعمیر حیات کے اجراء اور اس کے اداریوں، مختلف شخصیات اور تحریکات پر قلمی کاوشوں سے اردو داں حلقوں میں خواہ وہ کسی ملک میں ہوں اپنی فضیلت علمی، فکر ونظر کی بلندی، تحریر کی قوت وطاقت اور بلاغت وفصاحت اور ہر ہر جملہ کی تاثیر کا سکہ چلایا، سب سے پہلے انھوں نے اپنے والد ماجد ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب مرحوم کے حکم پر حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی کتاب "سرور المحزون" (فارسی) کا اردو ترجمہ کیا، اس کے بعد مشہور نومسلم محمد اسد صاحب کی کتاب Road to Mecca (روڈ ٹو مکہ) کے عربی ترجمہ "الطريق إلى مكة" کا بڑا کامیاب اور مؤثر ترجمہ کیا جس کا نام ''طوفان سے ساحل تک'' رکھا۔

محمد الحسنی نے اپنی اردو تصانیف، ترجموں، مقالات اور تحریروں میں بڑا اچھوتا اسلوب اختیار کیا، اور اس میں بھی ان کو وہ قابو حاصل تھا جو عربی زبان میں وہ رکھتے تھے، ان کی اردو تحریر کے متعلق اردو کے ادباء اور اہل قلم نے اپنی بہترین رائے اور تاثرات کا اظہار کیا ہے، ان کے ایک صاحب قلم اور صاحب فکر ونظر صحافی دوست

مولانا اسحاق جلیس ندوی (مدیر تعمیر حیات) (۱) اپنی رائے اس طرح دیتے ہیں:

''مرحوم نے زندگی کی صرف ۴۴ ر بہاریں دیکھیں، لیکن اس مختصر مہلت عمر میں انھوں نے جو دینی علمی ادبی ورثہ چھوڑا وہ کمیت و کیفیت کے اعتبار سے بڑا گراں قیمت، اپنے تاثرات ونتائج کے اعتبار سے بہت دوررس اور اپنے اسلوب حسن وبیان کے اعتبار سے بڑا ممتاز اور طاقتور ہے، عربی اور اردو کے اس اسلوب کو برتنے میں سب سے کامیاب انھیں کا قلم تھا، جسے ایک قدیم ندوی بزرگ نے ''حسنی ندوی اسلوب'' کہا ہے، اپنے عم محترم مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کا انھوں نے بڑا کامیاب تتبع کیا، اسلوب اور طرز تحریر میں ایسی یکسانیت کہ قریبی ساتھیوں کو فرق وتمیز کرنا دشوار ہو جاتا۔''

مولانا حکیم عبدالقوی صاحب مدیر ''صدق جدید'' اپنے تأثرات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

''مرحوم نہ صرف یہ کہ اپنے والد ماجد ڈاکٹر صاحب مرحوم سے صورتاً بہت مشابہت رکھتے تھے بلکہ علم وفضل، عادات واطوار میں انھیں کے قدم بقدم تھے، اس فرق کے ساتھ کہ بیٹے نے عربی و اردو دونوں کے ایک اعلیٰ انشاء پرداز، صف اول کے مضمون نگار، کامیاب و مشاق مصنف ومترجم کی حیثیت حاصل کرلی تھی

---

(۱) مولانا اسحاق جلیس ندوی احمد نگر مہاراشٹر (ہندوستان) کے رہنے والے تھے، آبائی وطن ضلع ہزارہ (صوبہ سرحد، پاکستان) تھا، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے فاضل حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی تحریک پیام انسانیت کے بڑے ہی سرگرم وفعال کارکن بلکہ روح رواں، ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ترجمان ''تعمیر حیات'' کے ایڈیٹر، مولانا سید محمد الحسنی مرحوم کے رفیق کار وہم خیال وہم عصر اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے معتمد و عاشق زار تھے، ۲۸ رجولائی ۱۹۷۹ء کو لکھنؤ میں دو تین روز کی مختصر علالت کے بعد انتقال کیا، اور وصیت کے مطابق مولانا علی میاں کے خاندانی قبرستان تکیہ کلاں رائے بریلی میں تدفین عمل میں آئی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ۔

اور نسبتاً مختصر مدت میں بہت کچھ لکھ ڈالا، لیکن جو کچھ لکھا وہ معیاری اور درجہ اول کا تھا، اہل نظر ناقدین کو بے ساختہ اس کی تحسین کرنی پڑی۔''

محمد الحسنی نے مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی متعدد کتابوں کے ترجمے کیے، ان میں "الارکان الاربعة" اور مولانا موصوف کی سیرت کی کتاب "السیرة النبویة" کا ترجمہ اردو میں ''نبی رحمت'' کے نام سے کیا، جس کے متعلق حکیم عبدالقوی صاحب مدیر صدق جدید رقمطراز ہیں:

''انھوں نے سیرت نبوی پر مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی ضخیم اور انتہائی اہم کتاب "السیرة النبویة" (عربی) کا سلیس و شگفتہ اردو ترجمہ کیا تھا، جو ''نبی رحمت'' کے نام سے شائع ہو کر بہت مقبول ہوئی، اور اس سے ظاہر ہو کر رہا کہ وہ عربی سے اردو ترجمہ پر بھی کتنی قدرت رکھتے ہیں۔''(۱)

۱۹۷۵ء میں ندوۃ العلماء کا ۸۵/ سالہ جشن منایا گیا، جس میں عرب ممالک کے بہت سے علماء شریک ہوئے اور جو شیخ الازہر شیخ عبدالحلیم محمود کی صدارت میں چار روز جاری رہا، وہ جلسہ اپنی نوعیت کا ممتاز ترین جلسہ تھا، اس میں ایک تعلیمی نمائش بھی لگائی گئی جو لانا اسحاق جلیس ندوی کی محنت کا نتیجہ ہے، اسی سلسلہ میں محمد الحسنی نے ''روداد چمن'' کے نام سے ایک مجموعہ تیار کیا اور اس جلسہ کی پوری روداد شائع کی، حقیقت یہ ہے کہ یہ تصنیف محمد الحسنی کے قلم کا بڑا شاہکار ہے۔

مولانا اسحاق جلیس صاحب ندوی مدیر تعمیر حیات ان کی علمی و تصنیفی خدمات کو خراج تحسین یوں پیش کرتے ہیں:

''۲۳/ سال کی عمر میں انھوں نے مشہور نومسلم محمد اسد

---

(۱) ندائے ملت یکم جولائی ۱۹۷۹ء

صاحب کی کتاب Road to Mecca کا اردو ترجمہ کیا جو
''طوفان سے ساحل تک'' کے نام سے شائع ہو کر مقبول ہوا،
۲۵ رسال کی عمر میں بانی ندوۃ العلماء مولانا محمد علی مونگیری کی ضخیم
سیرت لکھی، اسی زمانہ میں اپنے خاندان کے مورث اعلیٰ حضرت
شاہ علم اللہ کی سیرت ان کے قلم سے نکلی، اس کے علاوہ مولانا
سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی بیشتر کتابوں کا عربی سے اردو میں
ترجمہ کیا، اور بعض کا اردو سے عربی میں، ان کی وہ کتاب جس
نے عالم عربی میں ان کی شہرت کو بام عروج پر پہنچا دیا ''الاسلام
الممتحن'' ہے جس کے چار ایڈیشن مصر سے شائع ہوئے، اس
کتاب کی عرب نوجوانوں میں ایسی پذیرائی ہوئی جو بہت کم
کتابوں کو نصیب ہوئی ہوگی، اس کتاب نے مشرق وسطیٰ سے
مشرق بعید تک دینی اور دعوتی حلقوں کو متاثر کیا، انڈونیشیا کی
ممتاز شخصیتوں نے اس کی خوب خوب تعریف کی اور وہاں کے
بڑے بڑے اجتماعات میں اس کے مضامین سنائے گئے۔(۱)

(۱) تعمیر حیات محمد الحسنی نمبر/۲۶۴

کتب ورسائل کا ایک جائزہ☆

عربی مؤلفات

۱ – الاسلام الممتحن

چھوٹے سائز میں ۲۵۹ صفحات پر مشتمل یہ کتاب سب سے پہلے مصر میں منظر عام پر آئی، ہندوستان میں دارعرفات رائے بریلی سے شائع ہوئی، یہ البعث الاسلامی کے افتتاحیوں کا مجموعہ ہے جسے خود مصنف نے عرب دوستوں کے تقاضہ پر مرتب کیا، مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کا بڑا ہی طاقتور مقدمہ بھی ہے، جس میں کتاب اور مؤلف کتاب کے سلسلہ میں بڑے اونچے کلمات تحریر فرمائے ہیں، عالم عربی میں اور بلاد عجم میں عربی کا شوق رکھنے والوں میں بڑی ہی مقبول ہوئی ہے، اور عرب نوجوانوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا، متعدد ایڈیشن اس کے سامنے آچکے ہیں، سب سے پہلے ۱۹۷۵ء میں پھر ۱۹۷۸ء میں قاہرہ سے شائع ہوئی پھر پے در پے ایڈیشن سامنے آتے رہے، "الاسلام فی مفترق الطرق" پہلا مقالہ ہے اور آخری مضمون "حسن البنّا فی محراب التاریخ الاسلامی" کے عنوان کے تحت ہے، موضوعات مختلف ہیں، سیاسی، دینی، اجتماعی اور ادبی ہیں، البتہ دینی رنگ اور اسلامی فکر ہر موضوع پر غالب ہے، اور وہ یہ ہے کہ مسلمان جہاں کہیں بھی ہوں اپنے دین اصول واقدار سے رشتہ کمزور نہ ہونے دیں، اور نئے سرے سے اسلام پر اعتماد بحال کریں۔

(☆) مرتبہ از محمود حسن حسنی نواسۂ مؤلف

۲- تناقض تحار فيه العيون وتطابق يسر به المؤمنون

یہ کتاب چار مقالات کا مجموعہ ہے، مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے مقدمہ کے ساتھ پہلے دار عرفات رائے بریلی سے پھر المختار الاسلامی قاهرہ "العالم الإسلامي بين التبعية والذاتية" کے عنوان سے شائع ہوئی، پہلا مقالہ "سؤال حائر يحتاج إلى جواب" ہے جو کہ البعث الاسلامی میں شائع ہونے والا ان کا آخری مضمون ہے، انھوں نے عربوں اور مسلمانوں کی زندگی میں جو تضاد دیکھا اس پر ارکان حکومت اور دانشوروں کی خبر لی ہے، اور آخری مقالہ "تطابق يسر به المؤمنون" ان کی زندگی کا آخری مقالہ ہے جو "الرائد" میں شائع ہوا تھا، اور جس میں انھوں نے جامعة البعث الاسلامی کا تصور دیا، اس کا عنوان بھی یہی تھا۔

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی لکھتے ہیں:

"ایسے مضامین ان کے قلم سے نکلے جن میں آبشار کا شور اور طوفان کا زور ہے، اس کا نمونہ ان کے مجموعۂ مضامین "الاسلام الممتحن" اور "تناقض تحار فيه العيون" میں دیکھا جا سکتا ہے، ان کے آخری زندگی کے مضامین میں ایک اہم مضمون وہ تھا جس میں انھوں نے اس تضاد کا نقشہ کھینچا ہے جو اسلامی ممالک میں عمومیت کے ساتھ اور بعض ان عرب ممالک میں (جو اسلام کی نمائندگی، مقامات مقدسہ کی خدمت وحفاظت اور دین صحیح کی دعوت کے دعویدار اور علمبردار ہیں) وہاں کے سربراہوں اور ذمہ داروں کے اقوال وافعال اور اسلام کی تعلیمات اور وہاں کی روزمرہ کی زندگی میں پایا جاتا ہے اور جس کو دور کیے بغیر نہ اسلام کی صحیح تصویر دنیا کے سامنے آسکتی ہے نہ یہ ممالک خطرہ سے نکل سکتے ہیں، انھوں نے اس مضمون میں اپنا دل نکال کر رکھ دیا تھا،

اورخون کے آنسوروئے تھے، یہ مضمون ان کے رسالہ "البعث" کے رجب ۱۳۹۹ھ (جولائی ۱۹۷۹ء) کے شمارہ میں "سـؤال حائر یحتاج إلی جواب" کے عنوان سے شائع ہوا۔

مرحوم کے انتقال کے بعد میں نے وہ مضمون پڑھا اور پڑھ کر مسرت کے ساتھ یہ حسرت ہوئی کہ میں نے یہ مضمون ان کی زندگی میں کیوں نہ پڑھ لیا تھا اگر میں ان کی زندگی میں یہ مضمون پڑھ لیتا تو ان کا ہاتھ چومتا اور پیشانی کو بوسہ دیتا......۔" (۱)

۳- المنهج الاسلامی السلیم

یہ کتاب مؤلف کی وفات کے پانچ سال بعد دارالقلم کویت سے شائع ہوئی، اس پر بھی مقدمہ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کا ہے، یہ بھی ان مقالات ومضامین کا مجموعہ ہے جو البعث الاسلامی میں شائع ہوئے تھے، ان سب میں ایک ہی مشترک پیغام ہے، وہ یہ کہ مسلمان عرب ہوں یا عجم زندگی کے تمام میدانوں میں دین و شریعت کی ہی بالادستی قائم رکھیں، دعوت کی مشکلات اور اس کے اسالیب، نئی نسل کے ایمان وعقیدہ اور دینی شعور کی بیداری کی فکر، مغرب کی تہذیبی وثقافتی غلامی سے گلوخلاصی اور عقیدۂ آخرت اور اسلام کے مکمل نظام حیات ہونے پر طاقتور اسلوب میں رہنمائی کی ہے۔

مصنف نے مسلم ممالک کے زعماء کو بھی متوجہ کیا ہے کہ وہ پالیس بنانے میں ملی و دینی مفادات کو سامنے رکھیں، اور اپنے کسی بھی طرز عمل سے دشمنان اسلام کو تقویت پہنچانے کا کام نہ کریں۔

۴- مع الحقیقة

چھوٹے سائز کے ۲۲۷ رصفحات پر یہ کتاب مشتمل ہے، ۳۴ رمضامین ہیں جو

---

(۱) تعمیر حیات محمد الحسنی نمبر/ ۱۶۸

مختلف موضوعات پر انھوں نے لکھے، یہ مضامین بھی الرائد اور البعث الاسلامی میں شائع ہو چکے ہیں، سید احمد شہید اکیڈمی دار عرفات رائے بریلی سے ۲۰۰۳ء میں مولانا سید محمد الحسنی مرحوم کے صاحبزادہ مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی نے شائع کیے، مقدمہ مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی رئیس التحریر مجلّہ البعث الاسلامی کا ہے۔

۵- أضواء على الطريق

چھوٹے سائز کے ۲۲۸ رصفحات پر مشتمل یہ مجموعہ مضامین مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی کے مقدمہ کے ساتھ ۲۰۰۳ء میں منظر عام پر آیا، یہ ایک سلسلۂ مضامین تھا جو الرائد میں مستقل طور پر "أضواء على الطريق" کے عنوان سے جاری رہا، سیرت کے واقعات اور صحابہ کے نقوش کو سامنے رکھ کر زندگی کے رہنما اصول بتائے گئے ہیں، یہ کتاب بھی سید احمد شہید اکیڈمی رائے بریلی نے شائع کی ہے۔

٦- إلى القيادة العالمية

البعث الاسلامی میں مختلف مناسبتوں سے جو مقالات تحریر کیے، یہ ان کا مجموعہ ہے، عالمی قیادت کے حصول کا راستہ اور منہج بتایا گیا ہے، مصنف نے یہ مجموعہ خود مرتب کر دیا تھا، مصر سے یہ کتاب شائع ہو چکی ہے، اردو میں اس کا عنوان ہوتا تو یوں ہوتا: ''عالمی قائدین سے صاف صاف باتیں''۔

۷- مصر تتنفس

مصر کے حالات اور تبدیلیوں پر یہ مقالات کا مجموعہ ہے، یہ بھی البعث الاسلامی میں شائع ہوتے رہے ہیں، "دولة المؤامرات، آلة التعذيب تتكلم، الصنم الأكبر، تاريخ صنع في السجن، شهداء الإخوان يتكلمون، لا ياصاحب "الأهرام"، القومية الهندية تتساء ل" اور "مصر تتنفس" جیسے طاقتور و مؤثر مقالات و مضامین ہیں کل ۲۴ رمقالات ہیں۔

۸- همسات إلى جزيرة العرب

یہ کتابچہ ہے جو دار عرفات تکیہ کلاں رائے بریلی سے شائع ہوا، جس میں جزیرۃ

العرب کی عالم اسلام میں اہمیت اور اس کے تقاضوں اور عربوں کی ذمہ داریوں کو یاد دلایا گیا، اور اس تضاد پر افسوس ظاہر کیا گیا ہے جو جزیرۃ العرب کے معاشرہ میں پایا جارہا ہے۔

۹- الإسلام بین لا و نعم

یہ بھی کتابچہ ہے جس میں اسلام سے متعلق اور اسلام سے غیر متعلق چیزوں کا ذکر کر کے صحیح اور مثالی اسلامی معاشرہ کی تشکیل کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔

۱۰- ندوۃ العلماء – تواجه التحدی الکبیر

ندوۃ العلماء کے پچاسی سالہ جشن تعلیمی کے موقع پر یہ رسالہ دفتر اجلاس نے شائع کیا تھا، جس میں عصری مسائل میں ندوۃ العلماء کے کردار کو بیان کیا گیا ہے۔

۱۱- صور و أوضاع

غیر مطبوعہ ہے، البعث الاسلامی کے ان مقالات کا مجموعہ ہے جو اس عنوان کے تحت حالات حاضرہ اور واقعات عالم پر فکر خیالات وتعلیقات کے طور پر لکھے گئے۔

عربی ترجمے

۱- بین الصورۃ والحقیقة

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے لکھنؤ میں جماعت تبلیغ کے ایک پروگرام میں ۱۹۴۹ء میں "صورت وحقیقت" کے عنوان سے تقریر فرمائی تھی، اس وقت مولانا محمد الحسنی کی عمر صرف ۱۴ رسال تھی، انھوں نے اس کو عربی میں پیش کیا، تو اصل اور ترجمہ کا کوئی فرق نہیں محسوس کیا گیا، ۱۹۵۰ء میں مکتبۂ اسلام لکھنؤ نے اسے شائع کیا تھا، بعد میں بھی شائع ہوتا رہا اور عالم عربی میں بہت مقبول ہوا۔

۲- فضل البعثة المحمدیة علی الإنسانیة ومنهجها العالمیة الخالدة

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے ۱۹۷۵ء میں لکھنؤ کے ایک بڑے

پروگرام ہال میں سیرت نبوی کے موضوع پر اردو میں ایک زبردست تقریر کی تھی، اس پروگرام میں مسلم وغیر مسلم دونوں شریک تھے، مولانا سید محمد الحسنی مرحوم نے اس کی معنویت واہمیت کے پیش نظر عربی میں منتقل کیا۔

۳- العالم الإسلامی بین التبعیة و الذاتیة

"الصراع بین الفکرۃ الاسلامیة و الفکرۃ الغربیة" کا اردو ترجمہ "اسلامیت ومغربیت کی کشمکش" ہے، مؤلف کتاب مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے خاتمة البحث یعنی کتاب کا آخری مضمون اردو میں تحریر کیا جس کا عربی ترجمہ مولانا سید محمد الحسنی سے کرنے کا تقاضہ کیا، یہ ترجمہ بھی ایسا فصیح ہے کہ کہیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ ایک ہی کتاب میں دوسرا قلم بھی شامل ہوگیا ہے۔

۴- شھداء بالاکوت یتکلمون

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی کتاب سیرت سید احمد شہید جلد دوم کا آخری مضمون ہے جسے انھوں نے اپنی عربی کتاب "إذا ھبت ریح الإیمان" میں شامل کرنے کی غرض سے مولانا سید محمد الحسنی سے عربی میں ترجمہ کرایا، جو اس کتاب کا شاہکار ہے۔

۵- مکانة الصلوٰۃ فی الإسلام

یہ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کی مقبول عام کتاب "فضائل نماز" کا عربی ترجمہ ہے، اسلوب بیان دلچسپ ہے، اور عالم عرب سے خراج تحسین وصول کر چکا ہے۔

اردو تصانیف

۱- سیرت مولانا محمد علی مونگیریؒ

بانی تحریک ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید محمد علی مونگیری کی سوانح حیات ہے، یہ

ندوۃ العلماء پر ایک قرض تھا جسے مولانا محمد الحسنی رحمۃ اللہ علیہ نے پورا کیا، چار سو صفحات پر مشتمل یہ کتاب ندوۃ العلماء کی تاریخ کے حصہ اول کی حیثیت رکھتی ہے، اسی کے ساتھ ہندوستان میں ملت اسلامیہ کی اصلاح، تبلیغی، دعوتی و تعلیمی تاریخ اور فتنوں کے مقابلہ کی تاریخ کا ایک باب بھی ہے، ۱۳۸۳ھ (۱۹۶۳ء) میں مکتبہ دارالعلوم ندوۃ العلماء سے شائع ہوئی، مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی جو خود اس موضوع پر قلم اٹھانے کا ارادہ رکھتے تھے اور منصوبہ تیار کر چکے تھے، مصنف کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ایک روز اچانک معلوم ہوا کہ محمد میاں بغیر کسی کو بتلائے اپنے شوق سے یہ کام شروع کر چکے ہیں، اور ان کی بڑی تمنا ہے کہ یہ کام ان کے ہاتھوں انجام پائے، ...... یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ اس کام کو خالص اپنی سعادت سمجھ کر انجام دے رہے ہیں، اور ان تمام آداب کو ملحوظ رکھتے ہیں جو اہل اللہ اور برگزیدہ اصحاب کی سوانح اور سیرت کی تصنیف و ترتیب میں ملحوظ رکھنے چاہئے، کتاب میرے تصور و توقع سے بلند نکلی، مجھے آج بھی اس میں بہت شبہ ہے کہ میں اس کو اتنے اچھے طریقہ پر لکھ سکتا اور اس کے حقوق سے عہدہ برآ ہو سکتا تھا، کتاب میں متانت، تحریر میں توازن اور اسی کے ساتھ ادبیت و تاثیر ہے، اور وہ سیر سوانح کی ان شرائط کو پورا کرتی ہے جو ایک جامع کمالات ہستی اور ایک عہد آفریں تحریک کے بانی کی سوانح کے لیے ضروری ہیں۔'' (۱)

۲- تذکرہ حضرت سید شاہ علم اللہ حسنی رائے بریلوی

حضرت سید احمد شہید کے جد اعلیٰ اور عہد عالمگیری کے ممتاز شیخ اور حضرت سید

---

(۱) تعمیر حیات محمد الحسنی نمبر/۱۵۷

آدم بنوریؒ کے نامور خلیفہ عارف باللہ حضرت سید شاہ علم اللہ حسنی کا تذکرہ اوران کے ممتاز خلفاء اور عالی مرتبت فرزندوں اور احفاد کے حالات زندگی پر مشتمل یہ کتاب ۱۹۷۰ء میں لکھی، جسے مکتبہ اسلام لکھنؤ نے شائع کیا، پھر مجلس نشریات اسلام کراچی سے طبع ہوئی اوراب اس کا نیا ایڈیشن سید احمد شہید اکاڈمی دارعرفات رائے بریلی سے شائع ہوا ہے، مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی مقدمہ میں کتاب کی خصوصیت، ضرورت اوراہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> ''یہ کتاب ایک طرف جامع، دوسری طرف عصر حاضر کے ذوق و اسلوب کے مطابق ہوگئی (ہے)، جس سے ہم اس دور فتن میں جس میں نہ صرف بدعات کا دوردورہ ہے بلکہ لادینیت، وحدت ادیان اور کفر وایمان کی مساوات اور ہر قسم کے حدود و قیود و تعینات کے انکار، نیز خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہادیٔ سبل، ختم الرسل اورامام الکل ہونے کے انکار کا رجحان ایک دعوت اور ایک فلسفہ اختیار کرتا جارہا ہے، ایک ایسے زمانہ میں ایک ایسی شخصیت کی سیرت یقیناً مفید و مؤثر ہوگی، جس کا اس حقیقت پر ایمان واذعان تھا، اور جو ساری عمر اسی کے اعلان میں مصروف رہی کہ:
>
> محمد عربی کا بروئے ہر دوسرا ست
> کسے کہ خاک درش نیست خاک بر سر او

۳- روداد چمن

ندوۃ العلماء کے ۸۵ سالہ جشن تعلیمی (۳۱/اکتوبر و یکم و ۲، ۳/نومبر ۱۹۷۵ء منعقدہ دارالعلوم ندوۃ العلماء) کی مفصل روداد ہے جسے مصنف نے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی ناظم ندوۃ العلماء کے ایماء پر مرتب کیا، اس کو پڑھنے والا

محسوس کرتا ہے گویا وہ خود جشن میں موجود ہے، اور ایک ایک چیز کا خود مشاہدہ کرتا جا رہا ہے، مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی لکھتے ہیں:

''انھوں نے روداد مرتب کی اور گویا الفاظ میں ریکارڈنگ کا کام اس طرح کیا کہ پڑھنے والے کو دل کی دھڑکنیں، ذہن کے اندیشے، انبساط کی کیفیت اور سانس کی آواز بھی سنائی دے، ......آج بھی کتاب موجود ہے، اور اس میں مصنف کے قلم کی مصوری کا کمال دیکھا جا سکتا ہے۔'' (۱)

حکیم عبدالقوی دریابادی مدیر صدق جدید لکھتے ہیں:

''جشن ندوۃ العلماء کی تفصیلی روداد کے سمندر کو ''روداد چمن'' کے کوزہ میں بند کیا۔ ان کی اس تصنیف پر مرحوم مدیر ''صدق جدید'' مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنی علالت کے آخری زمانہ میں تبصرہ کرتے ہوئے مرتب کو جو داد دی تھی وہ ان کے سے تنقید نگار قلم سے بہت کم نوعمر اہل قلم کو ملی ہوگی، یہ آخری مکمل تبصرہ تھا جو مولانا مرحوم کے قلم سے صدق جدید (اشاعت ۲۲/اکتوبر ۱۹۷۶ء) میں نکلا تھا، جس میں کتاب کو بہت ہی جید و بلیغ اور بہت ہی مؤثر قرار دینے کے بعد آخری فقرہ یہ بھی لکھا گیا تھا:

''لکھنے والے کے قلم کا اعجاز یہ ہے کہ کتاب لٹریچر تو خیر ہے ہی، باقی کتاب کے جو اجزاء پروپیگنڈے کے ہیں ان پر بھی گمان لٹریچر کا ہوتا ہے۔'' (۲)

مصنف نے کتاب کی تصنیف و ترتیب میں معاون لوگوں کا خصوصیت سے

---

(۱) تعمیر حیات محمد الحسنی نمبر/ ۱۵۸

(۲) تعمیر حیات محمد الحسنی نمبر/ ۲۲۴

تذکرہ کیا ہے اور ان کے تعاون کو سراہا ہے، شکر واعتراف کے آخری جملے یہ ہیں:

"کتاب کی تصحیح اور مسودہ سے مراجعت کے لیے خواہرزادۂ عزیز سید احمد حسنی ندوی (متعلم طبیہ کالج علی گڑھ) نے اپنا پورا وقت دیا، اور ان کی وجہ سے اس کام میں بڑی سہولت ہوئی، مرتب ان کا اور ان تمام حضرات کا جنھوں نے کسی نہ کسی حیثیت سے اس میں تعاون کیا تہ دل سے شکر گزار ہے، جہاں تک ناظم ندوۃ العلماء کا تعلق ہے چمنستان ندوہ کا یہ حقیر تحفہ ان کی خدمت میں اس شعر کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے ؎

بگیر ایں ہمہ سرمایۂ بہار از من
کہ گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند(۱)

کتاب ۲۹۲ صفحات پر مشتمل صرف روداد چمن ہی نہیں ہے، ایک علمی دینی مرقع اور فکری و اصلاحی دستاویز بھی ہے، داعی اجلاس مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی اور صدر اجلاس شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود تھے۔

۴- پیام ندوۃ العلماء

تحریک ندوۃ العلماء کا جامع و مختصر تعارف اور اس کے دارالعلوم کا منہج، مقاصد و طریقہ کار بھی کچھ بہت خوش اسلوبی سے آگیا ہے، ندوۃ العلماء کے کام اور پیام سے متعلق بڑی جامع کتاب ہے، مولانا شمس تبریز صاحب لکھتے ہیں:

"ندوۃ العلماء جیسی بڑی تحریک کے آثار وافکار کو چند صفحات میں سمیٹنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔"(۲)

مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھتے ہیں:

---

(۱) روداد چمن/۲۹۲

(۲) تعمیر حیات محمد الحسنی نمبر/۲۲۴

''اس کتاب میں ندوۃ العلماء کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر کھل کر سامنے آگیا ہے، وہ اس عظیم الشان اسلامی ادارے کو کس شکل میں دیکھنا چاہتے تھے، اور کس انداز کے علماء کی جماعت کے وہ متمنی تھے، اور اس سلسلہ میں ان کے کیا مشورے تھے۔''(۱)

۵-سوانح حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

یہ کتاب زیر تالیف تھی کہ مؤلف کا اچانک سانحۂ وفات پیش آگیا، خاکہ تیار کر چکے تھے، ابتدائی اوراق تحریر بھی کر چکے تھے، مولانا محمد منصور نعمانی ندوی لکھتے ہیں:

''محمد میاں عرصہ سے مولانا مدنی کی سوانح حیات مرتب کر رہے تھے اور اس سلسلہ میں کافی مواد بھی فراہم کر چکے تھے، کتاب ابھی نصف ہی ہو پائی تھی کہ پیام اجل آپہنچا اور یہ کتاب تشنہ رہ گئی۔''(۲)

قرآن آپ سے مخاطب ہے

مولانا سید محمد الحسنیؒ کی یہ کتاب ان کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو خواتین کے رسالہ ماہنامہ ''رضوان'' لکھنؤ میں شائع ہوتے رہے تھے۔ آسان زبان، سادہ انداز میں لکھے گئے یہ مضامین قرآن مجید کی کسی ایک آیت کو موضوع بنا کر اور بعض چھوٹی سورتوں کو موضوع بنا کر لکھے گئے تھے۔ یہ کتاب سید احمد شہید اکیڈمی دار عرفات رائے بریلی سے شائع ہوئی ہے۔

جادۂ فکر و عمل

پیش نظر کتاب تعمیر حیات (ندوۃ العلماء) لکھنؤ، کے وہ اداریے ہیں جن

---

(۱) تعمیر حیات محمد الحسنی نمبر/۲۲۴ (۲) ایضا

میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے فکر وعمل کی راہیں کھولی ہیں، اور زمانہ کے فتنوں کو بے نقاب کر کے ان سے اپنا دامن بچانے کی تدبیریں بیان فرمائی ہیں۔ یہ کتاب بھی سید احمد شہید اکیڈمی اور دار عرفات رائے بریلی سے شائع ہوئی ہے۔

مرتب کردہ کتابیں

۱-پا جا سراغ زندگی

یہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی ان تقریروں وخطبات کا مجموعہ جو انھوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں اور دارالعلوم دیوبند میں طلبہ کے سامنے دیئے، سب سے پہلے طلبائے بھٹکل نے شائع کیا اور اب مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ سے شائع ہورہا ہے، مقبول ترین کتابوں میں ایک ہے، اور مولانا سید محمد الحسنیؒ کے مقدمہ کے ساتھ ہے۔

۲-حدیث پاکستان

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے ۱۹۷۸ء میں پاکستان کے دورہ کے موقع پر مدراس، یونیورسٹیوں اور دوسرے ثقافتی وتعلیمی اداروں میں دیئے گئے خطبات کا مجموعہ ہے، یہ بھی مولانا سید محمد الحسنیؒ کا مرتب کردہ ہے، ان کی افادیت پر وہ اپنے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

> ''پیش نظر مجموعہ ان اہم تقریروں پر مشتمل ہے جو عم مخدوم ومعظم مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے حالیہ دورۂ پاکستان کے موقع پر کی گئیں، اور جنھوں نے دماغ کو بھی جھنجھوڑا اور دل کے تاروں کو بھی چھیڑا، اور ملک وملت کے مسائل میں ازسرنو سوچنے اور عمل کرنے کی ایک تحریک پیدا کردی۔''

اردو تراجم

۱- نبی رحمتؐ

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی سیرت نبوی پر معرکۃ الآراء کتاب "السیرة النبویة" (عربی) کا ترجمہ ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کتاب اردو میں ہی لکھی گئی ہے، مترجم نے ترجمہ کرنے میں غیر معمولی اہتمام کیا اور آداب کا لحاظ رکھا، مصنف، مترجم کا شکریہ ادا کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''مصنف کی دوسری اہم تصنیفات ومضامین کی طرح عربی سے اردو میں کتاب کے ترجمہ کی خدمت مصنف کے برادرزادۂ عزیز سید محمد الحسنی سلمہٗ مدیر البعث الاسلامی نے اپنی ایک بڑی سعادت سمجھ کر انجام دی، اس کام کے لیے وہ ہر طرح سے موزوں اور اس کے لیے وہ دل وجان سے حاضر تھے۔'' (۱)

دیباچہ طبع دوم میں مزید اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عربی سے اردو میں ترجمہ کی خدمت مصنف کے لخت جگر اور قرۃ عین برادرزادۂ عزیز سید محمد الحسنی مدیر ''البعث الاسلامی'' نے بڑے شوق اور پورے آداب کے ساتھ انجام دی، یہ ان کے ترجمہ کے سلسلہ کی آخری کڑی تھی، اس کی طباعت کے بعد وہ زیادہ دن اس دنیا میں نہیں رہے، اور ان پر ہندوستان میں سیرت نبویؐ کے مصنف عظیم علامہ شبلی نعمانی کا یہ شعر صادق آتا ہے ؎

مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتم
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

---

(۱) نبی رحمت/۴۴

۲-ارکان اربعہ

اسلام کے ارکان اربعہ (نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج) کے اسرار و مقاصد کے بیان، ان کے فوائد و ثمرات کی تشریح، ان کے نتائج واثرات کے جائزہ اور دوسرے مذاہب کے ساتھ تقابلی مطالعہ پر عدیم النظیر کتاب جس کے مصنف حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی ہیں، اور اردو مترجم ان کے ہی بھتیجے مولانا سید محمد الحسنی مرحوم ہیں، مصنف مترجم کو دادِ تحسین دیتے ہوئے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

> ''اردو ترجمہ کی خدمت مصنف اپنے عزیز برادر زاہ مولوی محمد الحسنی مدیر البعث الاسلامی کے سپرد کی جن کو مصنف کے طرز تحریر اور ذوق وفکر سے خدادا مناسبت ہے اور ایک عرصہ سے اس کے عربی مضامین و تحریروں کا ترجمہ کرتے رہے ہیں، انھوں نے حسب توقع یہ فرض بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا۔'' (۱)

کتاب ۳۶۰ صفحات پر مشتمل ہے، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ سے شائع ہوئی ہے۔

۳-معرکۂ ایمان ومادیت

مصنف کتاب حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی لکھتے ہیں:

> ''پیش نظر کتاب ''معرکۂ ایمان و مادیت'' راقم سطور کی عربی کتاب ''الصراع بین الایمان و المادیة'' کا اردو ترجمہ ہے، یہ کتاب ۱۳۹۰ھ/۱۹۷۱ء میں دار القلم کویت کی طرف سے شائع ہوئی، ترجمہ کی خدمت مصنف کی اکثر عربی کتابوں کی طرح اس کے برادر زادۂ عزیز مولوی محمد الحسنی مدیر البعث الاسلامی نے انجام دی۔''

---

(۱) ارکان اربعہ/۱۸

یہ کتاب مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی اہم کتابوں میں شمار ہوتی ہے، اس میں سورۂ کہف کے مضامین بیان کیے گئے ہیں، اور عصر حاضر کے حالات سے ان کا کیا تعلق ہے اس کو بیان کیا گیا ہے، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ سے شائع ہوئی ہے۔

۴- تزکیہ واحسان یا تصوف وسلوک

یہ کتاب مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی کتاب "ربانية لا رهبانية" کا فصیح اردو ترجمہ ہے، مترجم کی وفات کے بعد مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ سے شائع ہوا، تصوف پر یہ ایک البیلی کتاب ہے جس میں اس کا غیر جانبدارانہ مطالعہ وجائزہ پیش کیا گیا ہے۔

۵- جب ایمان کی باد بہاری چلی

یہ بھی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی کتاب "إذا هبت ريح الإيمان" کا فصیح ترجمہ ہے، جس میں حضرت سید احمد شہیدؒ کی خدمات اور ان کے جہاد وتبلیغ وتربیت کے کاموں پر روشنی ڈالی گئی اور اس کے حیرت انگیز ثمرات ونتائج کو بیان کیا گیا، جو واقعات کی شکل میں ہے، پہلے "جب ایمان کی بہار آئی" کے عنوان سے شائع ہوئی تھی، مکتبہ فردوس مکارم نگر لکھنؤ ناشر ہے۔

۶- کاروان مدینہ

یہ کتاب حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی کتاب "الطريق إلى المدينة" کا شگفتہ اور رواں ترجمہ ہے، ترجمہ کے لفظ لفظ سے ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت وعقیدت عیاں ہے، بعض مضامین کا ترجمہ خود مصنف کے قلم سے ہے۔

۷- عالم عربی کا المیہ- تحلیل وتجزیہ، جائزہ ومحاسبہ

بیت المقدس اور عالم عربی سے متعلق فکر انگیز ولولہ خیز مضامین مقالات جسے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے مختلف موقعوں اور مناسبتوں پر سپرد قلم کیے

تھے اور جو ممتاز عربی مجلات میں شائع ہوئے، ان کا یہ مجموعہ ہے جو "المسلمون وقضية فلسطين" کے نام سے کتابی شکل میں منظر عام پر آیا، اردو ایڈیشن ''عالم عربی کا المیہ'' مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ سے شائع ہوئے، اکثر مضامین کا ترجمہ مولانا سید محمد الحسنیؒ اور مولانا نور عظیم ندوی مرحوم، کے قلم سے ہے، ذیلی عناوین مولانا اسحاق جلیس ندویؒ کے قائم کردہ ہیں، مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے مولانا محمد الحسنی اور مولانا اسحاق جلیس ندوی کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''اس وقت جب یہ آخری سطریں سپرد قلم کی جارہی ہیں بے اختیار اپنے ان دو عزیز رفیقوں کی یاد قلم کی عناں گیر ہے جن کا اس کتاب کے ترجمہ، اس کی ترتیب وتزئین میں خاص حصہ تھا، اور جن کا نام اس کتاب میں بار بار آیا ہے، ایک برادر زادہ عزیز سید محمد الحسنی مدیر رسالہ البعث الاسلامی، دوسرے رفیق ومعاون عزیز مولوی اسحاق جلیس ندوی مرحوم مدیر تعمیر حیات جو جون و جولائی ۱۹۷۹ء میں چند دن کے فرق کے ساتھ داغ مفارقت دے گئے، اور جو مصنف کے تحریری، دعوتی اور تنظیمی کاموں میں دست وبازو کا کام دیتے تھے۔''(۱)

۸- تحقیق وانصاف کی عدالت میں ایک مظلوم مصلح کا مقدمہ

حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک اصلاح و جہاد پر جامع ومختصر رسالہ ہے جو عربی میں "الامام الذی لم یوف حقه من الانصاف والاعتراف" کے نام سے مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے لکھا جو ہزاروں کی تعداد میں دارالاعتصام قاہرہ سے شائع ہوا، جس کا طاقتور اردو ترجمہ مصنف کی خواہش پر مولانا سید محمد الحسنیؒ نے کیا، مصنف لکھتے ہیں:

---

(۱) دیباچہ طبع دوم/۴

''انھوں نے حسب معمول بڑی خوبی اور روانی کے ساتھ اس کے ترجمہ کا فرض انجام دیا۔''(۱)

۹-طوفان سے ساحل تک

یہ مولانا سید محمد الحسنی (محمد میاں) کا کسی کتاب کا باقاعدہ پہلا ترجمہ ہے، اس سے پہلے چند رسائل کے ترجمے کیے تھے، اور وہ بھی عربی میں، یہ نومسلم (سابق لیوپولڈ ویس) محمد اسد صاحب کی انگریزی کتاب ''روڈ ٹو مکہ'' Road to Mecca کا ترجمہ ہے، قارئین کا تأثر یہ ہے کہ یہ ترجمہ اتنا سلیس رواں ہے کہ اصل کا گمان ہوتا ہے، یہ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ سے ۱۳۸۰ھ میں شائع ہوا، اور اس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں، مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی اس کے متعلق لکھتے ہیں:

''مشہور صاحب علم جرمن مسلمان لیوپولڈ ویس محمد اسد کی کتاب ''روڈ ٹو مکہ'' Road to Mecca کا ترجمہ ''طوفان سے ساحل تک'' کے نام سے ایسا رواں اور شستہ کیا کہ اہل زبان عش عش کرنے لگے۔''(۲)

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی لکھتے ہیں:

''کتاب پڑھنے کے بعد کوئی انصاف پسند قاری ترجمہ کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا، کہیں سے اس میں ترجمہ پن کی بو نہیں آتی، معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کے قلم سے براہ راست یہ کتاب اردو میں نکلی ہے، خدا کا شکر ہے کہ یہ ترجمہ ان کے والد ماجد کی زندگی ہی میں شائع ہو گیا، اور انھوں نے اپنے لائق اور ہونہار فرزند کی تحریری قابلیت اور ترجمہ کا کمال دیکھ لیا۔''(۳)

---

(۱) کتاب ہذا/۷ (۲) تعمیر حیات محمد الحسنی نمبر/۱۷۸ (۳) ایضا/۱۵۶

باب ہشتم

امتیاز وخصوصیات، اوصاف وکمالات

تزکیہ

مولانا محمد منظور صاحب نعمانیؒ لکھتے ہیں:

''عزیز مرحوم مولانا محمد میاں کو اللہ تعالیٰ نے جس طرح اپنے خاص فضل سے غیر عادی طریقہ پر وہ علمی وقلمی کمال عطا فرمایا تھا، جس کا ذکر اوپر کیا گیا، اسی طرح بلکہ اس سے بڑا فضل وانعام ان پر ان کے رب کریم نے فرمایا کہ جس تزکیۂ نفس اور اصلاح اخلاق کے لیے طالبین صادقین برسوں اصحاب ارشاد ومشائخ کی تربیت میں رہتے اور ریاضتیں کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے یہ بے بہا دولت بھی ان کو اپنے فضل خاص ہی سے عطا فرمادی تھی، معلوم ہوتا تھا کہ کبر، غصہ، حسد، کینہ، بخل جیسے رذائل ان کی فطرت سے نکال دیئے گئے ہیں، اور محاسن اخلاق بھرپور عطا فرمادیئے گئے ہیں، ذٰلِكَ فَضۡلُ اللّٰهِ يُؤۡتِيۡهِ مَنۡ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُوۡا الۡفَضۡلِ الۡعَظِيۡمِ. (۱)

---

(۱) تعمیر حیات محمد الحسنی نمبر/۱۷۴

حسن اخلاق

مولانا عبدالسلام قدوائی ندویؒ لکھتے ہیں:

''علم وادب میں اس کمال کے ساتھ وہ تہذیب وشائستگی اور شرافت ومتانت کا بھی بہترین نمونہ تھے، خوردوں کے ساتھ شفقت ومحبت سے پیش آتے، دوستوں کی دل داری ودل نوازی کی کوشش کرتے، بزرگوں کی تعظیم وتوقیر کا ہمہ وقت خیال رکھتے اور ہم نشینوں کی خوشنودی کی فکر کرتے، اجنبی آدمی سے بھی ملاقات ہوتی تو مسکراتے ہوئے ملتے، ان کے چہرے کی بشاشت اور خندہ جبینی ان کی لطافت طبع اور پاکیزگی قلب کی ترجمان تھی۔''(۱)

تواضع

مولانا مفتی سید سیاح الدین کا کاخیل (رکن اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان) لکھتے ہیں:

''دردمند دل کے جذبات واحساسات کو بہترین مؤثر ودل پذیر انداز بیان کے ساتھ فصیح وسلیس عربی میں عربوں کو پیش کرنے والا حقیقی اسلامی ادیب......

اکثر اہل کمال وقلم کو دیکھا گیا کہ یہ کمال ان میں کچھ نہ کچھ غرور ونخوت کا عنصر پیدا کردیتا ہے (الا ماشاء اللہ) مگر اس وقت تک میری ملاقات صرف دو شخصوں سے ہوئی ہے جو شاخ ثمر ور کی طرح جھکے رہتے تھے، اور فضائل وکمالات کی فروانی نے ان کے تواضع میں اور اضافہ کردیا تھا، ایک عبدالحمید صدیقی مرحوم مقالہ

---

(۱) تعمیر حیات محمد الحسنی نمبر/۱۷۸

نگار ترجمان القرآن اور دوسرے عزیز مرحوم محمد الحسنی رحمۃ اللہ تعالیٰ۔"(۱)

حمیت وغیرت

مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندویؒ لکھتے ہیں:

"محمد میاں ایک جوان صالح، خداترس وخدامست مردمجاہد تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر غیر معمولی صلاحیتیں جمع کردی تھیں، اللہ کے دین کی حمیت ان کو وراثت میں ملی تھی، اسلام کی خدمت کا جذبہ اور غیرت حق ان کے رگ وریشہ میں سرایت کی ہوئی تھی، ان کا خمیر تعلق باللہ، تقویٰ اور انابت الی اللہ سے تیار ہوا، بقول مولانا عبدالماجد دریابادیؒ: اللہ نے ایسی پاک مٹی سے انھیں بنایا ہے جو تیمم کے لائق ہو۔"(۲)

معاملہ فہمی

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی لکھتے ہیں:

"محمد میاں اخلاق ومحبت میں اپنے تمام ہم عمروں میں ممتاز اور نمایاں تھے، کسی شخص سے ان کی کشمکش یا لڑائی نہ تھی، وہ اس طرح کے کسی امکان سے بہت دور تھے، اگر کسی وقت ایسی کوئی صورت پیدا ہونے لگتی تو اس سے بہت خوبی کے ساتھ بچنے کی تدبیر اختیار کرلیتے خواہ اس سلسلہ میں ان کو اپنے جائز فائدوں سے دست بردار ہونا پڑتا، بعض وقت ان کو اپنے جائز احساسات و جذبات کا خون کرنا پڑتا، یہ ان کی افتاد طبع تھی، دراصل وہ اس

---

(۱) تعمیر حیات محمد الحسنی نمبر/۱۸۱

(۲) تعمیر حیات محمد الحسنی نمبر/۲۰۵

کے قائل تھے کہ

آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است
با دوستاں تلطف با دشمناں مدارات (۱)

محبوبیت

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ لکھتے ہیں:

''غریبوں، حاجت مندوں کی مدد وہ اخفاء کے ساتھ کرتے رہتے حتی کہ متعدد ضرورت مندوں کی ان سے غیر محسوس طریقہ پر وابستگی ہوگئی تھی، اعزا کے ساتھ ان کا معاملہ اسلام کے صلہ رحمی کی تعلیمات کے مطابق تھا، اور یہ بات انھوں نے اپنے والد اور دادا سے ورثہ میں پائی تھی، اور خود ان کے عم معظم کا طرز عمل ان کے لیے نمونہ تھا، اپنے چھوٹوں کے ساتھ ایسا خاطر وشفقت کا تعلق رکھتے جس میں بے تکلفی اور خوش طبعی کا رنگ چھایا رہتا اور اپنے بڑوں کے ساتھ خواہ وہ ان سے دو چار سال ہی بڑے ہوں محبت واحترام کا رویہ رکھتے تھے، یہ احترام خشک احترام نہ ہوتا بلکہ اس میں انس وانبساط کی آمیزش ہوتی، چنانچہ خاندان کے چھوٹے و بڑے سب ان سے خصوصی انس ومحبت ولحاظ کا معاملہ رکھتے تھے۔'' (۲)

اخلاص وتقویٰ

مولانا عبدالماجد ندوی مرحوم لکھتے ہیں:

''ہم عصروں اور برابری والوں کے ساتھ نہ بغض وحسد، نہ کینہ و

---

(۱) تعمیر حیات محمد الحسنی نمبر/۲۱۳

(۲) ایضاً/۲۱۳

عداوت، نہ رشک ومنافست، نہ برتری کا احساس اور نہ احساس کہتری کا شکار، وہ اپنے دوستوں میں ایک اعجوبہ روزگار تھے، نہ کسی کی غیبت، نہ کسی کی چغلی، نہ افترا پردازی، نہ دشنام طرازی، سب کے ساتھ اخلاص ومحبت سے پیش آنے والے، بڑوں کی توقیر اور چھوٹوں سے شفقت کرنے والے، نہ بحث وتکرار کے عادی تھے، نہ جنگ وجدال کے خوگر، وہ تو سب سے میٹھی باتیں کرتے تھے، ایک پیکر اخلاق اور مجسمہ اخلاص تھے۔" (۱)

ایمانی فراست

مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی لکھتے ہیں:

"جب بھی عالم اسلام کے کسی گوشہ میں کوئی آزر و مانی، کوئی فرعون ونمرود، کوئی مسیلمہ کذاب، کوئی چنگیز و ہلاکو، کوئی ہٹلر و مسولینی، کوئی لینن واسٹالن نمودار ہوا یا کوئی غلط تحریک ودعوت ظاہر ہوئی تو بلا تاخیر مولانا کے قلم کا سیل رواں جوش میں آیا اور پوری قوت کے ساتھ اس کو کچلنے اور حقیقت آشکارا کرنے کی کوشش کی، وہ قلم کو ایک مقدس امانت سمجھتے تھے اور اس کو بہت ہی احتیاط کے ساتھ دعوت حق اور فکر اسلامی کی ترویج واشاعت میں اور باطل کی سرکوبی اور اس کو پسپا کرنے میں صرف کرتے تھے، ان کا قلم عربی اور اردو دونوں زبانوں میں یکساں مہارت رکھتا تھا، اور وہ اپنی اس صلاحیت کو بروئے کار لانے میں کوئی پس و پیش کبھی نہیں کرتے تھے۔" (۲)

---

(۱) تعمیر حیات محمد الحسنی نمبر/۲۱۹

(۲) تعمیر حیات محمد الحسنی نمبر/۲۳۸

ہمدردی وخیر خواہی

مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی مدظلہ لکھتے ہیں:

”محمد میاں اپنے اہل وعیال اور ہر تعلق والے کے ساتھ بڑے خلوص ومحبت سے پیش آتے، ان کی ہمت افزائی کرتے، خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار اوران کی آبیاری کرتے، ہر ایک کے مسائل سے دلچسپی لیتے اور صبر ودلچسپی سے اس کی گفتگو سنتے اور مشورہ دیتے اوراگر کسی تعاون کی ضرورت ہوتی تو پورا تعاون کرتے، ان کے حوصلے بلند کرتے، اس میں اس کی رہنمائی کرتے، صلاحیتوں کو ابھارتے، اور کام کرنے کے میدان اس کے لیے تلاش کرتے، یہی سبب ہے کہ سب کے نزدیک وہ قول وعمل کی جامعیت، دل کی نورانیت، عقل ودانش کی روشنی اور بصیرت کی تابانی کی جیتی جاگتی مثال بن گئے، اس کے ساتھ ساتھ اپنے کام میں پورا انہماک واستغراق تھا، اور لایعنی باتوں سے احتراز و اجتناب، مشورہ اور مسائل کو حل کرتے وقت ان کا رویہ ہمیشہ مثبت ہوتا، سلبی تصور اور مداخلت سے ان کو مناسبت نہیں تھی۔“(۱)

دل سوزی اور بیباکی

ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی مرحوم لکھتے ہیں:

”ان کی عبقریت میں دراصل اسلام کے احیاء وتجدید کی روح کارفرما تھی، جو کسی ملک تک محدود نہیں رہنا چاہتی تھی، ان میں اپنے اسلاف کا وہ جوہر سمٹ آیا تھا جو دعوت وجہاد کا مرکب تھا،

---

(۱) تعمیر حیات محمد الحسنی نمبر/۲۴۶

وہ پوری زندگی سرحد اسلام کے محافظ اور نگراں کا رول ادا کرتے رہے، تلوار کا کام قلم کی نوک سے لیا، اور خون جگر کی روشنائی پوری بے جگری اور دل سوزی سے اس راہ میں صرف کرتے رہے۔

"خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر"

کا وہ حقیقتاً مصداق تھے، ناصری فتنہ جس نے آندھی طوفان کی طرح پورے عالم اسلام کی اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، دانشوروں کے قلم، پریس وصحافت سب خس وخاشاک کی طرح اس طوفان میں بے بسی کا شکار تھے، بڑے بڑے سورماؤں نے گوشۂ عافیت ہی کو غنیمت سمجھا تھا، شیر دل جیلوں میں تھے یا تختہ دار پر جاچکے تھے، لیکن خدا کے اس بندے نے اس طوفان کا رُخ پھیرنے میں اہم رول ادا کیا۔

...... یہ قلم پوری طرح بیدار رہا، اور کسی وقت آنکھ نہیں جھپکائی، پوری بے سروسامانی اور محدود ترین وسائل کے ساتھ وہ پورے عالم اسلام کے صاحب ضمیر صاحب ایمان علماء اور دانشوروں کی طرف سے یہ فرض کفایہ انجام دیتے رہے، لیکن اس نوجوان نے اپنی اس خدمت کا کوئی صلہ طلب نہیں کیا، کیسی ممبری، کیسا اعزاز اس کے دل میں اس کا خیال تک نہیں گزرا۔" (۱)

شرافت ومروّت

مولانا اسحٰق جلیس ندوی مرحوم لکھتے ہیں:

"ان کی زندگی کا وہ نمایاں پہلو جسے دیکھنے کا ہر شخص کو موقع نہیں ملا، وہ تھی ان کی شرافت ومروّت، اخلاق وتواضع، خندہ جبینی اور

---

(۱) تعمیر حیات محمد الحسنی نمبر/۲۵۵

شیریں گفتاری اور خودنمائی و نام نمود سے پرہیز، آج کی دنیا میں انسانی واخلاقی قدروں کے زوال کا عمل جس تیزی سے جاری ہے، اس میں کسی مرد بزرگ کا چراغ لیے ''انسانم آرزو ست'' کی صدا لگانا تعجب خیز نہیں ہوسکتا، ایسے دور میں ایسے تلاطم خیز دھارے میں ان کا دامن کسی کے شکوہ وشکایت، کسی کی اذیت و حق تلفی، کسی کی گرانی، اور انقباض سے آلودہ نہیں ہوا، وہ ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملتے، ہر شخص کے بہی خواہ اور خیر خواہ بن جاتے، ہر ایک کی ترقی اور اس کی صلاحیت کو مفید سے مفید تر بنانے کی کوشش کرتے، انھوں نے ہماری مختصر سی جماعت میں اپنے رکھ رکھاؤ، متانت وسنجیدگی، اور خلوص ومحبت سے ایسا اعتماد حاصل کرلیا تھا کہ کسی کو ان کے سامنے اپنے دل کی بات کہنے اور ذہن کا بوجھ ہلکا کرنے میں تکلف نہ ہوتا، محمد الحسنی بھلائے نہیں جاسکتے، اس لیے کہ وہ بحیثیت انسان اتنے عظیم اور بلند تھے کہ ان کی بلندی تک جھانکنا ہم جیسوں کو دشوار تھا۔'' (۱)

---

(۱) تعمیر حیات محمد الحسنی نمبر/۲۵۵

ایک منظوم تأثر☆

وہ جگر گوشۂ اہل فضل و کمال — عندلیب چمن قوم کے نو نہال
بازوئے بوالحسن جان عبدالعلی — نازش خاندان اپنی بہنوں کے لال
میرے محبوب بھائی محمد میاں — جن پہ قرباں مرے جان ودل جاہ ومال
نکتہ رس، خوش طبع، بردبار و حلیم — خندہ رو، خندہ لب، نیک دل، شیریں مقال
نیک خو، پاک رو، خوش دل وخوش نظر — خوش ادا، خوش نوا، خوش خیال وخصال
صاحب خیر، فیاض، مرد خدا — شیوۂ خاص تھا ان کا اخفائے حال
صحبت بد سے تا مرگ محفوظ تھے — نیک لوگوں سے ان کا رہا اتصال
ناز اہل قلم علم دیں کے چراغ — اپنے اسلاف کی ایک زندہ مثال
مثل دادا کے اپنے تھے مرد غیور — بے حقیقت تھا ان کی نگاہوں میں مال
اپنے والد کے مانند تھے صلح کل — وہ تھے نا آشنائے جدال و قتال
وہ تھے اپنے چچا کے قدم بر قدم — ایک سا تھا خیال ایک سے تھے خصال
فکر بھی ایک تھی، طرز بھی ایک تھا — ایک ہی تھا مزاج ایک ہی حال وقال
شہرہ ہر سو ہے ان کے مقالات کا — شرق ہو غرب ہو یا جنوب و شمال
وہ سوانح نگار محمد علی(۱) — جن کی عظمت کے قائل ہیں اہل کمال
جن کی تصنیف ہے ''روئیداد چمن'' — جس میں ہے جشن ندوہ(۲) کا حسن وجمال

(☆) مؤلف کتاب نے مولانا سید محمد الحسنی مرحوم سے متعلق اپنے دل فگار تأثرات واحساسات کو نظم کیا تھا جو تعمیر حیات نمبر میں بھی شائع ہوئے۔ (محمود)

(۱) حضرت مولانا محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ بانی ندوۃ العلماء

(۲) ندوۃ العلماء کا پچاسی سالہ جشن تعلیمی منعقدہ ۱۹۷۵ء

تذکرہ لکھ کے شاہ علم کا کیا
منکشف اہل ہمت مشائخؒ کا حال

ہے الإسلام الممتحن وہ کتاب
معترف جس کے ہیں اہل فضل وکمال

ہے کتاب ان کی طوفان سے ساحل تلک
ترجمہ روڈ ٹو مکہ کا ہے بے مثال

الإِمَامُ الَّذِیْ لَمْ یُوْفَ حَقُّہٗ
ترجمہ اس کا کرکے دکھایا کمال

نبی رحمتؐ بھی ہے شاہ کار قلم
جو کہ ہے مظہر عشق حضرت بلالؓ

ایسے اہل قلم نوجواں اب کہاں
دور ہے آج کا دور قحط الرجال

وہ محمد میاں نیک دل نوجواں
عمر پائی جنھوں نے چوالیس سال

نو بجے دن ہوا ان کو درد شکم
دی گئی ہر دوا کی گئی دیکھ بھال

شام تک جب نہ کچھ بھی افاقہ ہوا
ہو کے مجبور پھر وہ گئے اسپتال

گم ہوئیں سب کی عقلیں قضا آگئی
نو بجے شب کو وہ کر گئے انتقال

جان دی کرتے کرتے قلم کا جہاد
اک طرف تیغ حق اک طرف حق کی ڈھال

ان کی تعمیر ملت میں گزری حیات
انتقال ان کا ملت کا ہے انتقال

ان کا نقش قلم حق کی تلوار تھا
کانپتا تھا شکوہ کمال(۱) و جمال(۲)

ان کے جانے سے غم کی فضا چھا گئی
ہو رہا ہے ہر اک ان کے غم سے نڈھال

وہ جواں سال تھے نیک اعمال تھے
قابل رشک تھا ان کا ماضی و حال

اس جواں موت سے سب ہی غمناک ہیں
کیا عرب کیا عجم ہیں اسیر ملال

ہے کہاں وہ گہر اور کس حال میں
دیدۂ تر کا دل سے یہی ہے سوال

دیکھ کر دیدۂ تر کی بے چینیاں
اس سے بولا دل صاحب کشف وحال

میں بتاؤں تمھیں ہے کہاں وہ گہر
کس مکاں میں مکیں ہے وہ گوڈر کا لال

روضۂ شاہ علم میں وہ مدفون ہے
ہو رہا ہے خلف کا سلف سے وصال

جمع ہیں آج جس مرکز نور میں
مہر و بدر و کواکب نجوم و ہلال

---

(۱) مصطفیٰ کمال اتاترک (ترکی)
(۲) جمال عبدالناصر (مصر)

خوش ہوئے، خوش سے خوشتر ہوئے کر کے حل وہ فرشتوں نے آکر کیے جو سوال
ان سے رخصت ہوئے کہہ کے منکر نکیر نـم کنوم العروس اے حمیدہ خصال
روح سوئے جناں مست ہو کر چلی بولا رضوان پھر یـا حبیبـی تعـال
أدخـلـي جـنـتـي کی صدا گونج اٹھی ہوگئے داخل خلد ہو کر نہال
ان کو ایسی حسیں ایک جنت ملی ہے تصور سے بالا تر اس کا جمال
جـنـةٌ عــاليـــه عیشةٌ راضیـــه اور ان سے سوا نعمتیں بے مثال
جو مبارک تھیں اے مری چشم تر مغفرت ان کی کردی گئی بال بال
تاج سر پر وہ رکھے ہوئے نور کا چلتے پھرتے ہیں وہ کیف و مستی کی چال
سب کو جانا ہے دنیا سے اک دن ضرور فکر ہے فکر در اصل فکر مآل
کھو نہ جانا کبھی عیش دنیا میں تم لحظہ لحظہ رہے آخرت کا خیال
جانے والے سے ملنا ہے جس کو کبھی کیوں ہو وہ جانے والے کے غم میں نڈھال
جس کو جنت کے ملنے کی امید ہے قید دنیا میں رہنا ہے اس پر وبال
ہے دعا میری ہر دم یہ اللہ سے بخشے سب کو رضا بالقضا کا کمال
اہلیہ کو عطا کر تو صبر جمیل اپنی رحمت سے کر دور ان کا ملال
تیری مرضی پہ راضی رہیں تا حیات ان کے بھائی عزیز ان کے اہل و عیال
ان کے فرزند عبداللہ، عمار ہیں تیسرے خورد سال ان کے بیٹے بلال
یہ بنیں اپنے والد کے نعم الخلف علم دیں کا بنا ان کو بدر و ہلال
ہر قدم ہر نفس ان کا دل شاد ہو زندگی بھر رہیں نعمتوں سے نہال
ان کی بہنوں کو یا رب عطا کر سکوں دور سے دور کر ان کا رنج و ملال
ان کے عم مکرم(۱) کو دے زندگی عام سے عام کر ان کا فضل و کمال
ان سے پائیں ہدایت خواص و عوام مستفید ان سے ہو حلقۂ حال و قال

(۱) حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

بخش ان کو محمد کا نعم البدل　　توڑ دے جو قلم سے طلسم ضلال
ان کے بھانجوں کو یارب تو توفیق دے　　اپنے ماموں کے ہوں ہم قلم ہم خیال
رحمتیں کر محمد میاں پر مدام　　تو رحیم و کریم اور ہے ذو الجلال

کر عطا ان کو یا رب تو قرب و رضا
تو غفور و شکور اور ہے بَرّ و عال

باب نہم

منتخبات واقتباسات کے آئینہ میں☆

تصحیح نیت

''مسلمانو! نیت سرفہرست ہے نہ کہ فہرست کے آخر میں، اور جب صحیح نیت کی جائے تو اس کے پھل بھی صحیح ملتے ہیں، اگر چہ وہ مادہ پرستوں کی نگاہوں میں ناکام اور اسباب و وسائل پر اعتماد کرنے والوں کی نظروں میں شکست خوردہ ہو، قدامت پرست اور رجعیت پسند اور سائنس اور علم و ادب کے مبلغوں کی نظروں سے اوجھل ہو۔'' (۱)

تعلق مع اللہ اور اعتماد و یقین

''سارا قرآن و حدیث اعتماد و توکل کی اہمیت اور اس کی برکتوں اور اثرات کے ذکر اور اس کے خلاف کرنے پر وعیدوں سے بھرا ہوا ہے، اور اس پر اتنا زور دیا گیا ہے کہ توحید و رسالت کے بعد سب سے زیادہ اہمیت اسی کی معلوم ہوتی ہے۔

دوسری چیز تعلق مع اللہ ہے جو اس اعتماد کی ساتھ لازم و ملزوم ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ تعلق مع اللہ کے بغیر اعتماد علی اللہ کا حصول بھی ممکن نہیں

(☆) مرتبہ محمود حسن حسنی نواسہ مؤلف علیہ الرحمہ

(۱) تعمیر حیات محمد الحسنی نمبر/ ۲۶۸

جب تک خدا سے رشتہ درست نہ ہوگا، نیت ٹھیک نہ ہوگی، اعمال کا محاسبہ نہ ہوگا، خدا سے محبت وخشیت کا تعلق پیدا نہ ہوگا، اس وقت تک اس پر اعتماد اور اس کے وعدوں پر کلی یقین کیسے حاصل ہوسکتا ہے۔"(۱)

ایمان اور دعوت

"......ایمان نہ بیچا جاسکتا ہے، نہ خریدا جاسکتا ہے، نہ مول تول کیا جاسکتا ہے، اور نہ تلوار اور پستول کے ذریعہ زیر کیا جاسکتا ہے، نہ فلسفہ وسائنس کے ذریعہ اور نہ نام نہاد کلچر کے ذریعہ اور نہ اس کنگال زوال پذیر تاریک تہذیب کے ذریعہ اور نہ خیر سے مفقود اور ایمانی نعمت سے محروم معلومات کے ذریعہ جو انسانیت کے لیے وبال بنی ہوئی ہے، اور نہ علم وادب کے پروپیگنڈوں میں اور نہ ان انقلابوں وترقیوں میں جس میں اپنا ضمیر اور اپنی جان فروخت کردی گئی اور اپنے قلم وزبان کو مادی چیزوں اور چند درہموں کے بدلہ میں فروخت کردیا گیا اور خود ہی اس سے غیر راغب تھے۔"(۲)

قربانی

"دین دراصل قربانی کا نام ہے، اس کی ابتدا بھی قربانی ہے اور انتہا بھی، یہی چیز ہے جس کو "حفت الجنة بالمكاره وحفت النار بالشهوات" (جنت دشوار اور نفس پر شاق چیزوں سے گھیر دی گئی ہے اور دوزخ خواہشات نفس سے) سے تعبیر کیا گیا ہے، اس کو ایک جگہ "الدنيا سجن المؤمن وجنة الكافر" (دنیا مومن کے حق میں قید خانہ اور کافر کے حق میں جنت ہے) سے تعبیر کیا گیا ہے، اسی مضمون کو حدیث میں اس طرح بھی بیان کیا گیا ہے: "لا يؤمن أحدكم حتى يكون

---

(۱) رضوان محمد الحسنی نمبر/۵۷ (۲) تعمیر حیات نمبر/۲۹۸

ھواہ تبعا لما جئت بہ" (تم میں سے کوئی اس وقت تک سچا مومن نہ ہوگا جب تک اس کی خواہشات نفس میری لائی ہوئی تعلیمات کے ماتحت نہ ہوجائیں) غرض حدیث و قرآن دونوں اس قسم کے مضامین سے بھرے ہوئے ہیں، اور بطور تاکید بار بار اس کو دہرایا بھی گیا ہے تاکہ یہ حقیقت اچھی طرح دلوں اور ذہنوں میں راسخ ہوجائے۔"(۱)

احسان

"احسان کی سب سے بڑی شرط یہ ہے کہ اس کا صلہ جلد طلب نہ کیا جائے، بلکہ بہتر یہ ہے کہ صلہ کی آرزو ہی دل میں نہ رکھی جائے، اور استقامت واستقلال کا دامن کسی حال میں ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے، اس حال میں شکوہ وشکایت اور جلد مایوسی اور بار بار روش اور مسلک کی تبدیلی اور گھبرا گھبرا کر نئے نئے راستوں پر بادہ پیائی نہ صرف ممنوع بلکہ اس کے لیے بہت بدنمائی اور رسوائی کی بات ہے، اس سے اس بات کی غمازی ہوتی ہے کہ یہ صلاحیت ابھی اس فرد یا جماعت میں اچھی طرح پیدا نہیں ہوتی یا اس قدر محدود اور کمزور ہے کہ وقتی تأثرات اور جذبات پر بھی غالباً نہیں آسکتی اور اعصابی اتار چڑھاؤ کو بھی قابو میں نہیں رکھ سکتی، اس میدان میں محض صحیح راستہ پر ہونا کافی نہیں بلکہ اس راسہ پر پورا یقین بھی ہونا چاہیے۔"(۲)

اسلام کیا ہے؟

"اسلام کی روح اور اس کا پیغام یہ ہے کہ تم حالات کو بدلنے کے لیے دنیا میں بھیجے گئے ہو، حالات کے محور پر گردش کرنے کے لیے نہیں، لیکن

---

(۱) رضوان محمد الحسنی نمبر ۵۷ (۲) رضوان محمد الحسنی نمبر/۱۷۰

ع شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

اس کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں عبادت وتلاوت، معاملات و معاشرت، کسب ومعیشت، غرض کہ زندگی کے ہر موڑ اور ہر میدان میں خدا پر نگاہ رکھو، خدا سے اپنے معاملے درست رکھو، تمہاری زندگی میں کوئی جھول تمہاری معاشرے میں کوئی چیز خلاف اسلام اور تمہاری اسلامی وانسانی حقوق وتعلیمات میں خدا کی کوئی نافرمانی اور اس کے حکم کی پامالی نہ ہو۔" (۱)

سدایمانی

"اخلاقی پستی کے اس طوفان بلا خیز کے لئے جو پورے ملک اور معاشرے کو اپنے لپیٹ میں لے رہا ہے، کسی ڈیم کا خیال ہمارے دماغ میں نہیں آتا۔

نیل وفرات راوی وجہلم اور گنگا وجمنا کے محدود سیلابوں کے نقصانات اور تباہ کاریاں تسلیم لیکن بداخلاقی، کرپشن، بے حیائی وبدمستی اور دولت کی پوجا کا جو سیلاب آج ہر سوسائٹی میں (مسلم وغیر مسلم کی تفریق کے بغیر) گلے گلے بہہ رہا ہے۔

یہ اینٹ پتھر یا سیسہ اور فولاد کی کوئی سد سکندری نہیں، خدا کے خوف ، دوسری زندگی کے یقین، حیاء وغیرت، سچی انسانیت دوستی، ضمیر کا محاسبہ اور سچائی وحق پرستی کی وہ سدایمانی ہے، ان ڈیموں اور پشتوں سے کہیں زیادہ اہم ہے، جو پانی کے بچاؤ یا پانی کی حفاظت یا آب پاشی اور بجلی کے لئے قائم کئے جاتے ہیں اور ان پر کروروں اور اربوں روپیہ، دل ودماغ کا سب سے قیمتی سرمایہ اور انسانی کاوش کا بہترین نچوڑ آسانی سے صرف

(۱) رضوان محمد الحسنی نمبر/۱۷۰

کردیا جاتا ہے۔"(۱)

مکمل اعتماد

"مقصد خواہ کتنا ہی رفیع ہو، عقیدہ خواہ کتنا ہی مضبوط ہو، جذبہ چاہے جتنا بھی طاقتور ہو، اگر اس کے راستہ پر (جو اس مقصد کے حصول کے لئے ہم نے اختیار کیا ہے) ہم کو پورا بھروسہ نہیں ہے، ہم پورے اعتماد و یقین کے ساتھ اس کی دعوت نہیں دے رہیں ہیں، ہمارے لہجے میں وہ بے خوفی یا وہ استحکام نہیں ہے جو کسی مشاہدہ یا مشاہدہ کے درجہ والے یقین یا اپنے مسلسل تجربہ کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے تو ہماری یہ دعوت کبھی زیادہ وسعت اختیار نہیں کرسکتی۔

لیکن طریقۂ کار مسلک اور طرز فکر پر یہ یقین تعصب کی ہر شائبہ، انتہا پسندی، مبالغہ آرائی یا سخت گیری کے ہر اثر سے پاک ہونا چاہئے، اس کا رخ تعمیری ہونا چاہئے نہ کہ تخریبی، مثبت نہ کہ منفی، مصالحانہ نہ کہ جارحانہ، اجتماعیت کی روح کے ساتھ نہ کہ انفرادیت پسندی یا خود پسندی کے جذبہ کے ساتھ۔

اگر چلنے والوں کو اپنے راستہ کی سمت اور صحت کا یقین نہیں ہے تو اس کا سب سے پہلا نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ ان لوگوں کے نعروں اور ان تحریکوں اور دعوتوں کا شکار آسانی کے ساتھ ہو جائیں گے جو اپنی راہ و منزل پر نسبتاً زیادہ یقین رکھتی ہیں۔"(۲)

نفاذ شریعت

"ہم نفاذ شریعت میں صرف چور کا ہاتھ کاٹنے اور زانی کو سنگسار کرنے ہی

(۱) تعمیر حیات محمد الحسنی نمبر/۱۷۰ (۲) (۱) تعمیر حیات محمد الحسنی نمبر/۱۷۹

کا مطالبہ نہیں کرتے ہیں بلکہ اس کے اسباب ومحرکات کے سدباب کا بھی مطالبہ کرتے ہیں، شرعی قوانین کے نفاذ کا مطالبہ ہم حکمرانوں سے کرتے ہیں، عام راہ پر چلتے ہوئے آدمی اسے کرتے ہیں، نگہبان اور رعیت کے تمام گوشوں میں نفاذ شریعت کا مطالبہ کرتے ہیں اور زندگی کے تمام میدانوں میں باہم مربوط اور مضبوط کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔''(۱)

فتح وکامرانی کی شرط اولیں

''فتح وکامرانی کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ محاذ پر کھڑے لشکر کو قائد اور لیڈر اور جنرل معاصی کے ارکاب اور محرمات سے دور رکھیں، جس طرح ظہیر الدین بابر نے کیا تھا۔ اپنی تمام تر توجہات وکوششوں کے ذریعہ لشکر کے فتح وکامرانی کے منافی چیزوں سے پاک کردیں چاہے وہ واضح اخلاقی گناہ ہو یا عملی زندگی میں ہو، یا عقیدہ وفکر کے میدان میں، یا تشکیک والحاد وگمراہی ہو۔''(۲)

مجاہدات کا میدان

''انسان کے مجاہدات کا اصل میدان مسجد کا گوشہ یا خانقاہ کا حجرہ یا تسبیح وسجادہ نہیں، گھر اور بازار، سوسائٹی اور معاشرہ ہے، اور اس میں سنت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے تو چلتے پھرتے سارے مجاہدے اور ساری منزلیں طے ہوسکتی ہیں، دشمن کے ساتھ کیا برتاؤ ہو، دوست کے ساتھ کیا رویہ رکھا جائے، گھر والوں کے ساتھ کس طرح پیش آئیں، پڑوسی کے کیا حقوق ہیں، معاشرہ میں ہماری اخلاقی ذمہ داریاں کیا ہیں، ناگوار باتوں کو کیسے برداشت کرنا چاہئے، خدمت وہمدردی کیا چیز ہے، یہ وہ اسباق

---

(۱) تعمیر حیات محمد الحسنی نمبر/ ۲۰۷ (۲) تعمیر حیات محمد الحسنی نمبر/ ۲۵۷

ہیں جو مدرسہ ومکتب اور کسی یونیورسٹی ودرسگاہ میں نہیں بلکہ گھروں میں، سڑکوں پر، راستوں میں، چلتے پھرتے، اور بات کرتے پڑھائے جاتے ہیں، نیند سے بیدار ہوتے ہی آدمی کا سبق شروع ہو جاتا ہے، اور یہ سبق اس کی تمام مشغولیتوں کے ساتھ خود بخود چلتا ہے، اس کو کسی نئے عمل کا اضافہ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ اعمال کی نیت درست کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔"(۱)

سب سے بڑا کمال

"انسان کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اس کا ظاہر وباطن یکساں ہو، ایک طرف اس کا سینہ ایمان ویقین سے اور اس کا دل لازوال محبت سے معمور ہو، اور دوسری طرف اس کی زبان اس کے دل کی ہمنوا اور اس کا عمل ان جذبات اور کیفیات کی ترجمانی کر رہا ہو۔ اگر یہ بات کسی انسان کو حاصل ہو جائے تو اس کا ہر قول وعمل اور اس کی ہر تقریر اور تحریر میں ایک ایسی دلکشی اور دلآویزی پیدا ہو جائے گی جس کی تعبیر الفاظ سے نہیں کی جاسکے گی، لیکن اس کی مٹھاس ہر شخص محسوس کرے گا اور اسے ایسا معلوم ہوگا کہ جیسے کسی نے اس کے دل کی بات کہہ دی یا اس کی گمشدہ دولت اس کو واپس مل گئی

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے"(۲)

---

(۱) تعمیر حیات محمد الحسنی نمبر/۳۲۳ (۲) ایضا/۲۱۹

باب دہم

اکابر ومعاصرین کی نظر میں

رجل موہوب

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ

رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی کے اکلوتے حقیقی بھتیجے اور دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے شہرۂ آفاق عربی جریدہ ''البعث الاسلامی'' کے مدیر مولانا محمد الحسنی جو اپنی بعض خداد خصوصیات اور وہبی کمالات کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی ایک نشانی تھے، اور جن کی عمر ابھی صرف ۴۴ سال کی تھی۔ صرف چند گھنٹے کی علالت کے بعد ہماری اس دنیا سے اٹھالئے گئے انا للہ ما أخذ ولہ ما أعطیٰ وکل شیء عندہ بأجل مسمیٰ۔

دار العلوم ندۃ العلماء کے سابق مہتمم مولانا محمد عمران خاں صاحب ندوی ازہری، مولانا علی میاں کے بارے میں فرمایا کرتے ہیں کہ رجل موہوب (یعنی ان کے پاس جو کچھ ہے وہ کسبی نہیں، وھبی ہے، انہوں نے محنت کر کے حاصل نہیں کیا اللہ تعالیٰ نے اپنے خزانہ کرم سے یوں ہی عطا فرمادیا ہے) واقعہ یہ ہے کہ یہ بات مولانا علی میاں سے کہیں زیادہ ان کے مرحوم بھتیجے مولانا محمد الحسنی کو صادق آتی ہے۔

اب سے ۳۳ سال قبل ۱۹۴۶ء کی بات ہے جب راقم سطور نے مولانا علی میاں کے مشورہ بلکہ انہیں کی تحریک پر ''الفرقان'' کو بریلی سے منتقل کرنے اور خود بھی منتقل ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔اس وقت اپنی رہائش اور الفرقان کے دفتر کے لئے جو مکان کرایہ پر ملا تھا وہ گوئن روڈ پر مولانا علی میاں اوران کے برادر بزرگوار مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی علیہ الرحمۃ کے مکان کے گویا بالکل برابر میں تھا۔عزیز مرحوم مولانا محمد الحسنی ڈاکٹر صاحب کے اکلوتے صاحبزادے تھے۔ان کو سب محمد میاں کہتے تھے اس وقت وہ دس گیارہ سال کے بچے تھے لیکن میں نے کبھی ان کو بچوں کے ساتھ یا بچوں کی طرح کھیلتے نہیں دیکھا، بولتے بھی بہت کم ہی تھے۔دریافت کرنے سے معلوم ہوا تھا کہ یہ پڑھنے کے لئے کسی اسکول یا مکتب مدرسہ میں بھی نہیں جاتے ہیں۔والد ماجد ڈاکٹر صاحب خود ہی ان کو قرآن پاک باترجمہ پڑھاتے ہیں اوراسی کے ذریعہ عربی تعلیم بھی ہورہی ہے اور مصر وغیرہ سے آنے والے عربی اخبارات کا مطالعہ بھی کراتے ہیں۔یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ صرف ونحو کوئی کتاب ان کو نہیں پڑھائی گئی ہے اور نہ پڑھانے کا ارادہ ہے۔

کچھ عرصہ کے بعد سنا کہ محمد میاں عربی میں مضمون نگاری کرنے لگے ہیں..ہم جیسوں کو بجاطور پر حیرت ہوگی کہ جس شخص نے صرف ونحو بالکل نہیں پڑھی۔جو ماضی، مضارع،معرب،مبنی ، مرفوع ، منصوب، مجرور، منصرف، غیر منصرف کو نہیں جانتا، وہ عربی کا کوئی جملہ بھی کیسے صحیح لکھ سکتا ہے، ..لیکن اللہ کی شان اوراس کی قدرت کی کارفرمائی کے محمد میاں صرف ونحو سے بالکل ناواقف اور نابلد ہونے کے باوجود بہت اچھی عربی لکھنے لگے اور جلد ہی وہ وقت آ گیا کہ عالم عربی کے بعض بلند پایہ رسالوں میں مضامین بھیجنے لگے اوران رسالوں میں وہ مضامین بڑے اہتمام اور بڑی قدر سے غالبا یہ سمجھ کر شائع کئے گئے کہ یہ ہندوستان کے کسی علامہ کے قلم سے لکھے ہوئے ہیں۔ اس سلسلہ کا ان کا پہلا مضمون مشہور اخوانی زعیم سعید رمضان کے ماہنامہ ''المسلمون''

میں شائع ہوا تھا۔ جو اس زمانہ میں دمشق سے نکلتا تھا اور عالم عربی کا بلند پایہ اور بہت ہی مؤقر مجلّہ تھا۔

پھر ان کی عمر کا ۲۰ واں سال تھا کہ انہوں نے خود اپنا ایک عربی رسالہ جاری کرنے کا فیصلہ کیا، اور ''البعث الاسلامی'' کے نام سے ایک بلند معیار عربی ماہنامہ اکتوبر ۱۹۵۵ء سے جاری ہوگیا۔ اس وقت وہ ان کا ذاتی رسالہ تھا، ان کا گھر ہی اس کا دفتر تھا، وہ خود ہی اس کے لئے مضامین لکھتے، خود ہی کتابت کراتے اور چھپواتے اور خود ہی ڈاک سے اس کو روانہ کرنے کا اہتمام کرتے۔ ''خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ''۔

راقم سطور کی طرح جو لوگ اس لائن سے کچھ واقفیت رکھتے ہیں وہی سمجھ سکتے ہیں کہ اپنی ذات کے بل بوتے پر ہندوستان سے عربی رسالہ نکالنے کا فیصلہ کیسی ہمت مردانہ اور مالی اعتبار سے کتنے خسارے کا سودہ تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے ۲۰ سالہ محمد میاں کو یہ ہمت بخشی۔۔ جلد ہی ''البعث الاسلامی'' عربی ممالک میں مقبول اور ساتھ ہی خود کفیل ہونے لگا۔

پھر ۱۹۵۹ء میں جب کہ اس کی عمر کا چوتھا سال تھا، اور جیسا کہ عرض کیا گیا عرب ممالک میں اس کو اچھی مقبولیت حاصل ہوگئی تھی، ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ کے ایک جلسہ میں (جس میں راقم سطور بھی بحیثیت رکن انتظامی شریک تھا) اس تجویز پر گفتگو ہوئی کہ ''البعث الاسلامی'' کو ندوۃ العلماء کی تحویل میں لے لیا جائے، اور اس کی اشاعت کا اہتمام و انتظام ندوۃ العلماء کی طرف سے ہو، اور مولانا محمد میاں اسی طرح اس کے مدیر اور ذمہ دار رہیں تو یہ ندوہ اور اس کے دارالعلوم کے لئے خاص کر عرب ممالک میں ان کے تعارف کے لئے بہت مفید ہوگا۔

غور و بحث کے بعد مجلس نے اس تجویز کو منظور کرلیا، مولانا محمد میاں صاحب کی طرف سے ان کے والد ماجد ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحبؒ نے (جو خود ندوۃ العلماء کے ناظم تھے) اس کی منظوری دیدی۔ اور البعث الاسلامی کی ملکیت ندوۃ العلماء کی طرف

منتقل ہوگئی، کسی معاوضہ کا کوئی ذکر ہی نہ آیا بلکہ مولانا محمد میاں کے لئے ان کی محنت اور کارکردگی کا کوئی الاؤنس بھی مقرر نہیں کیا گیا اور وہ اسی شغف اور عرق ریزی کے ساتھ دن رات ایک کرکے اس کا کام کرتے رہے اور اس معیار بلند سے بلند تر ہوتا چلا گیا۔

قریبا دو سال کے بعد جب ان کے والد ماجد ڈاکٹر صاحب وفات پا گئے تو ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ کے ایک جلسہ میں ان کے لئے ''البعث الاسلامی'' کی ادارت اور تمام تر کارکردگی کے سلسلہ میں صرف سو روپے کا الاؤنس منظور کیا گیا، انہوں نے اس کو بھی بہ خوشی قبول کرلیا، حالانکہ اس وقت بھی ندوۃ العلماء کے دفتر کے بعض محرروں کی تنخواہ اس سے زیادہ تھی، اللہ تعالیٰ نے ان کی فطرت کو ان چیزوں سے بالکل بے نیاز بنایا تھا، لیکن ان کی اس قناعت اور قربانی کا صلہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی شان عالی کے مطابق ملا اور ''البعث الاسلامی'' ہی کے سلسلہ سے ان کے لئے ''یرزقہ من حیث لا یحتسب'' کی ایک شکل پیدا ہوگئی۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، کہ وہ عربی زبان کی صرف ونحو سے بالکل ناواقف تھے راقم سطور نے خود مولانا علی میاں سے سنا ہے، کہ غالباً ان کو پوری ماضی کی گردان بھی یاد نہ ہوگی لیکن ''البعث الاسلامی'' میں ان کی جو تحریریں شائع ہوتی تھیں، وہ زبان کے لحاظ سے عالم عربی کے مشاہیر اہل قلم کی تحریروں کے ہم پلہ ہوتی تھیں، ان کے مضامین کا ایک مجموعہ "الاسلام الممتحن" کے نام سے شائع ہو چکا ہے، اس کو دیکھ کر آج بھی ہر وہ شخص جس میں اس کی اہلیت ہو یہ موازنہ کرسکتا ہے۔

وہ زبان واسلوب میں (عربی میں بھی اور اردو میں بھی) مولانا علی میاں کا ایسا تتبع کرتے تھے کہ گویا ان کا ''مثنیٰ'' اور ''دوسری کاپی'' لیکن ادھر کچھ دنوں سے بعض وہ حضرات جن کا احساس واندازہ اس باب میں معتبر ہوسکتا ہے محسوس کرتے تھے کہ ان کے قلم میں خاص کر عربی تحریر میں مولانا سے بھی زیادہ طاقت آگئی ہے خود مولانا علی میاں بھی کبھی کبھی اس کا اظہار فرماتے تھے۔

ان کا شاہکار اور آخری یادگار:

۱۱؍جون دوشنبہ کی شام کو اسی مہینہ جون مطابق رجب) کا ''البعث الاسلامی'' کا شمارہ میرے پاس آیا.. مغرب وعشاء کے درمیان میں نے سب سے پہلے اس کا افتتاحیہ پڑھا، جو عزیز مرحوم کے قلم کا لکھا ہوا تھا، اس کا عنوان تھا ''سوال حائر یحتاج الی جواب'' یہ سات صفحہ کا مضمون تھا، اس میں ممالک اسلامیہ عربیہ خاص کر سعودی مملکت کے ذمہ داروں سے وہ باتیں صاف صاف کہی گئی تھیں جن کا اسی طرح صَف صاف کہا جانا ان کی ءخیر خواہی کا بھی تقاضہ تھا اور از روئے دین اب فرض ہوگیا تھا، اور اس فرض کو اب وہی مرد خدا ادا کرسکتا تھا جس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی خاص توفیق عطا ہو.. اس کو پڑھ کر میں نے محسوس کیا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمارے مولانا محمد الحسنی کو یہ سعادت بخشی گئی ہے کہ بہتر سے بہتر اور موثر سے موثر انداز میں انہوں نے یہ فرض ادا کردیا، میں نے اس افتتاحیہ کو ان کے قلم سے ندائے غیب سمجھا اور طے کرلیا کہ اس کو اردو میں منتقل کرا کے ''الفرقان'' میں شائع کرنا ہے۔

اگلے دن (۱۲؍جون سہ شنبہ) فجر کی نماز کے بعد ہی میں نے مولانا محمد میاں کو فون کیا، ان کے مضمون کے بارے میں اپنا تاثر ان کو بتلایا اور ان سے فرمائش کی کہ وہ اس کو جلدی سے جلدی زیادہ بس دو تین دن میں ''الفرقان'' کے لئے اردو میں منتقل کردیں یا کسی سے کرادیں، انہوں نے کہا بہت اچھا! انشاء اللہ ہوجائے گا، اللہ کے سوا کسی کو بھی علم نہ ہوگا، کہ آج ہی کا دن ان کی زندگی اور ان کے کام کا آخری دن ہے اور کل ہی ان کا سفر آخرت ہے۔

عزیز مرحوم مولانا محمد میاں کو اللہ تعالیٰ نے جس طرح اپنے خاص فضل سے غیر عادی طریقہ پر وہ علمی اور قلمی کمال عطا فرمایا تھا جس کا ذکر اوپر کیا گیا اسی طرح بلکہ اس سے بھی بڑا فضل وانعام ان پر ان کے رب کریم نے یہ فرمایا تھا کہ جس تزکیۂ نفس اور اصلاح اخلاق کے لئے طالبین صادقین برسوں اصحاب ارشاد ومشائخ کی تربیت میں

رہتے اور ریاضتیں کرتے ہیں، اللہ تعالی نے یہ بے بہا دولت ہی ان کو اپنے فضل خاص ہی سے عطا فرمادی تھی۔

معلوم ہوتا تھا کہ کبر، غصہ، حسد، کینہ، بخل جیسے رذائل ان کی فطرت سے نکال دیئے گئے ہیں، اور محاسن اخلاق بھر پور عطا فرمادیئے گئے ہیں، **ذلک فضل الله یؤتیه من یشاء والله ذو الفضل العظیم۔**

جواں مرگ محمد الحسنی

حضرت مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی علیہ الرحمۃ

جون کا معارف طباعت کے آخری مرحلہ میں تھا کہ اچانک اطلاع ملی کہ ندوۃ العلماء کے نقیب رسالہ "البعث الاسلامی" کے مدیر مولوی محمد الحسنی کا انتقال ہوگیا، یہ خبر اتنی خلاف توقع تھی کہ بڑی دیر تک یقین نہیں آیا۔ ان کی عمر زیادہ نہیں تھی، چالیس سے تین ہی چار سال آگے بڑھے ہوں گے، صحت بھی اچھی تھی، کبھی کسی طویل یا شدید بیماری میں مبتلا نہیں ہوئے تھے، جب ملاقات ہوتی ہشاش بشاش نظر آتے۔

سچ یہ ہے کہ جو آیا ہے اسے ایک دن جانا ضرور ہے ﴿کل نفس ذائقة الموت﴾ لیکن کسے معلوم تھا کہ ان کا وقت موعود اتنا قریب ہے، ہم لوگوں کے سامنے تو بچے تھے ان کی پیدائش کل کی بات معلوم ہوتی ہے، ہم کس طرح خیال کرتے کہ وہ ہم سے پہلے رخت سفر باندھ لیں گے، لیکن ان کے دوستوں اور ہم سنوں کو بھی اس تیز روی کا گمان نہیں تھا، ان کی جسمانی ساخت اور صحت کی رفتار دیکھ کر سبھی عمر طویل کی پیشین گوئی کرتے تھے لیکن ظاہر بینوں کے یہ سارے اندازے غلط ثابت ہوئے اور اللہ کی مشیت پوری ہوکر رہی، تقدیر کے سامنے تدبیر نے سپر ڈال دی اور انسان کی مجبوری و بے بسی ہی نہیں خام خیالی اور غلط اندیشی بھی نمایاں ہوگئی۔

مصلحت ایزدی تھی کہ وہ چھوٹی عمر ہی میں اس دنیا سے کوچ کر جائیں تقدیر الٰہی کے رازہائے سربستہ کی نقاب کشائی انسان کے بس میں نہیں ہے اس کا علم ناقص، اس کی نظر کوتاہ اور اس کا علم محدود ہے۔ ان حالات میں وہ حکمت الٰہی کا احاطہ کس طرح کر سکتا ہے، عالم غیب ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے، ہم ظاہر بیں باطن کے حقائق سے ناواقف ہیں، البتہ اللہ کی مصلحت پر ہمارا ایمان ہے اور یہ یقین رکھتے ہیں کہ اس کا کوئی فعل مصلحت سے خالی نہیں ہے یہ ہماری کم نگاہی ہے کہ موت کو زندگی کا خاتمہ سمجھتے ہیں اس سے تو حیات نو کا آغاز ہوتا ہے، دنیا مطیۃ الآخرۃ ہے انسان اس جہاں فانی سے گذر کر عالم جاودانی میں قدم رکھتا ہے جہاں اسے مادہ کے جامۂ تنگ کو اتار کر خلعت لامحدود عطا ہوتی ہے اور فنا کے گھاٹ سے اتر کر بقائے دوام نصیب ہوتا ہے، اسے انحطاط وزوال کے خوف سے نجات ملتی ہے اور عروج مسلسل اور ارتقائے پیہم کی مسرت سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملتا ہے۔

محمد میاں اب ہمیں نظر نہیں آتے ہیں، لیکن یہ ہماری نظر کی کوتاہی اور نگاہ کی نارسی ہے اگر مادیت کا حجاب حائل نہ ہوتا تو ہم دیکھتے کہ وہ لاخوف علیھم ولاھم یحزنون کے عالم میں پہنچ کر فرحین بما آتاھم اللہ من فضلہ کے زمرہ میں شامل ہو گئے ہیں۔ کہاں نزلا من غفور رحیم کے مزے لے رہے ہیں اور پسماندگان کو خوف وحزن سے نجات کی بشارت سنا رہے ہیں ﴿**وذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم**﴾ اللہ کا ہاتھ پکڑنے والا کون ہے وہ جسے جو چاہے دے، وہ سمیع وبصیر، علیم خبیر ہے، وہ دلوں کی آواز سنتا اور نیتوں کے خلوص کو دیکھتا ہے، وہ ماضی سے آگاہ، حال سے باخبر اور مستقبل سے واقف ہے، اس کے یہاں مزدور پابند وقت نہیں بلکہ مزدور کے حسن عمل اور صلاحیت کار پر موقوف ہے۔ کسی کو سارے دن کی جان کاہی کے بعد چند پیسے ملتے ہیں اور کسی کو صرف چند منٹ کی کارگذاری پر اشرفیاں عطا ہوتی ہیں، قلت وکثرت کا فیصلہ مالک کی نظر پر منحصر ہے، اس کو کسی کا کام

پسند آجائے تو تھیلیوں کے منھ کھول دیتا ہے۔

محمد میاں نے عمر بہت کم پائی اس زندگی کی چوالیس بہاریں بھی پورے طور پر دیکھ نہ پائے کہ مادی آنکھیں بند ہوگئیں اور روح فنا کے مرحلہ سے گذر کر بقاء کی منزل میں پہنچ گئی، وہ ڈاکٹر عبدالعلی مرحوم کی آخری اولاد تھے، پانچ بیٹیوں کے بعد اللہ نے انہیں یہ بیٹا عطا کیا تھا، سارے خاندان میں خوشی کی لہر دوڑ گئی، ڈاکٹر صاحب بھی مسرور ہوئے، انہوں نے اس نعمت پر اللہ کا شکر ادا کیا اور طے کرلیا کہ اس عطیۂ ربانی کو اس کی راہ میں لگائیں گے لوگ سمجھتے تھے کہ وہ اپنی طرح دینی و دنیاوی تعلیم دلا کر اس بچے کو ڈاکٹر بنائیں گے لیکن ڈاکٹر صاحب کے سوچنے کا انداز دوسرا تھا وہ اللہ کے دین اور اس کے بندوں کی خدمت کے قائل ضرور تھے مگر موقع اور محل اور حالات وضروریات کے پیش نظر وہ خدمت کی نوعیت اور دائرۂ کار کا یقین کرتے تھے محض مادی نفع تو کبھی ان کا مطمح نظر نہیں رہا۔ وہ خالص دنیاوی کاموں میں بھی روحانی قدروں کو پیش نظر رکھتے تھے اور رضائے الٰہی کی طلب سے کبھی غافل نہ ہوتے تھے مگر اس بارے میں بھی وہ ادنی واعلی نظر رکھتے تھے، انہوں نے محمد میاں کی تعلیم وتربیت میں بھی یہ نقطۂ نظر پیش نظر رکھا، وہ نصاب ونظام تعلیم کے بارے میں تقلید کے بجائے اجتہاد کے قائل تھے اور خوب سے خوب تر کی فکر میں رہتے تھے پہلا تجربہ انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی (علی میاں) پر کیا پھر اسی روشنی میں محمد میاں کے لئے بھی نصاب وطرز تعلیم کا ایک مؤثر اور تیز رفتار لائحۂ عمل مرتب کیا، مجھے یاد ہے کہ تجربہ کار مدرسین اس پر سخت تنقید کرتے تھے اور وثوق کے ساتھ اس کی ناکامی کی پیشین گوئی کرتے تھے مگر ڈاکٹر صاحب اپنی رائے پر جمے رہے، بالآخر ان کی رائے صحیح ثابت ہوئی اور محمد میاں قواعد وضوابط کے پرپیچ راہوں سے گذرے بغیر ادب وانشاء کی ایسی بلند منزل تک پہنچ گئے جس پر لوگ رشک کرتے تھے، ان کی تحریریں فصاحت وبلاغت، زور کلام، قوت استدلال اور انداز بیان کا بہترین نمونہ ہوتی تھیں

، ان کے مضامین عرب ملکوں میں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھے اور دلچسپی سے پڑھے جاتے تھے، وہ مقرر نہ تھے مگر جب کبھی مجمع کے سامنے کوئی مضمون پڑھتے تو سامعین ہمہ تن گوش ہو جاتے۔

اللہ نے ان کے دل کو اسلام کی محبت اور ملت کے درد سے سرشار کر دیا تھا، باپ کی تربیت اور صاحبان علم و بصیرت کے فیضان نظر میں اس نشہ کو دو آتشہ بلکہ سہ آتشہ بنا دیا تھا، ابھی شعور کی آنکھیں ٹھیک سے کھلنے بھی نہیں پائی تھیں کہ وہ اسلام کی خدمت اور ملت کی تنظیم کے خواب دیکھنے لگے، اس غرض سے ایک سوسائٹی کی تشکیل کی اور اسلام کی بین الاقوامی زبان عربی میں ایک اعلیٰ درجہ کے رسالہ کے اجراء کا منصوبہ بنایا ، ان کے حسن نیت نے اس خیال کو مقبولیت عطا فرمائی اور ''البعث الاسلامی'' کے نام سے ایک وقیع رسالہ جاری ہو گیا اور ملل اسلامیہ کے درمیان ربط و نظم کی طرح پڑ گئی جس نے آگے چل کر ایک مؤثر اور مضبوط نظام کی شکل اختیار کی ، ندوۃ الشباب العالمیۃ اور رابطۃ العالم الاسلامیۃ دونوں ان کے خواب کی تعبیر ہیں ان کے قلم کا اثر روز بروز بڑھ رہا تھا اور مصر و شام، نجد و حجاز اور دوسرے عرب ممالک میں ان کے مضامین بڑے شوق سے پڑھے جاتے تھے، ان کا ایک مجموعہ کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے، مزید کتابیں زیر ترتیب تھیں۔ لیکن

ع آں قدح بشکست وآں ساقی نہ ماند

عربی کے ساتھ وہ اردو کے بھی بہت اچھے انشاء پرداز تھے، اس کم عمری میں انہوں نے کہن سال مصنفین سے خراج تحسین وصول کیا، مولانا محمد علی مونگیریؒ کی ضخیم سوانح عمری کے علاوہ تصانیف و تراجم کا ایک سلسلہ یادگار ہے، مشہور صاحب علم جرمن مسلمان لیو پولڈ اسد کی کتاب ''روڈ ٹو مکہ'' {road to mecca} کا ترجمہ ''طوفان سے ساحل تک'' کے نام سے ایسا رواں اور شستہ کیا کہ اہل زبان عش عش کرنے لگے، مولانا ابوالحسن علی کی تحریروں کے بڑے باکمال مترجم تھے، ان کی بہت سی

کتابوں اور رسالوں کو عربی سے اردو اور اردو سے عربی میں منتقل کیا ہے، اور ابھی چند ماہ ہوئے ان کی ضخیم سیرت نبوی ﷺ کا ترجمہ اس خوبی کے ساتھ اردو میں کیا کہ اصل کا گمان ہوتا ہے، علی میاں ان کی ترجمہ نگاری کے بڑے مداح تھے اور کہا کرتے تھے کہ محمد میاں نقل کو اصل بنا دیتے ہیں۔

علم وادب میں اس کمال کے ساتھ وہ تہذیب وشائستگی اور شرافت ومتانت کا بھی بہترین نمونہ تھے، خوردوں کے ساتھ شفقت ومحبت سے پیش آتے، دوستوں کی دلداری ودلنوازی کی کوشش کرتے، بزرگوں کی تعظیم وتوقیر کا ہمہ وقت خیال رکھتے اور ہم نشینوں کی خوشنودی کی فکر کرتے، اجنبی آدمی سے بھی ملاقات ہوتی تو مسکراتے ہوئے ملتے، ان کے چہرے کی بشاشت اور خندہ جبینی ان کی لطافت، طبع اور پاکیزگی قلب کی ترجمان تھی۔ ان کی کس کس بات کو یاد کیا جائے

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

جی چاہتا تھا کہ ابھی کچھ دن اور زندہ رہتے، اپنے بچوں کی بہار دیکھتے، گھر والے ان کو دیکھ کر خوش ہوتے، عزیز ان کے حسن سلوک سے مستفید اور دوست ان کی شگفتہ مزاجی اور بذلہ سنجی سے محظوظ ہوتے، اور ان کے دل ان کی باغ و بہار طبیعت سے باغ باغ ہوتے، ملک وملت کی خدمت کے نئے نئے میدان تلاش کرتے، ان کا اشہب قلم نئی وادیوں میں قدم رکھتا، ان کی جولانیاں نئے معرکے سر کرتیں اور وہ اپنی سحر آفریں تحریروں سے دلوں کو مسخر کرتے لیکن

ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

مشیت ایزدی کے سامنے کسے مجال دم زدن ہے۔ بندگی تسلیم ورضا کی طالب ہے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون.

مولانا محمد میاں مرحوم

مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی☆

انتقال سے تقریباً ڈیڑھ ماہ قبل ایک شام کو ہم اور محمد میاں مرحوم حسب معمول گفتگو کر رہے تھے، دن کی علمی اور تعلیمی مصروفیات، ملاقاتیں، عربی اخبارات کے تبصرے اور عالم اسلام کے مسائل زیر بحث تھے، اسی شام کو جب ہم دونوں بے تکلف گفتگو میں مشغول تھے، محمد میاں مرحوم نے متمم بن نویرہ کے مشہور مرثیہ کے اشعار کے بارے میں کچھ استفسار کیا، جو اس نے اپنے بھائی کے انتقال پر کہا تھا، وہ اشعار یہ ہیں:

وكنا كندما في جذيمة حقبة	من الدهر حتى قيل لن يتصدعا
فلما تفرقنا كأني ومالكا	لطول اجتماع لم نبت ليلة معا
فتى كان أحيى من فتاة حيية	وأشجع من ليث إذا ما تمنعا

(مدتوں ہم لوگ جذیمہ کے ندیموں کے طرح ساتھ رہے، یہاں تک کہ یہ کہا گیا کہ یہ لوگ ایک دوسرے سے کبھی جدا نہ ہوں گے، اور جب ہم بچھڑ گئے تو طول مصاحبت کے باوجود ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں نے اور مالک نے ایک رات بھی ساتھ بسر نہیں کی، میرا بھائی دوشیزہ سے زیادہ باحیا اور شیر سے زیادہ بہادر اور خوددار تھا)۔

آج مجھے یاد آتا ہے کہ اس رات یہی اشعار موضوع گفتگو تھے، پھر گفتگو کا رخ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ان کے بھائی کے انتقال پر ان اشعار سے تسکین حاصل کرنے اور امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اپنے بھائی زید بن خطاب کے مرثیہ کے لیے متمم بن نویرہ سے فرمائش کرنے اور ابن نویرہ کے مرثیہ کہنے (جس سے

(۱) معتمد تعلیم ندوۃ العلماء لکھنؤ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا غم دور ہوا) کی طرف مڑ گیا، پھر یہ سلسلہ کلام دراز ہو کر جذیمہ کے ندیم اور ان کے بارے میں عربی ادب کے تاریخ نویسوں کے اختلاف تک پہنچا، محمد میاں کو ابن نویرہ کے ان اشعار کی اپنے ایک مضمون میں ضرورت تھی، اور میرے حاشیہ خیال میں بھی یہ نہ تھا کہ عنقریب ہم لوگ ہی ان اشعار کا مصداق بنیں گے اور میں اپنے اس عزیز ترین بھائی کی جدائی پر غم واندوہ کے اظہار کے لیے ان ہی اشعار کا سہارا لوں گا، اور ان کے انتقال پر ملال پر آنسو بہاؤں گا، اور کون ہے جو اس حادثہ کے بعد آنسو روک سکے، عربی شاعر کہتا ہے:

ولیس لعین لم یفض ماء ها عذر

(جس آنکھ سے آنسو نہ ٹپکے ہوں اس کا کوئی عذر قابل قبول نہیں ہے)

جن لوگوں نے برادر عزیز محمد میاں کو قریب سے دیکھا ہے یا ان کی تحریروں سے استفادہ کیا ہے، ان سب کے لیے ان کی وفات ایک المناک حادثہ ہے، ان کی تحریر کی تاثیر سے سب واقف ہیں، لیکن ان کی گفتگو میں جو کشش اور تاثیر تھی، اس کا اندازہ وہی لگا سکتا ہے جس کو ان سے ملنے اور بے تکلف گفتگو اور مشورہ کرنے کا موقع ملا ہو، اور جو ان کی ساحرانہ شخصیت اور دل نواز مسکراہٹ سے واقف ہو، پھر وہ شخص جو ان کے ساتھ مستقل رہا ہو، اور تاحین حیات ان کا رفیق کار رہا ہو، اس کا ان کے فراق پر حسرت اور حزن وملال کا کیا عالم ہوگا۔

محمد میاں کا ۴۴ سال کی عمر میں انتقال ہوا لیکن اصابت فکر، استقامت، سخاوت اور روزمرّہ کی زندگی میں لغویات سے بعد واجتناب میں وہ اس مقام تک پہنچے ہوئے تھے جس کی اکثر سن رسیدہ اور تجربہ کار لوگ تمنا ہی کرتے رہ جاتے ہیں، اپنی ان خصوصیات وکمالات میں جو انھیں بچپن سے پائے جاتے تھے وہ اپنے معاصرین سے بہت فائق تھے، اللہ والوں کے ان کے اخلاق تھے، اپنے ساتھیوں اور عزیزوں کی فروگزاشتوں کو انگیز کر لینا ان کا شیوہ تھا، جس کے سبب وہ سب کے محبوب و ہردلعزیز

تھے، جو شخص ان سے ملتا ان کے اکرام واحترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے بڑی خندہ پیشانی سے ملتے، اس کے قیمتی وقت کی پوری رعایت کرتے، وہ خوددار وغیور تھے، بڑوں کی تعظیم کرتے اور چھوٹوں سے محبت کا معاملہ کرتے، ان کے احساسات کو ٹھیس پہنچانے سے گریز کرتے، کیونکہ یہ ان کے نزدیک ناقابل معافی جرم تھا، گھر کے چھوٹے بڑے سبھی افراد ان کے ساتھ محبت اور احترام سے پیش آتے، اسی طرح وہ چھوٹے بڑے، طلبہ و اساتذہ، دوست واحباب سب کو محبوب اور اس کے ہم راز و دم ساز تھے۔

محمد میاں اپنے اہل وعیال اور ہر تعلق والے کے ساتھ بڑے خلوص ومحبت سے پیش آتے، ان کی ہمت افزائی کرتے، خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار اور ان کی آبیاری کرتے، ہر ایک کے مسائل سے دلچسپی لیتے اور صبر ودلچسپی سے اس کی گفتگو سنتے اور مشورہ دیتے اور اگر کسی تعاون کی ضرورت ہوتی تو پورا تعاون کرتے، ان کے حوصلے بلند کرتے، اس میں اس کی رہنمائی کرتے، صلاحیتوں کو ابھارتے، اور کام کرنے کے میدان اس کے لیے تلاش کرتے، یہی سبب ہے کہ سب کے نزدیک وہ قول وعمل کی جامعیت، دل کی نورانیت، عقل و دانش کی روشنی اور بصیرت کی تابانی کی جیتی جاگتی مثال بن گئے، اس کے ساتھ ساتھ اپنے کام میں پورا انہماک واستغراق تھا، اور لایعنی باتوں سے احتراز واجتناب، مشورہ اور مسائل کو حل کرتے وقت ان کا رویہ ہمیشہ مثبت ہوتا، سلبی تصور اور مداخلت سے ان کو مناسبت نہیں تھی۔

ہم دونوں کی پرورش ایک ہی گھر میں ہوئی، ان کے والد ڈاکٹر حکیم سید عبدالعلی صاحب حسنی رحمۃ اللہ علیہ میرے ماموں تھے، ہم دونوں نے عربی زبان ایک ساتھ سیکھنا شروع کیا، اس فرق کے ساتھ کہ میں ندوۃ العلماء کا طالب علم تھا اور وہ اپنے والد کے مثالی مدرسہ کے قلیل مدت میں انھوں نے تعلیم مکمل کر لی، اپنے والد کی مثالی علمی وفکری رہنمائی میں وہ آگے بڑھتے رہے، اس پوری مدت میں وہ باوقار، خوددار، اور اپنے والد کے حد درجہ اطاعت شعار رہے، ۱۶؍سال کی عمر میں عربی انشاپردازی شروع کی، پھر

ندوۃ العلماء کے کبار اساتذہ اور مشائخ سے ایک سال تک علم حدیث اور دوسرے علوم اسلامی میں استفادہ کیا، اس اثنا میں وہ عربی میں مضامین لکھتے رہے، یہاں تک کہ اسلامی رنگ کے انشاپردازوں اور ادباء کی صف میں خاص امتیاز کے مالک بن گئے، ان کے مقالات توجہ سے پڑھے جانے لگے، وہ جو کچھ لکھتے وہ ان کے دل کی آواز ہوتی، شہرت اور ناموری سے ان کو کوئی مناسبت نہ تھی، ان کے مقالات پڑھنے والے اور ان کی شخصیت اور فکر سے متاثر ہونے والے ان سے ملاقات کے شائق ہوتے، مگر وہ اکثر ملاقاتوں سے گریز کرتے، تواضع اور انابت الی اللہ کے ساتھ اپنے کام میں مصروف رہتے، ہمیشہ اپنی نیت کا محاسبہ کرتے رہتے، اور ہر طرح کی آلودگی سے اس کی حفاظت کرتے، چند سال پہلے صالحین اور مجاہدین کی سیرت کے مطالعہ سے ان پر اس احتساب کا ایسا غلبہ ہوا کہ انھوں نے تزکیہ و تربیت نفس کے لیے لوگوں سے ساتھ زیادہ اختلاط سے اجتناب کا ارادہ کر لیا تھا، ان کے ذہن میں اکثر یہ سوال پیدا ہوتا اور مجھ سے اکثر تذکرہ کرتے، ایک روز مجھ سے کہنے لگے: تاریخ میں صرف ان ہی حق پرستوں کی اصلاحی خدمات کا تذکرہ ملتا ہے جنھوں نے اپنی زندگی کا ایک عرصہ اپنے نفس کی تربیت واصلاح میں گزارا، دعوت کا مرکز داعی کا قلب ہے، اس لیے اس کے دل کو آئینہ کی مانند صاف وشفاف ہونا چاہیے، ان کو اہل حق اور اہل قلوب سے بہت تعلق اور قلبی مناسبت تھی، ان کی خدمت میں وقت گزارنے اور استفادہ کرنے کی جستجو رہتی، خاص اوقات میں خاص طور سے بعد مغرب اکثر گھنٹوں تدبر و تفکر میں گزارتے، اصلاح نفس، اخلاص عمل اور حسن نیت کے لیے ہر وقت کوشاں رہتے تھے، اور اپنے ساتھیوں اور عزیزوں کو بھی اس رنگ میں دیکھنا چاہتے تھے، لغویات سے اجتناب کرتے، باہم طنز و مزاح خواہ وہ صرف تفریح ہی کے لیے کیوں نہ ہو اور عیب جوئی سے احتراز کرتے اور اپنے رفقاء کو اس کی طرف متوجہ کرتے، اگر وہ کسی مجلس میں ہوتے اور لوگ ایسی گفتگو شروع کرتے جو ان کے ذوق و وجدان پر گراں ہوتی تو وہ خود ہی اس مجلس سے خاموشی یا کوئی عذر پیش

کرکے اٹھ جاتے یا خاموشی اختیار کر لیتے، اس طرح اکثر گفتگو کا رخ بدل جاتا، اور کسی کی دل شکنی بھی نہ ہوتی، لوگوں کے محاسن تلاش کرنا اور کمالات کی بنیاد پر ان سے تعلقات استوار کرنا ان کی طبیعت ثانیہ تھی، اسی لیے مختلف اور جدا جدا افکار و خیالات رکھنے والے اختلاف رائے وفکر کے باوجود ان کے شناسا اور ان سے متعارف تھے، ان سے تعلق رکھتے تھے اور اپنے معاملات میں ان سے مشورہ لیتے تھے۔

محمد میاں نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز ۲۵ رسال قبل ۱۹۵۰ء میں خال معظم حضرت مولانا مدظلہ کے ایک کتابچہ "صورت وحقیقت" کے عربی ترجمہ سے کیا، اس ترجمہ نے علمی حلقوں میں بڑی مقبولیت حاصل کی کیونکہ ان کا اسلوب اصل روح سے ہم آہنگ تھا، بحیثیت انشاپرداز عربی زبان میں یہ ان کی ابتدا تھی، پھر انھوں نے مولانا مدظلہ کے بہت سے مقالات کا اردو سے عربی اور عربی سے اردو میں ترجمہ کیا، اسی کے ساتھ ساتھ خود بھی چند مقالے تحریر کیے جو سلامت فکر اور اصابت رائے کے آئینہ دار ہیں، بیسویں سال میں قدم رکھتے ہی وہ علم وادب کے حلقوں میں مشہور و معروف ہو چکے تھے، انشاپردازی میں ان کا اسلوب دوسرے ادباء کے اسالیب کے مقابلہ میں لفظ و معنی کے جمال کی جامعیت، عقل وقلب پر اس کی قوت تاثیر، ضمیر کی بیداری اور اصابت فکر و صحت مقصد کے سبب، اور ترجمہ میں باریک بینی اور امانت داری کے سبب ممتاز و جداگانہ ہے، ان کو عربی اور اردو دونوں زبانوں میں درجۂ امتیاز حاصل تھا کہ ان کی تحریر لفظی روانی اور معنوی چاشنی کی غماز تھی، ان کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ وہ بیک وقت ترجمہ وتالیف اور سنجیدہ و دقیق علمی تحریر اور جذباتی اور قلب و دماغ کو اچک لینے والی تحریر دونوں کے جامع تھے، ان کے اسلوب کا کمال یہ تھا کہ وہ دل پر احساس ہوئے بغیر اثر کر جاتا تھا، پھر فکر وخیال پر اثر ڈالتا، اس پر تابندہ نقوش چھوڑتا اور اس کو عمل پر ابھارتا تھا۔

ایک روز میں نے ان سے سوال کیا: تمہاری تحریر ماموں جی مدظلہ کی تحریر وفکر سے بہت مشابہ ہے، اس کا کیا راز ہے، ایک دوسرے کا کلام مشابہ ہوتا ہے لیکن اتنا مطابق

ہونا کہ امتیاز مشکل ہوجائے، اسالیب کی تاریخ میں کم ملتا ہے۔

انھوں نے جواب دیا کہ میں نے بچپن ہی سے چچا میاں کی اہم تصانیف کا گہرا مطالعہ کیا، اس حال میں ایک مثالی شخصیت کی حیثیت سے ان کی محبت میرے دل میں گھر چکی تھی، ان کے لکھے ہوئے لفظ پر میں غور کرتا اور اس کی ادبیت سے لطف اندوز ہوتا اور اس کو ادا کرنے کی فکر کرتا، اس لیے ان کا طرز تحریر اور اسلوب میرے ذہن و دماغ میں رچ بس گیا، میرے خام و ناپختہ ذہن میں ان کی پختہ اور صحیح فکر نے گھر کرلیا، اس کے بعد انھوں نے عربی کا یہ شعر پڑھا

أتاني هواها قبل أن أعرف الهوى

فصادف قلبا خاليا فتمكنا

(محبت کے عرفان سے پہلے اس کی محبت نے مجھے تاکا تو اسے ایک خالی دل ملا جو اس کا نشیمن بن گیا)

انھوں نے بالکل سچ کہا، مولانا مدظلہ اور محمد میاں کی تحریریں پڑھنے والا ہر شخص اس کا اعتراف کرے گا، سب سے زیادہ جس بات نے محمد میاں کو اس صفت سے متصف کیا وہ مولانا ندوی مدظلہ کی ہر تحریر پر ان کا بھرپور اعتماد اور اس کا صحیح استعمال ہے، اسلوب کی روانی، اس کی سحر انگیزی، نوجوانوں کے ایمانی جذبات کی برانگیختگی، ان کی نفسیات کی رعایت، دعوتی طریقہ کار سے واقفیت اور عالم اسلام کے حالات پر گہری نظر، غرض ہر چیز میں انھوں نے مولانا ندوی کے مکتبہ فکر سے خوشہ چینی کی اور ان کی فکر اور اسلوب کے آئینہ دار بن گئے، بلکہ ان کے عزم و قوت اور جولانی طبع نے ان میں مزید گرمی اور قوت پیدا کردی۔

محمد میاں نے ۱۹۵۵ء میں مجلہ البعث الاسلامی کا اجرا کیا، وہ زمانہ اشتراکیت کے طوفان اور عرب قومیت کے فتنہ کے عروج کا زمانہ تھا، اور ان نظریاتی اور فکری طوفانوں کا شکار زیادہ تر نوجوان تھے، انھوں نے اپنے اداریوں میں نوجوانوں کو

مخاطب کیا، البعث الاسلامی کے مقاصد کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں، جس سے نوجوانوں کو متوجہ کرنے کی ضرورت اور اہمیت ظاہر ہوتی ہے:

''موجودہ زمانہ میں مسلمان نوجوانوں کو اللہ پر ایمان، اس کے پیغام پر ناز وافتخار اور مستقبل پر اعتماد کی ضرورت ہے، ان کو سب سے زیادہ اتحاد واتفاق کی ضرورت ہے، اس طرح کہ باطل کے سامنے سب کے سب ایک اکائی بن جائیں، مسلمان نوجوانوں کو علم وادب کے خوشگوار آمیزہ کی ضرورت ہے، ان کے ذہن و دماغ میں دنیا کی سب سے قیمتی متاع ان کا دین و ایمان ہونا چاہیے۔

عرب نوجوانوں کو خاص طور سے عربی صحافت پر توجہ کرنے کی ضرورت ہے، ہندوستان کے ترقی پذیر ادب کو صحیح علمی، ثقافتی اور دینی رہنمائی کی ضرورت ہے، موجودہ نسل، دینی مدارس کے طلبہ اور مسلمان نوجوانوں کی یہ سب سے اہم ضرورت ہے، ایک ایسے وقت میں جس میں اسلام کو ہزاروں اہل قلم اور زبان شناس ادباء کی ضرورت ہے، مسلمان نوجوان خواب غفلت میں مدہوش ہیں، دینی مدارس کے طلبہ جن کو زمام کار سنبھالنا چاہیے تھا اور امت کی قیادت کرنی چاہیے تھی وہ اسلامی قافلہ کی سب سے آخری صف میں نظر آتے ہیں، یہ دور ظلمت اب ختم ہونا چاہیے اور ہم کو نئے سرے سے نئی زندگی کا آغاز کرنا چاہیے۔''

البعث الاسلامی کے مقاصد بیان کرتے ہوئے انھوں نے اسی افتتاحیہ میں لکھا کہ:

''یہ رسالہ قاہرہ اور بیروت کے رسالوں کی طرح نہیں ہے جو ادب سے کھیلے اور مغربی آقاؤں کے گیت گایا کرے، اور جس کو

سوائے مدح وثنا کے اور بادشاہ وامراء کا کلمہ پڑھنے کے اور کچھ نہ
آتا ہو، البعث الاسلامی ایک دعوتی رسالہ ہے جس کا اپنا مقصد
ہے اور اپنے اصول ہیں۔''

محمد میاں نے اپنے رسالہ کو اسی نہج پر جاری رکھا اور البعث کا خصوصی نمبر ”نحو التكوين الإسلامي الجديد“ (نئی اسلامی تعمیر کی طرف) تک جوان کے ہاتھ سے نکلا ہوا البعث کا آخری نمبر ہے اسی نہج کی نمائندگی کرتا ہے۔

انقلابی دور میں البعث الاسلامی نوجوانوں کا صحیح رہنما اور قائد تھا وہ ان کی ہمت افزائی کرتا، نئے بتوں کو توڑتا اور بھرپور عزم و حوصلہ اور بلندی کے ساتھ اسلام کی دعوت دیتا، اس طرح البعث عہد استبداد و جور میں زخموں سے چور اسلام پسندوں کے لیے مرہم کا کام کرتا تھا، اسلامی صحافت اس عظیم الشان خدمت کو فراموش نہیں کرسکتی جو الحاد و تشکیک بھرے زمانہ میں اس نوجوان ادیب نے اپنی قدرتی صلاحیتوں، پرسوز دل، جوش و جذبہ اور رواں دواں قلم کے ذریعہ انجام دی ہے، اس نے عرب قومیت کے علمبرداروں کی راتوں کی نیند حرام کردی، بلاشبہ ان کی تحریریں اس باضمیر اسلامی صحافت کے لیے مہمیز ثابت ہوئیں جو گزشتہ سالوں میں وجود میں آئیں، جب استعماری طاقتوں نے اسلامی صحافت کی بیخ کنی شروع کی تو تنہا محمد الحسنیؒ کے قلم نے ان کی خبر لی، اس جدوجہد اور قلمی جہاد میں ان کے رفیق کا اور ان کے دوست مولانا سعید الرحمٰن صاحب ندوی تھے، دونوں کے درمیان گہرا تعلق تھا جو تاحیات باقی رہا۔

محمد میاں نے البعث کے اجرا ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے آل اسلامک ورلڈ لیگ (رابطہ اسلامیہ) کے قیام کی دعوت دی اور اندرون و بیرون ہند تمام جامعات اور مدارس کے نوجوانوں کی توجہ اس کی طرف مبذول کی، اس لیے کہ انھیں یقین تھا کہ اسلامی ثقافت سے آراستہ مسلمان نوجوان ہی اسلامی انقلاب کا علم بلند کریں گے جیسا کہ انھوں نے البعث کے پہلے اداریہ میں لکھا ہے، یہ فکر

انھوں نے اس دور میں پیش کی جب کہ مسلمان نوجوان حیران وسرگرداں تھے۔

البعث کے اجرا کے سلسلہ میں پیش آمدہ رکاوٹیں ان کے عزم وحوصلہ کو کمزور نہ کرسکیں، نہ ہی انھوں نے اپنی راہ بدلی، بلکہ وہ ایک جاں باز بہادر کی طرح ڈٹے رہے جو اپنی تلوار کو تیز کر کے میدان جنگ میں بے خوف وخطر کود پڑتا ہے، انھیں کامل اعتماد تھا کہ حق سر بلند رہتا ہے، سرنگوں نہیں، ان کا یہ اعتماد مشاہدہ اور چشم دیدہ چیزوں پر اعتماد سے کم نہ تھا، عرب ممالک میں پائی جانے والی مغرب سے مسحور زندگی کی وہ ایسی تصویر کشی کرتے کہ مصر اور دوسرے عربی ممالک کے نوجوان جو اس تہذیب کے مضر اثرات کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے، انگشت بدنداں رہ جاتے، انھیں ایسا لگتا تھا گویا اس زندگی کا عرصہ تک وہ تجربہ کر چکے ہوں، یہ تصویر کشی بغیر مشاہدہ کے ممکن نہ تھی، مگر ان کی بصیرت اور قوت ادراک دوسروں کی نگاہ اور مشاہدہ پر غالب تھی، ان کی تحریر عرب شاعر کے اس قول کی مصداق تھی:

''ہم اپنی بصیرت سے وہ سب کچھ دیکھ لیتے ہیں جو نگاہیں نہیں دیکھتیں''

مولانا محمد الحسنی مرحوم کا قلم شمشیر کے مثل تھا، انھوں نے دنیا پر یہ ثابت کر دکھایا کہ کبھی قلم تیر وتفنگ کا کام کر جاتا ہے، حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کا مشہور مصرعہ ہے ؏

ویبلغ ما لا یبلغ السیف مذودی

(میری زبان وہ کام کر جاتی ہے جو تیر وتفنگ سے ممکن نہیں)

دوسرے ادباء اور انشاپردازوں کی طرح محمد میاں کا قلم محض بے باک وناقد نہ تھا بلکہ وہ باوقار اور متین وسنجیدہ بھی تھا، چنانچہ اپنے ہر مضمون میں وہ تنقید وتبصرے کے ساتھ مسئلہ کا حل اور اس کا علاج بھی پیش کرتے تھے اور ایک ذمہ دار ادیب کا یہی فرض ہے کہ وہ حالات ونتائج کا صحیح اندازہ لگائے اور اپنے قارئین کو دوراہے پر نہ چھوڑے، نہ ہی ان کے فرائض وذمہ داریوں کی صراحت کیے بغیر ان کے جذبات واحساسات کو

سرد ہونے دے، مولانا محمد میاںؒ کی پختہ فکر، وسیع اور متوازن ذمہ دارانہ تحریر کا سب سے عمدہ نمونہ ان کا آخری مضمون ہے، جو انھوں نے ''جامعۃ البعث الاسلامی'' کے عنوان سے تحریر کیا، اس مضمون میں انھوں نے تعلیم و تربیت اور مستقبل کے باشعور و ذمہ دار افراد ڈھالنے کا ایک وسیع خاکہ پیش کیا ہے کیونکہ وہ سمجھ چکے تھے کہ وہ دور بہت قریب ہے اور جلد ہی ظہور پذیر ہونے والا ہے۔

محمد میاں دعوت، جہاد اور تربیت کی کوششوں کے بارے میں بڑے پر امید تھے، دوسری طرف اللہ سے غایت درجہ ڈرنے والے اور پرہیز گار تھے، اپنے والد اور عم مکرم مولانا ندوی کی رہنمائی اور صحیح اسلامی دینی تربیت نے انھیں کندن بنا دیا تھا، وہ دعوت کا کام کرنے والوں کے لیے خواہ جوان ہوں یا بوڑھے نمونہ عمل تھے، اسلامی دعوت کے کاز کے لیے انھوں نے صحافت اور نشر و اشاعت کو اپنا میدان عمل بنایا اور اس پر ساری توجہ مرکوز کر دی، بغیر کسی کی ملامت کی پرواہ کیے ہوئے وہ آزادانہ اپنا رول ادا کرتے رہے، مصائب نے ان کا منہ نہ موڑا، نہ ہی کسی لالچ یا خوف نے انھیں اپنے مشن سے باز رکھا، انھوں نے جب مصر میں بیداری کی لہر محسوس کی تو مصر کو اس کے نئے دور کے آغاز پر سب سے پہلے مبارکباد پیش کی، اسی طرح ممالک خلیج اور سعودی عرب میں جب انھوں نے دیکھا کہ لوگ خوش حالی اور عیش کوشی میں غرق ہیں تو ان کے اخلاص اور ذمہ دارانہ احساس کو گوارا نہ ہوا، اور انھوں نے ایک نہایت دردمندانہ مضمون "سؤال حائر يحتاج إلى جواب" کے عنوان سے سپرد قلم کیا، اس پر خاص نمبر نکالا جو ان کی حیات کا آخری نمبر ہے۔

نشر و اشاعت کے ذریعہ اسلامی دعوت کے سلسلہ میں ان کے جوش و خروش اور لگن کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ بیک وقت چار رسالوں (دو اردو اور دو عربی) میں انھوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں طاقتور مضامین لکھنے شروع کیے اور یہ مضامین وہ اکثر بغیر فرمائش کے لکھتے، اس لیے کہ دعوت کے لیے فرمائش کی ضرورت

نہیں، وہ تو قلب کا تقاضا اور دل کی تڑپ تھی جوان کو مضامین لکھنے پر آمادہ کرتی، اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ اکثر قارئین محض ان کے مقالات کے سبب ان رسالوں کے خریدار تھے، اس پر مستزاد یہ کہ وہ مولانا ندوی کی کتابوں کا اردو ترجمہ اور ذاتی تصنیف وتالیف بھی کیا کرتے تھے، بیس سے زائد عربی کتابوں کا انھوں نے اردو یا عربی میں ترجمہ کیا۔

جلسوں اور کانفرسوں میں شرکت سے محمد میاں کو زیادہ مناسبت نہ تھی، وہ اکثر گریز کرتے، اس لیے کہ وہ اس کو اپنے لیے رکاوٹ سمجھتے تھے، وہ اپنے آپ کو اس میدان کا آدمی ہی نہیں سمجھتے تھے، اس لیے عموماً وہ کانفرسنوں میں شرکت سے معذرت کردیتے تھے، آخری دنوں میں انھیں قبرص کی اسلامی صحافتی کانفرنس اور ماسکو کی اسلامی کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ ملا مگر انھوں نے معذرت کردی، دراصل وہ سکون کے ساتھ کام کرنے کے قائل تھے، پس پردہ وہ بڑی سے بڑی کانفرنس کی تنظیم کرنے کی صلاحیت رکھتے، ندوۃ العلماء کے تعلیمی جشن کا خاکہ بنانے اور دوسری کارروائیوں کی تکمیل میں ان کا بڑا حصہ رہا ہے، یہی حال ان کا دوسری تنظیموں کے ساتھ تھا، وہ ہر ممکن شکل میں اسلامی مسائل کو حل کرنے میں لگے رہتے تھے، بہت سی مسلم رفاہی تنظیموں کے قیام اور غیر سودی بینکوں کے وجود میں ان کا عملی حصہ تھا، لیکن یہ ساری جدوجہد پردہ کے پیچھے سے تھی، بہت سے دینی اور علمی اور دعوتی کاموں میں ان کی شرکت کو سوائے ان کے اور مالک حقیقی کے جو سمیع وعلیم ہے کوئی نہیں جانتا، بعض خدمات کو صرف صاحب تعلق ہی جانتے ہیں، جن کا ان سے براہ راست واسطہ پڑا تھا۔

محمد میاں اگرچہ علمی حلقوں میں ایک متحمس وفعال نوجوان اور صاحب اسلوب و قلم مدیر البعث الاسلامی کی حیثیت سے مشہور ہوئے لیکن ان کی ان وسیع خدمات کی وجہ سے جب چند گھنٹہ کے اچانک مرض کے بعد ان کی وفات کی خبر پھیلی تو اس حادثہ کا

اثر متعدد اسلامی تحریکوں اور دینی وملی سرگرمیوں پر پڑا، اور ان کی وفات کو امت کا بڑا خسارہ تصور کیا گیا۔

قول وعمل میں اعتدال وہم آہنگی، فکر میں گہرائی وگیرائی، حقوق اللہ اور حقوق العباد کی رعایت وحفاظت، ہر مسلمان کا اکرام، اور اس کے ساتھ معاملہ کی پاکیزگی اور تعلقات میں ترقی وسنجیدگی مرحوم کی بنیادی خصوصیات تھیں، اور آج ان ہی خصوصیات کا موجودہ ادباء اور انشاپردازوں میں خصوصاً نوجوانوں میں فقدان ہے۔

اللہ تعالیٰ ان پر رحمت نازل فرمائے اور ان کو بہتر سے بہتر بدلہ نصیب فرمائے۔

صاحب تذکرہ - ایک فرشتہ نما شخصیت

مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی☆

میں نے اپنی بعض تحریروں میں اپنے ایک ایسے خیر خواہ اور مخلص دوست کا ذکر کیا ہے جن سے میرا مخلصانہ تعلق اسی وقت سے شروع ہوگیا تھا جب مجھے ۱۹۵۲ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ایک طالب علم کی حیثیت سے داخلہ کی سعادت حاصل ہوئی، میں اپنے درجہ سے گھنٹہ ختم ہونے کے بعد نکلتا تھا تو ایک فرشتہ نما نوجوان جو تقریباً ہم عمر تھے نظر آتے تھے، دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ یہ نوجوان اسرۂ حسنیہ کے سب سے بزرگ عالم دین طبیب اور ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے محمد الحسنی صاحب ہیں، اور وہ دارالعلوم کے محدث حضرت مولانا شاہ حلیم عطا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حدیث شریف کے گھنٹوں میں شرکت کے لیے آتے ہیں۔

اس زمانہ میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کچہری روڈ پر دعوت وتبلیغ کے مرکز میں قیام پذیر تھے، ان کا درس قرآن ہر اتوار کو اپنی پوری آب وتاب

(۱) مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ و چانسلر انٹگرل یونیورسٹی لکھنؤ و ایڈیٹر مجلہ البعث الاسلامی لکھنؤ

کے ساتھ قدیم مرکز کے بالائی حصہ پر ہوتا تھا اور پوری طرح سامعین سے بھر جاتا تھا، درس میں شرکت کرنے کے لیے میں بھی بالالتزام وہاں حاضر ہوتا تھا اور مولانا محمد الحسنی صاحب بڑے اہتمام سے شریک ہوا کرتے تھے، اسی دوران ہماری ان کی ملاقات ہوئی، اس وقت اندازہ ہوا کہ ان کو میرے بارے میں کسی حد تک معلومات ہیں، اسی طرح جمعرات کے اجتماع میں بھی ملاقات ہوتی تھی، دارالعلوم میں جب وہ حدیث شریف کے اسباق میں شرکت کے لیے آتے تھے تو موقع نکال کر ملاقاتیں ہوتی رہتیں، ان کو میرا مزاج اور مقصد سمجھنے میں دیر نہیں لگی، میرے لیے بھی یہ بات باعث سعادت تھی کہ ان کے ساتھ رہنے اور عربی زبان وادب کے بارے میں تبادلۂ خیال کا موقع ملا۔

دوران تعلیم برابر یہ سلسلہ جاری رہا، اور اخلاص ومودت کا رقبہ وسیع تر ہوتا گیا، کبھی کبھی ہماری مجلسوں میں ہمارے مرحوم دوست مولانا سید محمد اجتباء صاحب ندوی بھی شریک ہوا کرتے تھے، دارالعلوم سے فراغت کے بعد حضرت مولانا نے میرے لیے تکمیل ادب کا داخلہ منظور فرمالیا، اور ادب کی کتابوں کا مطالعہ جاری رکھنے کے لیے اپنے دست مبارک سے ایک فہرست تیار فرمادی، اور اس کے لیے ندوۃ العلماء کی عام لائبریری میں مطالعہ کا ایک گوشہ بن گیا، اور کچھ ادب وانشاء کے گھنٹے بھی ابتدائی درجوں میں پڑھانے کے لیے مقرر کیے گئے، اس اثنا میں ہم دونوں ساتھیوں کی مجلس اور گفتگو کا میدان پہلے سے زیادہ وسیع ہوگیا، اور عربی زبان وادب کے حصول کے لیے جد وجہد کرنے کا جذبہ پوری طاقت کے ساتھ دل میں موجزن ہوا، حضرت مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضری اور ان کی علمی ودینی مجلسوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی تمنا دل میں گھر کر گئی۔

اب یہ داستان اس طرح شروع ہوتی ہے کہ "المنتدی الأدبي" کا قیام عمل میں آتا ہے، اس کے دیگر ارکان کے ساتھ راقم کو بھی رکن کی حیثیت سے شریک ہونا پڑتا ہے، اس ادبی مجلس کے قائم کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ہفتہ میں ایک بار جمعہ کے دن کوئی

ادبی مقالہ لکھ کر اس مجلس میں پیش کیا جائے، اس کے صدر باوقار جناب مولانا سید محمد طاہر حسینی صاحبؒ (والد ماجد مولانا سید سلمان حسینی ندوی صدر جمعیۃ شباب الاسلام واستاذ حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء) باتفاق رائے منتخب ہوئے، غالباً "المنتدی الأدبی" کے دوسرے جلسہ میں طے پایا کہ جو مضامین اس میں پیش کیے جائیں، ان کو ایک مجموعہ کی شکل میں شائع کرنا اس مجلس کے تعارف اور اس میں لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کے لیے ایک امر ضروری محسوس کیا جارہا ہے، یہ تجویز عام طور سے پسند کی گئی، اور اس اثنا میں المنتدی کے جلسے جاری رہے، مقالات بھی جمع ہو گئے، لیکن چھپنے سے پہلے ان کو تحقیقی مرحلہ سے گزرنا بھی ضروری معلوم ہوا، اسی اثنا میں ایک دوسری تجویز ہمارے مخلص دوست مولانا محمد الحسنی صاحب کے ذہن میں آئی، اور انھوں نے اس سلسلہ میں اپنے بزرگوں سے مشورہ بھی کیا، اور المنتدی الأدبی کے جلسہ میں پیش کر کے اس پر عمل درآمد کرنے کے بارے میں دوستوں سے مشورہ کیا، سبھی نے تائید کی اور اس پر مسرت کا اظہار کیا، لیکن بعض ساتھیوں نے اس کو امر محال تصور کیا، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کو منظور تھا کہ ایک عربی ماہنامہ "البعث الاسلامی" کے نام سے جاری ہو جائے، جس کے لیے ضروری قانونی کاروائیاں شروع کر دی گئیں، اور عربی ماہنامہ نکالنے کے لیے کئی نام پیش کیے گئے، جس میں البعث الاسلامی کا نام منظور ہوا، اور دیگر صحافتی امور اور مضامین کے انتخاب کا مرحلہ کسی حد تک مکمل ہوا، اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے خصوصی توجہ اور دعا کی درخواست کی گئی۔

پرچہ کی تیاری، اس کی ترتیب و کتابت، پریس اور کاغذ کا انتخاب، اسی طرح پرچہ جن شخصیتوں کے پاس بھیجا جائے ان کے نام اور پتے، ٹائٹل کی نوعیت، پرچہ نکالنے کے اہداف ومقاصد، یہ اور اس طرح کے اور دیگر انتظامات کے طے کرنے میں کافی وقت صرف ہوا، اسی اثنا میں دو ساتھی جن کا نام پرچہ کے اندر مدیر التحریر کی حیثیت سے آنے والا تھا وہ اچانک شام یونیورسٹی کے کلیۃ الشریعۃ دمشق میں مزید تعلیم حاصل

کرنے کے لیے روانہ ہوگئے، اگرچہ پہلے شمارہ میں ان کے نام چھپ گئے تھے، لیکن بعد میں مولانا محمد الحسنی اس عربی ماہنامہ البعث الاسلامی کے رئیس التحریر (چیف ایڈیٹر) اور راقم الحروف سعید الاعظمی مدیر التحریر کی حیثیت سے شریک ادارت ہوئے، مگر پہلا شمارہ نکلنے کے بعد جو ٹائٹل کے علاوہ ۳۲ صفحات پر مشتمل تھا، حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کی اجازت سے پہلی اکتوبر ۱۹۵۵ء کو پرچہ کی نشر واشاعت اور تعارف کے لیے مغربی یوپی کے مدرسوں اور یونیورسٹیوں اور وہاں کے اصحاب علم ودانش سے ملنے کے لیے ہم دونوں کا ایک دورہ شروع ہوا، جس کی سب سے پہلی منزل کانپور پھر اٹاوہ، اس کے بعد علی گڑھ، آگرہ، دہلی، وہاں جامعہ ملیہ، مدرسہ فتحپوری، مدرسہ امینیہ اسلامیہ روڑکی، رامپور وغیرہ ہوتے ہوئے دو ہفتے کے بعد لکھنؤ واپسی ہوئی، اس اثنا میں ۵ روپے سالانہ کے حساب سے تقریباً ۵۰ خریدار بن سکے۔

''البعث الاسلامی'' پہلے گوئن روڈ سے نکلا تھا، اس کی ملکیت اور ادارت وغیرہ سب کچھ ذاتی حیثیت رکھتی تھی، اور مولانا سید محمد الحسنیؒ کے والد ماجد حضرت مولانا حکیم سید عبدالعلی صاحب حسنیؒ اس کے مصارف کا انتظام ذاتی طور پر کیا کرتے تھے، جب رسالہ کو ترقی اور مقبولیت حاصل ہوئی، اور اس کی افادیت نمایاں ہوئی تو ندوۃ العلماء نے ۱۹۶۰ء میں اس کو اپنے ترجمان کی حیثیت سے اپنی تحویل میں لینے کا فیصلہ کیا، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ البعث الاسلامی کی تعریف اور اس کے مدیر مرحوم کے زورِ قلم اور ان کے جذبہ ایمانی، جوش جنوں اور بصیرت وحمیت کا تذکرہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''البعث کے صاحب ایمان نوجوان مدیر کا جوش جنوں، اس کی غیرت ایمانی اور زورِ قلم کی وجہ سے جس نے سید جمال الدین افغانی کے ''العروۃ الوثقیٰ'' کے مخصوص مقالات اور مولانا آزاد کے ''الہلال'' کے آتشیں اداریوں کی یاد تازہ کردی تھی، بہت

جلد اس رسالہ نے اسلام پسند حلقوں میں جو مصر کی اس ''خانہ
برانداز'' تحریک سے بے چینی محسوس کر رہے تھے مقبولیت حاصل
کرلی، اور انھوں نے نہ صرف اس کو اپنے خیالات کا ترجمان
سمجھا، بلکہ اپنے زخموں کا مرہم اور اپنے درد کی دوا سمجھا۔''

مولانا محمد الحسنی کا ذہن اسلام کے مسائل وحالات سے کبھی فارغ نہیں رہتا تھا، ہر وقت وہاں کی دینی اور دعوتی تحریکوں اور سرگرمیوں کا بغور مطالعہ کرتے رہتے، اور نت نئے حالات کا جائزہ لیتے رہتے تھے، وہاں سے جو لٹریچر اور جرائد ومجلّات اور نئی کتابیں آتیں، ان کو غائر نظر سے پڑھنے اور نتائج اخذ کرنے میں خاص ملکہ رکھتے تھے، فکری حیثیت سے وہ اتنے بلند تھے کہ بڑے بڑے اہل فکر بھی ان کی بلند پروازی کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے، وہ فکری حیثیت میں اپنے عم مخدوم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے بہت زیادہ مشابہت رکھتے تھے، اس سلسلہ میں بارہا اس کا تجربہ ہوا کہ کسی مسئلہ کے بارے میں جو خیال انھوں نے ظاہر کیا بعینہ وہی خیال حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی زبان سے سننے میں آیا، بعض دفعہ تو الفاظ اور اسلوب بیان میں سو فیصد یکسانیت دیکھنے میں آئی، نہ صرف عالم اسلام بلکہ دنیا کی تہذیبوں اور مختلف تحریکوں اور مادی وغیر مادی دعوتوں اور سرگرمیوں سے خاص طور سے مغربی تہذیب وثقافت سے اس حد تک واقفیت رکھتے تھے جیسے وہ ان چیزوں کا مشاہدہ کر چکے ہوں، اور ان کے تمام عیب وہنر ان کی نظروں کے سامنے ہوں، وہ انگریزی زبان سے بھی واقف تھے، اس لیے انگریزی اخبارات ورسائل اور کتابوں کا بھی مطالعہ کرتے تھے، نومسلم خاتون مریم جمیلہ نے جب ۱۹۶۳ء میں اسلامی موضوع پر لکھی ہوئی اپنی کتاب "Islam Versus the West" حضرت مولانا کی خدمت میں بھیجی تو مولانا محمد میاں نے اس کو پڑھ کر اس کے مختلف حصوں کا عربی میں ترجمہ کیا، جو ''البعث الاسلامی'' کے مختلف شماروں میں چھپا تھا، اس سے پہلے وہ محمد اسد صاحب کی کتاب

"Road to Makkah" کا ترجمہ اوراس کی تلخیص بھی کر چکے تھے، جو ''طوفان سے ساحل تک'' کے نام سے مجلس تحقیقات ونشریات اسلام سے اسی زمانہ میں چھپ گئی تھی، اسی طرح انھوں نے ندوۃ العلماء کے ۸۵ سالہ جشن تعلیمی منعقدہ ۱۹۷۵ء کی تفصیلات کو ''روداد چمن'' کے نام سے مرتب کیا ہے۔

البعث الاسلامی کے پہلے شمارہ میں انھوں نے ''أهـدافـنـا'' کے عنوان سے جو افتتاحیہ سپرد قلم کیا وہ زبان و بلاغت کے لحاظ سے ایک مثال ہے، اوراس دور میں ان کے عربی اسلوب وزبان کو دیکھ کر یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ یہ کسی عجمی ملک میں رہنے والے نوجوان کا قلم ہے یا کسی خالص عرب کہنہ مشق ادیب کے قلم کی روانی ہے۔

انھوں نے عربی زبان کو بہت کم عمری سے اپنی ادبی اور دعوتی سرگرمیوں کا محور بنالیا تھا، حالانکہ انھوں نے کسی مدرسہ میں باقاعدہ تعلیم نہیں حاصل کی تھی، اس کے باوجود وہ بڑے بڑے ادباء اہل قلم کے مضامین پڑھنے لگے تھے، اورعربی لکھنے کی مشق ۱۳-۱۴ سال کی عمر میں شروع کردی تھی، ان کے عم محترم رحمۃ اللہ علیہ ان کے اس وصف انشائی کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

''ابھی مجھے اندازہ نہیں ہوا تھا کہ انھوں نے عربی کتنی پڑھ لی، اور ان کی استعداد کیا ہوئی کہ ایک دن اچانک جب ان کی عمر ۱۳-۱۴ سال سے زیادہ نہ ہوگی، انھوں نے شرماتے ہوئے مجھ سے اپنے عربی کے ایک مضمون کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی، میرے لیے یہ ایک انکشاف تھا کہ وہ عربی میں مضمون لکھنے لگے ہیں، میں نے بڑے شبہ واستعجاب کے ساتھ ان کا مضمون دیکھنا شروع کیا، مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ عربی میں ان کا قلم چل گیا، اور وہ مضمون نگاری کے قابل ہوگئے ہیں، ۱۹۴۹ء میں جب ان کی عمر ۱۴-۱۵ سال سے زیادہ نہ تھی، میں نے لکھنؤ کے ایک تبلیغی اجتماع

میں ''صورت وحقیقت'' کے عنوان سے ایک تقریر کی، اس وقت کے حالات وتأثرات کی وجہ سے یہ تقریر بڑی مؤثر وطاقتور بن گئی تھی، بعض یادداشتوں اور حافظے کی مدد سے میں نے اس کو اردو میں مرتب کرلیا اور وہ ''صورت وحقیقت'' ہی کے عنوان سے چھپ گئی، اس زمانہ میں مجھے حجاز کا دوسرا سفر درپیش تھا جس میں مجھے وہاں طویل قیام کرنا تھا اور وہاں کے علمی وادبی حلقوں میں دینی وذہنی تحریک پیدا کرنے کا عزم تھا، اس مقصد کے لیے مجھے ایسے دعوتی لٹریچر کی ضرورت تھی جو وہاں کے تعلیم یافتہ نوجوانوں اور اہل قلم کے حلقوں میں ایک جنبش وتموج پیدا کرسکے، میں نے امتحاناً یہ تقریر محمد میاں کے حوالے کی کہ وہ اس کا ترجمہ کردیں، خیال تھا کہ میں اس پر محنت کرکے اس کو چھپنے کے قابل بنادوں گا، لیکن جب وہ ترجمہ کرکے لائے تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس میں اصل تقریر کا جوش اور طاقت موجود ہے اور مجھے اس پر کسی خاص محنت کی ضرورت نہیں، یہ ان کے ترجمہ اور انشا کا پہلا کامیاب تجربہ تھا، ''بین الصورة والحقیقة'' کے نام سے رسالہ عربی ٹائپ میں قیمہ پریس بمبئی سے چھپوا کر جون ۱۹۵۰ء میں اپنے ساتھ لے گیا، میں جتنے دعوتی رسائل اپنے ساتھ لے گیا تھا، ان میں یہ رسالہ سب سے زیادہ مؤثر ومقبول ہوا، اور بعض بڑے علماء نے اپنی مجلس میں اس کو خود پڑھ کر سنایا، اس کے بعد اس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں، اور وہ بہت سے عرب ممالک میں بڑے ذوق وشوق سے پڑھا جاتا ہے۔''(۱)

---

(۱) پرانے چراغ ۳/۳۷۵-۳۷۶

جنوری ۱۹۵۸ء میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے مزید استفادہ اور عربی زبان وادب کی مشق کے لیے اپنے استاذ مکرم علامہ ڈاکٹر محمد تقی الدین ہلالی مراکشیؒ کی خدمت میں بھیجا تھا، وہ اس وقت بغداد یونیورسٹی کے ٹیچرس ٹریننگ کالج میں استاذ تھے، حضرت مولانا علیہ الرحمہ کی دعاؤں سے میں ایک عرصہ ان کی خدمت میں قیام کر کے ۱۹۵۹ء میں جب لکھنؤ واپس آیا تو اپنے عزیز اور محترم دوست مولانا محمد میاں صاحب سے مل کر زبردست خوشی ہوئی اور الحمد للہ اپنی مفوضہ ذمہ داریوں کو ادا کرنے کی توفیق حاصل ہوئی، اسی زمانہ میں ہم لوگوں نے ایک بین الاقوامی اسلامی مجلس رابطہ قائم کرنے کا پروگرام بنایا، جس کا نام تھا "الرابطة الإسلامية الدولية"، اس مجلس رابطہ کو ہم نے دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا، ایک عالم اسلامی سے دعوتی اور فکری رابطہ قائم کرنے کے لیے عربی زبان میں، اور دوسری مجلس رابطہ ہندوستان میں کام کرنے کے لیے، جو عام طور سے اردو زبان وادب میں شروع کیا گیا تھا، اور بہت سے نوجوان داعی اور دانشور اس رابطہ کے ممبر ہوئے تھے، اس کا مرکزی دفتر سابق دفتر نظامت کے بالائی حصہ میں گوئن روڈ پر قائم ہوا تھا، اور باقاعدہ اس کی نشستیں ہوا کرتی تھیں، عالم اسلام کے نوجوانوں کو مخاطب کرنے کے لیے اور انگریزی داں طبقے کے لیے ایک خبرنامہ "Bulletin" عربی اور انگریزی زبان میں شائع کرنے کا پروگرام مشورہ سے طے ہوا، اور اس پر عمل ہونے لگا، یہ بلیٹن آٹھ فل اسکیپ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا، چار صفحے عربی کے اور بائیں اور طرف سے چار صفحے انگریزی میں چھپتے تھے اور اسلامی دعوت وفکر کو نوجوانوں تک پہنچانے کے لیے بذریعہ ڈاک بھیجا جاتا تھا، اس کے ابتدائی شمارے چار اور پانچ نمبر جاذب نظر اور چکنے کاغذ پر عمدہ طباعت کے ساتھ شائع ہوئے لیکن فنڈ نہ ہونے کی بنا پر اس کا حلقہ محدود ہو گیا، اور اس کی تلافی کے لیے البعث الاسلامی کے صفحات میں اضافہ کرنے کی کوشش ہوئی، اور رابطہ کے اس کام کو جو کئی سال تک مسلسل قائم رہا، حضرت مولانا نے سراہا تھا اور سب سے زیادہ

حوصلہ افزائی حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی حال ناظم ندوۃ العلماء نے کی، اور ان کے مشورہ سے برابر اس کو تقویت حاصل ہوئی لیکن اس کا کام کمزور پڑنے کے بعد اس کے متبادل کے طور پر حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی کے مشورہ سے دار عرفات کے نام سے ایک تربیتی اور اشاعتی ادارہ قائم کرنے کا حوصلہ ملا، اس کے بانی اور سرپرست خود حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب تھے، اور ہم دونوں اس کے سرگرم رکن کی حیثیت سے کام کرتے رہے، الحمدللہ یہ ادارہ حضرت مولانا کی رہنمائی میں ترقی کرتا رہا، اور اس کی مستقل بلڈنگ بھی تکیہ رائے بریلی میں تعمیر ہوئی، پھر دارالعلوم ندوۃ العلماء کے آخری درجات کے طلبہ حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ سے استفادہ کے لیے ایک ہفتہ وہاں گزارنے لگے، اور ان کے بیچ حضرت مولاناؒ کے محاضرات ہوتے، اس طرح ذہنی وفکری تربیت کے ساتھ بڑی علمی و دینی سوغات لے کر طلبہ واپس ہوتے اور یہ سلسلہ بحمداللہ آج بھی جاری ہے، علمی وفکری اور دعوتی محاضرات کا بھی سلسلہ قائم ہے اور کسی اہم شخصیت کا محاضرہ ہر مہینہ رکھنے کا بھی اہتمام کیا جاتا، اس کا اہتمام وانتظام حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی کی سرپرستی اور جناب مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی (جو دار عرفات کے سکریٹری ہیں) کے مشورہ سے اس کے ڈائرکٹر مولانا سید احمد علی ندوی اور ان کے معاون مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی کرتے ہیں، اب ماشاء اللہ اس کے تحت ایک اشاعتی ادارہ ''سید احمد شہید اکیڈمی'' اور تحقیقی ادارہ ''مرکز الامام ابی الحسن الندوی'' بھی قائم ہو چکا ہے، اور اب مزید ترقی کر کے وہ حضرت مولانا علی میاںؒ کے نام سے ایک زبردست تربیتی، علمی اور اشاعتی ادارہ بن گیا، اور اس کی ایک خوبصورت اور شاندار بلڈنگ بھی بن گئی، اس کے روح رواں اور سرپرست حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب ہیں، اور مولانا محمد میاں کے چھوٹے صاحبزادے مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی اس کے سکریٹری ہیں، اور وہ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

صاحب اور جناب مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی صاحب سے مشورہ کر کے اس کے دائرہ عمل کو زیادہ سے زیادہ وسیع کرنے میں اپنی توانائیاں صرف کر رہے ہیں، اور الحمدللہ اس کے اچھے نتائج برآمد ہو رہے ہیں۔

۱۰ر نومبر ۱۹۶۳ء مولانا محمد الحسنی صاحب کی تاریخ کا ایک اہم ترین دن تھا، ۱۰ر نومبر کی تاریخ کو تعمیر حیات کا پہلا شمارہ منظر عام پر آیا تھا، اس شمارہ کی تیاری میں یہ خاکسار بھی شانہ بشانہ اور قدم بقدم ساتھ رہا، اس وقت کے حالات جو تعمیر حیات کی زندگی سے متعلق تھے، راقم بھی ان حالات کو بدلنے کے لیے سینہ سپر رہا، حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کی دعاؤں سے حالات بدلے اور تعمیر حیات اپنی منزلیں طے کرتا رہا، ندوۃ العلماء کے آرگن کے طور پر اس کا استقبال بھی ہوا، اور ستائشی خطوط بھی آئے۔

اللہ کا شکر ہے کہ پہلے شمارہ کی تیاریوں سے لے کر تقریباً دس سال تک میں تعمیر حیات کی خدمت میں سرگرم رہا، اکثر اداریہ بھی لکھنے کا اتفاق ہوا، تعمیر حیات کے دفتر میں تنہا بیٹھ کر مضامین کی تیاری اور ترتیب، نیز لفافے پر خریداروں کے پتے اور اس کی پوسٹنگ وغیرہ کے تمام انتظامات میں پیش پیش رہنے کی توفیق ہوئی، اس زمانہ کے تعمیر حیات کی جلدیں آج بھی کتب خانہ ندوۃ العلماء میں محفوظ ہیں، لیکن البعث والرائد کے کاموں میں مصروفیت کی وجہ سے وقت کی تنگ دامانی پیش آئی تو حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے مشورہ سے مولانا اسحٰق جلیس مرحوم کو اس کا مدیر مقرر کر دیا گیا، وہ ندوۃ العلماء کے کتب خانہ کی ازسرنو ترتیب وتنسیق کے لیے بلائے گئے تھے، اسی کے ساتھ ان کو یہ ذمہ داری بھی دے دی گئی۔

میں اپنے اس مخلص دوست کے بارے میں جو اپنے خاندان میں محمد میاں کے نام سے معروف تھے اپنے تأثرات کو زیر تحریر لانے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا:

وہ نہ صرف ایک ادیب موہوب، ایک عظیم الشان انشاپرداز اور قلم کے بادشاہ تھے بلکہ وہ ایک داعی، ایک مفکر اور ایک مصلح کی شان بھی رکھتے تھے، وہ جس عصر میں

پیدا ہوئے وہ جنگ آزادی کا آخری دور تھا، اس وقت تک ملک میں ایک انقلابی ادب پروان چڑھ چکا تھا، ادباء وشعراء اپنی تمام تر فنی وقلمی طاقتیں اس لڑائی کو آخری درجہ تک پہنچانے اور استعماری طاقتوں کو زیر کرنے اور ملک کو آزاد کرانے کی راہ میں صرف کر رہے تھے، اس وقت تک عربی زبان و ادب کا ذوق عام نہیں ہوا تھا، بلکہ ندوۃ العلماء کے نصاب تعلیم اور اس کے ذمہ داروں کی کوششوں کے عوض عربی ادب کا چرچا جدید عربی زبان کے نام سے شروع ہو چکا تھا، اور دوسرے حلقوں میں اس ضرورت کا احساس پیدا ہوا، اور مدارس اسلامیہ نے عربی زبان کو ایک زندہ زبان کی حیثیت سے پڑھنے پڑھانے کی طرف توجہ کی، جس کی وجہ سے عربی زبان وادب کے نصاب کو اہمیت دینے کا سلسلہ شروع ہوا، اور ندوۃ العلماء سے شائع ہونے والے عربی مجلّہ ''الضیاء'' کے بند ہونے کے بعد سب سے پہلا عربی مجلّہ ''البعث الاسلامی'' کے نام سے ۱۹۵۵ء میں مولانا محمد الحسنی صاحب نے اپنے بعض مخلص ساتھیوں کے تعاون سے شائع کیا، اگر چہ اس وقت کے ہندوستان کے حالات میں کسی معیاری عربی مجلّہ کا نکالنا ایک جرأت مندانہ قدم تھا، انھوں نے بڑی عالی ہمتی سے کام لیا، اور ان کی ہمت وعزم کو دیکھ کر دوسروں کو بھی حوصلہ ملا، ان کی وفات اچانک ۱۴ر جون ۱۹۷۸ء کو چند گھنٹوں کی بیماری کے بعد ہوگئی، اور ایک زبردست خلا پیدا ہو گیا، ان کی وفات کے بعد ان کے عم مکرم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے ان کے زور قلم اور ان کی زبردست ادبی حس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''خاندان علم اللّٰہی کے اس گوہر شب چراغ نے زندگی کی صرف ۴۴ بہاریں دیکھیں، لیکن اپنے زور قلم سے دعوت وفکر اسلامی کے میدان میں وہ کام کیا جو بعض مرتبہ بڑے اسلامی داعیوں اور اسی میدان میں کام کرنے والوں کے لیے مشکل ہوتا ہے، سحر ناصری کے طلسم کو پاش پاش کرنے میں ان کا بڑا حصہ ہے، انھوں نے

پرزور مضامین اور طاقتور اداریوں سے دلوں کی سرد انگیٹھیوں کو گرم
کیا، آنکھوں کو نم کیا، اور میدان عمل میں حرکت پیدا کی۔"

مولانا سید محمد الحسنی صاحب ایک خالص علمی اور دعوتی گھرانے سے تعلق رکھنے کی بنا پر تصنیف وتالیف کا بھی بہت اونچا اور معیاری ذوق رکھتے تھے، ان کی سب سے پہلی کتاب "سیرت محمد علی مونگیری" ہے جو انھوں نے ۱۹۶۴ء میں لکھی تھی، اگرچہ اس سے پہلے ہی ان کا ترجمہ "طوفان سے ساحل تک" چھپ کر مقبول ہو چکا تھا، اس کے بعد انھوں نے اپنے خاندانی بزرگ شیخ علم اللہ رحمۃ اللہ علیہ جو ایک زبردست عالم ربانی تھے کی سیرت پر اپنی کتاب "تذکرہ شاہ علم اللہ" کے نام سے لکھی۔

مولانا کے قلم میں ایسی طاقت وتاثیر تھی جو مردہ دلوں میں زندگی پیدا کر دیتی تھی، ان کے عربی اور اردو کے مضامین، زبان وبیان اور اسلوب ونگارش کے لحاظ سے اعلیٰ ترین معیار پر پورے اترتے ہیں، البعث الاسلامی کے ہر شمارہ میں ان کا افتتاحیہ ہی دراصل پرچہ کی جان ہوتا تھا، مجھے ذاتی طور پر معلوم ہے کہ عرب نوجوانوں اور اہل قلم کی ایک بڑی تعداد ان کے اداریوں کے لیے بے چین رہتی تھی، جب ان کو معلوم ہوتا تھا کہ یہ تحریر ایک ایسے نوجوان عالم وادیب اور صاحب قلم کی ہے، جس نے عرب ممالک میں کوئی تربیت نہیں حاصل کی ہے اور نہ کسی عرب ملک میں وقت گزارا ہے، تو ان کے تعجب کی انتہا نہیں رہتی تھی، مصر وشام اور اردن وحجاز کی دینی جماعتوں سے تعلق رکھنے والے عرب علماء وادباء اور اخوان نوجوانوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ جب دنیا کے کسی حصہ میں جمال عبدالناصر کے غلط تصرفات اور اس کی اسلام کشی کے خلاف کوئی آواز اٹھانے کی ہمت کسی میں نہیں تھی تو تنہا محمد الحسنی مرحوم نے جمال عبدالناصر کی حقیقت کو آشکارا کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا، اور باوجود خطرات وموانع کے وہ اس مقدس فریضہ سے باز نہیں آئے، جس کا جی چاہے البعث کے وہ مضامین اور افتتاحیے پڑھ لے جس میں انھوں نے قومیت کے بت تراش آزر کے ساتھ پنجہ آزمائی کی ہے اور

اسے آخری انجام تک پہنچا کر دم لیا ہے۔

شاید یہ شعران کی جان فروشانہ کوششوں کی کسی حد تک ترجمانی کر سکے

عشق کی قیمت دیار عشق میں ہے کوئے دوست
جب سے یہ مژدہ سنا ہے سر وبال دوش ہے

مقام مسرت ہے کہ ایک ایسی شخصیت پر حضرت مولانا سید محمد ثانی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے از راہ شفقت ومحبت قلم اٹھایا اوران کی تصویر کشی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا، وہ سادات حسنیہ کے سلسلہ نسب سے بہت زیادہ واقف تھے، وہ نہ صرف ایک مصنف اور خواتین کے لیے ماہنامہ ''رضوان'' کے ایڈیٹر تھے، بلکہ وہ اسی کے ساتھ ایک شاعر دردمند تھے، اور مرد مومن کی شان رکھتے تھے، ان کی شاعری میں حمد و مناجات اور نعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا عنصر پوری طرح نمایاں ہے، وہ بے تکلف نظم کے اسلوب میں شاعری پر بڑی قدرت رکھتے تھے، اور مختلف مواقع پر شعر کہنے میں ان کو پوری مہارت حاصل تھی، ان کے نثری نمونے بھی ان کی تصانیف اور ماہنامہ ''رضوان'' کے اداریوں اور مضامین میں بآسانی دیکھے جاسکتے ہیں، ان کی مشہور اور قابل استفادہ تصنیفات میں خانوادہ علم الٰہی، صادقین صادق پور، مشہد بالاکوٹ اور سوانح مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ (امیر جماعت دعوت وتبلیغ) اور سیرت مولانا محمد ہارون کاندھلویؒ ہیں، اور یہ کتاب بھی جس کا نام ہے ''تذکرہ محمد الحسنیؒ'' جو طباعت کے لیے تیار ہے۔

مولانا محمد ثانی حسنی ندویؒ کے قلم گہر بار سے اس کتاب کا شائع ہونا صاحب تذکرہ کی بے پناہ صلاحیتوں پر ایک بڑی شہادت ہے، مصنف کی زندگی نے اگر وفا کی ہوتی تو یہ سلسلہ طلائی اور دراز ہوتا اور معارف وحقائق کا ایک چشمہ رواں جاری رہتا، وہ اللہ کے مقبول بندے تھے، اور جماعت اہل اللہ سے بہت قریب تھے، ان کے اور صاحب تذکرہ کے لیے یہی دعا ہوسکتی ہے کہ تغمدهما الله برحمته الواسعة.

کچھ یادیں، کچھ باتیں

مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی☆

نحمد و نصلی علی رسوله الکریم!

یہ ناچیز اپنے تعلیمی مراحل طے کرتا ہوا- ۱۹۵۲ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ کے لیے حاضر ہوا، مولانا عبدالرشید صاحب اعظمی مرحوم (راقم سطور کے مشرف داخلہ اور حضرت مولانا علی میاں نوراللہ مرقدہ کے شرق اوسط کے سفر میں رفیق و کاتب) نے داخلہ کے مراحل پورے کرائے، امتحان داخلہ ندوۃ العلماء کے شیخ الحدیث مولانا شاہ حلیم عطا سلونیؒ نے لیا، داخلہ فضیلت اول (دینیات) میں فرمایا، ندوۃ العلماء میں اس وقت عالمیت کے چھ درجات تھے، درجہ ششم سے فارغ طالب علم کو عالمیت کی سند دی جاتی تھی، اس سے قبل کے صرف پانچ سال تھے، پانچ سال میں عالمیت کی سند پانے والوں میں ہمارے دوست پروفیسر ڈاکٹر احتشام ندوی بھی تھے، عالمیت کے چھ درجات کے بعد دو درجے تخصص ادب عربی اور دو درجے فضیلت و دینیات کے رکھے گئے تھے۔

فضیلت اول (دینیات) میں یہ ناچیز اور مولوی مطیع الرحمٰن صاحب ندوی، مولوی وجیہ الدین صاحب ندوی مرحوم، مولوی طاہر علی پورنوی مرحوم اور مولوی احمد علی حسنی مرحوم تھے، اس میں بھی کل تعداد پانچ تھی۔

مولوی مطیع الرحمٰن ندوی تمام ساتھیوں میں بڑے طباع اور ذہین اور حافظ تھے، مدرسۃ الاصلاح میں وہ اس ناچیز سے درجہ آگے تھے، لیکن ندوہ میں داخلہ ایک ہی درجہ میں ہوا تھا۔

---

(۱) مستشار دیوان ممثل رئیس دولۃ الامارات وسابق استاذ حدیث شریف جامعۃ الامارات ومؤسس جامعہ اسلامیہ ومرکز الشیخ ابی الحسن الندوی مظفر پور اعظم گڑھ یوپی

یہ ناچیز چونکہ مدرسۃ الاصلاح کے بعد مظاہر علوم سے ہوکر ندوہ آیا تھا، اس لیے حضرت شاہ حلیم عطا صاحب سلونی بار بار درس حدیث میں حضرت شیخ الحدیث نوراللہ مرقدہ کا ذکر فرماتے تھے، مولانا معین اللہ صاحب ندویؒ (جن میں شرق اوسط کے تبلیغی اسفار سے لوٹنے کے بعد تبلیغ کا بڑا رجحان تھا) حضرت شیخ الحدیث نوراللہ مرقدہ سے وابستگی کے تعلق سے اس ناچیز سے بڑی محبت کرتے تھے، ہماری بورڈنگ کے نگراں مولانا محمد اسحٰق صاحب سندیلوی مرحوم تھے، دونوں بورڈنگوں میں اقامتی طلبہ کی تعداد ۷۰-۸۰ کے درمیان تھی، مولانا عمران خاں صاحب دارالعلوم کے مہتمم تھے، حضرت مولانا علی میاں صاحب معتمد تعلیم اور مولانا ڈاکٹر عبدالعلی صاحب ناظم دارالعلوم، اس طرح دارالعلوم میں اساتذہ کا بہت چیدہ اجتماع تھا، ہر فن کے باکمال اساتذہ موجود تھے۔

حضرت مولانا علی میاں صاحب کو ندوہ کی ترقی اور اس کے مقاصد کی نشر و اشاعت، عشق کے درجے میں تھی، اس لیے وہ طلبہ کی تربیت اور ان کی تعلیمی نگرانی کے تعلق سے بے حد فکرمند رہتے تھے، حضرت مولانا علی میاں صاحب نوراللہ مرقدہ کے گھرانے کے جن افراد سے راقم کا ابتدائی تعارف ہوا، ان میں مولانا محمد واضح رشید صاحب حسنی ندوی ہیں جو ہم سے ایک درجہ آگے تھے، مولوی مطیع الرحمٰن صاحب ندوی کے خاص دوست تھے، ان کے علاوہ مولانا محمد میاں صاحب مرحوم بھی تھے، گوئن روڈ پر واقع تبلیغی مرکز میں بالعموم اتوار کو درس میں جانا ہوتا تھا، اتوار کی شام کو حضرت مولانا علی میاں صاحب کا تبلیغی مرکز میں خصوصی بیان ہوتا، جس میں کثیر تعداد میں لوگ شریک ہوتے، حضرت مولانا کے یہ بیانات اصلاحی ہوتے، جن سے ہر وارد مستفید ہوتا، اس اصلاحی بزم میں جن حضرات سے بکثرت ملاقات ہوتی ان میں مولانا محمد میاں مرحوم، مولانا محمد ثانی صاحب ندوی حسنیؒ اور مولانا محمد طاہر صاحب ندویؒ تھے، ناچیز چونکہ مظاہر علوم سہارنپور سے حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ کے واسطے سے آیا تھا، اس لیے یہ حضرات نہایت محبت کا معاملہ فرماتے۔

فضیلت کے دوسرے سال میں مولانا محمد میاں صاحب مرحوم ساتھ ہو گئے، ان کے والد مولانا ڈاکٹر عبد العلی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک خاص نظام بنایا تھا، حضرت ڈاکٹر صاحب نے عربی زبان سیکھنے اور نحو و صرف وغیرہ کی تعلیم کا جو اسلوب اختیار فرمایا تھا وہ نرالا تھا، مصر کے مجلات و جرائد اور اس دور کے ادباء و صاحب قلم کی کتابوں اور تحریرات کے مطالعہ کا ان کو خوگر بنا دیا تھا، اس طرح ان کی تعلیم مکمل ہوئی، مزید برآں حضرت مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تربیت اور خصوصی توجہ نے اس پر چار چاند لگا دیئے تھے، اس لیے ان میں عربی زبان کے فہم و ادراک اور ذوق کی خاص کیفیت پیدا ہو گئی تھی، صحیح بخاری و صحیح مسلم حضرت شاہ حلیم عطا سلونی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے نہایت اہتمام سے ختم فرمائی تھی، انھیں دونوں کتابوں کے درس میں مرحوم شریک ہوتے، گر چہ ان کتابوں کا قاری مولوی مطیع الرحمٰن صاحب ندوی اور یہ ناچیز ہوتا لیکن حضرت شاہ صاحب کوئی نکتہ بیان کرتے وقت مولانا محمد میاں صاحب کی طرف خاص توجہ فرماتے تھے۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے درس کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ تھی کہ حاشیہ کی طرف اشارہ فرما کر فتح الباری اور شرح نووی کی عبارتیں زبانی سناتے تھے جن کا موضوع سے تعلق ہوتا تھا، حضرت شاہ صاحب کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی حافظہ عطا فرمایا تھا۔

درس کی خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم رحمہما اللہ کے اقوال بکثرت نقل فرماتے، ساتھ ہی ساتھ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کتابوں کے اقتباسات بیان فرماتے تاکہ طالب علم میں ان حضرات کی کتابوں کے سمجھنے کا ذوق پیدا ہو جائے، چنانچہ مولانا محمد میاں صاحب مرحوم کے اندر حدیث فہمی کا ذوق پیدا ہوا، جو ان کی خاندانی روایت کے عین مطابق تھا، اور حضرات شیخین، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب، حضرت سید احمد شہید اور حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہید

رحمہم اللہ کے علوم ومعارف سے آگاہی ہوئی۔

ندوے میں ناچیز کا فراغت کے بعد ایک سالہ قیام تخصص فی الحدیث کے لیے بھی رہا تھا، فراغت وتکمیل کے بعد چند ایام کے لیے صوبہ بہار میں مدرس ہوگیا تھا، اس کے بعد ۱۹۵۶ء میں ندوے میں مدرس ہوگیا، مولانا مرحوم "البعث الاسلامی" کی ادارت سنبھال چکے تھے، مولانا مرحوم کو اسلوب وبیان اور زبان وادب کے علاوہ دعوتی واصلاحی رنگ جو انھیں ورثہ میں ملا تھا، ان کے قلم میں پوری طرح نمایاں رہتا اور اس میں ترقی ہوتی رہتی۔

میں نے پوری زندگی کبھی کسی کی غیبت وشکایت کا ان سے ایک حرف بھی نہیں سنا، مجھے یاد ہے کہ حضرت مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے پوچھا کہ تم کو اکابر میں سے کسی سے مناسبت ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے، اس پر مولانا نے بہت خوشی کا اظہار فرمایا کہ جواب روایت کے عین مطابق ہے۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا اس گھرانے اور خاص طور سے مولانا ڈاکٹر عبدالعلی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے تعلق تھا، حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی بکثرت آمد ورفت رہتی تھی، اور قیام مولانا ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کے یہاں ہی رہتا تھا، اس لیے مولانا محمد میاں مرحوم کو حضرت شیخ الحدیث کی دعائیں اور شفقتیں بھی حاصل رہیں، بیعت کا تعلق حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ سے تھا، حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے بارے میں فرمایا کہ یہ مادرزاد ولی ہیں۔

ایک مرتبہ رائے پور کے سفر میں حضرت مولانا علی میاں صاحب نور اللہ مرقدہ کے وفد کے ساتھ مولانا محمد میاں مرحوم اور یہ راقم سطور بھی تھا، سہارنپور سے بذریعہ بس رائے پور کے لیے روانہ ہوئے اور بہٹ جا کر اترے، نہر کے کنارے کی سڑک سے

رائے پور جانا تھا، لیکن سواری کا نظم نہ تھا، دو بج رہے تھے، بارش بھی ہو رہی تھی، خیال ہوا کہ شاہ مسعود صاحب کے یہاں چلیں، شاید سواری کا انتظام کردیں، سبھی حضرات بھوکے پیاسے تھے، حضرت مولانا نے فرمایا کہ کوئی زبان پر کھانے کا تذکرہ نہ کرے، چنانچہ شاہ مسعود صاحب کے باغ بہٹ ہاؤس میں پہنچ کر نماز ادا کی گئی، تھوڑے وقفہ سے شاہ مسعود صاحب نے آدموں کے ساتھ قسم قسم کے کھانے کا انتظام کردیا، ہم لوگوں نے خوب شکم سیر ہوکر کھایا، انھوں نے رکشے کا بھی انتظام کردیا، جس پر سوار ہوکر بخیر و عافیت رائے پور پہنچے، حضرت رائے پوری نوراللہ مرقدہ نے حضرت کی آمد پر بہت خوشی کا اظہار فرمایا، حضرت کی خدمت میں چند دن قیام کے بعد سہارنپور حضرت شیخ الحدیث صاحب نوراللہ مرقدہ کی زیارت کرتے ہوئے لکھنؤ پہنچے۔

اس ناچیز کا دارالعلوم ندوۃ العلماء میں درس و تدریس کا سلسلہ گیارہ سال یعنی ۱۹۵۶ء سے ۱۹۶۷ء تک جاری رہا، اس دوران مولانا مرحوم سے بکثرت ملاقاتیں رہیں، شہر میں امین آباد جانے کا مقصد عام طور پر ان سے ملاقات ہی رہتی تھی، مولانا مرحوم اکثر چائے و بسکٹ سے ضیافت فرماتے، ان کی ضیافت کے کئی قصے ہیں، وہ ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کے اکلوتے فرزند اور حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کے اکلوتے بھتیجے تھے، ان دونوں حضرات کی خصوصی محنت اور دعاؤں کے نتیجے میں وہ بہت سی صفات و خصوصیات کے مالک تھے۔

اس ناچیز نے ان کو چند انفرادی خصوصیات کا حامل پایا:

۱- ایسے محسوس ہوتا تھا کہ بزرگوں کی دعاؤں کی برکت سے ان میں جو صلاح و فہم، تقویٰ و علمی اور ادبی استعداد کے علاوہ اردو و عربی میں فکر اسلامی کو پیش کرنے کا ایک نرالا انداز پیدا ہوگیا تھا، ان کی عربی تحریریں مصر کے مشہور ادباء و اہل قلم سید قطب وغیرہ کی مماثل ہوتی تھیں، جب وہ لکھنے بیٹھتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ اندر سے علوم و افکار ابلتے چلے آرہے ہیں، وہ اس شعر کا پیکر بن جاتے تھے ؎

بنی اندر خود علوم انبیا
بے کتاب و بے معید و اوستا

۲- ان کی زندگی اخلاق حسنہ، تواضع، خاکساری، خودداری واستغنا کا اعلیٰ نمونہ تھی، گویا ان کی زندگی اس شعر کا مصداق تھی ؎

تعلق سے غنی کے ہو گیا غیروں سے مستغنی
پسند آئے نہ کیوں ان کو میرا مغرور ہو جانا

ان صفات میں وہ اپنی خاندانی اعلیٰ روایات کا نمونہ تے، جن کو دیکھ کر رشک آتا تھا۔

۳- علمائے سلف اور بزرگان دین کے ساتھ نہایت ادب کا معاملہ فرماتے اور اسی کے ساتھ بزرگان دین خاص طور سے حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی، حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری، حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلوی اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب وغیرہم کا ذکر اکثر فرماتے تھے۔

۴- تحریک ندوۃ العلماء اوران کے مقاصد کا بہت گہرا مطالعہ تھا، جس کی جھلک ان کی کتاب ''سوانح مولانا محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ'' میں دیکھی جاسکتی ہے، انھوں نے اس تحریک کے مقاصد کا بہت محتاط انداز میں تجزیہ کیا ہے اور ناظرین کے سامنے پیش کیا ہے، اسی طرح سے انھوں نے ندوۃ العلماء کے جشن تعلیمی پر جو ''روداد چمن'' مرتب کی ہے وہ بھی انھیں کا حصہ تھا، ندوۃ العلماء کے مؤسسین کے پیش نظر ایسے علماء و فضلاء تیار کرنے تھے جو عصر حاضر میں اسلام کے ترجمان بھی بن سکیں، ان کے علمی و تحقیقی کارنامے بھی اس طرح ہوں جو علم وتحقیق کے میدان میں اپنا ایک خاص مقام پیدا کرلیں، جن پر اعتماد کیا جائے، حاصل کلام یہ کہ یہاں کے فضلاء ؎

در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق

کے مصداق بنیں، ندوۃ العلماء کی تحریک کو سمجھنے کے لیے ان کی یہ دونوں کتابیں

کافی ہیں۔

ناچیز ۱۹۶۷ء کے بعد ندوے سے گجرات، گجرات سے سہارنپور حضرت شیخ الحدیث نوراللہ مرقدہ کی خدمت میں بذل المجہود کی تحقیق وطباعت کے تعلق سے حاضر ہوا، وہاں سے قاہرہ جانا ہوا، اور پھر قاہرہ سے واپسی کے بعد ابوظبی میں مقیم ہوگیا، اس دوران جب بھی لکھنؤ آمد ہوتی تو کھانے کی دعوت ضرور کرتے، انھیں کے یہاں رہتا، ٹرین سے سفر کے وقت ناشتہ دان میں کھانا رکھوا دیتے۔

''محدثین عظام'' (ناچیز کی پہلی تصنیف) چھپ کر آئی تو بہت خوشی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ میرے نزدیک بہت انفرادی نوعیت کی کتاب ہے، ''صحبتے با اولیاء'' جب چھپ گئی تو ''تعمیر حیات'' میں یہ تأثر لکھا کہ ''من جملہ انعامات خداوندی کے ایک انعام یہ بھی ہے کہ حضرت شیخ الحدیث نوراللہ مرقدہ کی ان پر خصوصی شفقت کی نظر ہے'' اس کو پڑھ کر ناچیز پر گریہ طاری ہوگیا جو بیان نہیں کرسکتا۔

مولانا مرحوم کی اپنے بچوں کے بارے میں یہ تمنا تھی کہ علم حدیث میں اختصاص پیدا کریں، اللہ کا شکر ہے کہ صاحبزادگان میں مولانا عبداللہ صاحب حسنی نے حدیث میں امتیاز پیدا کیا اور ندوے میں اونچی کتابیں پڑھا رہے ہیں، اور دوسرے صاحبزادے مولوی حافظ عمار حسنی ندوی ہیں جو لکھنؤ میں ایک مدرسہ کے مہتمم و مدرس ہیں، تیسرے صاحبزادے مولوی بلال حسنی ندوی بھی درس وتدریس میں مشغول ہیں، اور علم حدیث میں اختصاص پیدا کرکے اس فن سے خاص لگاؤ رکھتے ہیں، اور کئی تصانیف بھی ان کی اردو عربی میں سامنے آچکی ہیں۔

ندوے کے پچاسی سالہ اجلاس میں ناچیز کی حاضری ہوئی، تو اس موقع پر ان کے ہمراہ حضرت پرتاپ گڑھی رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کا شرف حاصل ہوا، مولانا محمد میاں صاحب مرحوم کی وفات کا واقعہ عجیب ہے۔

چند گھنٹوں کی بیماری کے بعد داعی اجل کو لبیک کہا، دارالعلوم ندوۃ العلماء میں

ان کی نماز جنازہ عالم ربانی حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ نے پڑھائی اور رائے بریلی میں ان کے آبائی وطن تکیہ شاہ علم اللہ میں ان کے برادر معظم مولانا سید محمد ثانی حسنی خلیفہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ نے پڑھائی اور اپنے والد ماجد حضرت ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی رحمۃ اللہ علیہ کے پہلو میں مدفون ہوئے، ان کے عم محترم اور ہم کے مربی ومخدوم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ سفر پر تھے، وہ تدفین کے بعد واپس ہوئے، انھوں نے جس طرح اس صدمہ کو برداشت کیا، یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں، محمد میاں مرحوم ان کے دست راست، قوت بازو اور ان کی فکر وتحریر میں مثنیٰ تھے۔

مختصر تذکرہ

مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ

(خلف اکبر مولانا سید محمد الحسنیؒ)

بقلم
بلال عبدالحی حسنی ندوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

برادر معظم مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ

ولادت سے وفات تک

ولادت اور دادا کی شفقت وتوجہ

برادر معظم مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ کی ولادت ۲۹/ جنوری ۱۹۵۷ء مطابق ۲۷/ رجب الرجب ۱۳۷۶ھ کو ہوئی، وہ اپنے والدین کے پہلے فرزند تھے، دادا (مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ) کی آنکھوں کا نور تھے، بچپن دادا کے ساتھ گزرا، تین چار سال کی عمر ہی کیا ہوتی ہے مگر اس کے باوجود دادا کے ساتھ مسجد جاتے، ایک ایک چیز میں ان کی نقل کرتے، یہاں تک کہ ان کی خدمت میں بھی ان کو مزہ آتا، دادا صاحب کے مطب جانے کا وقت آتا تو جوتے صاف کر کے سامنے رکھ دیتے، والدہ مرحومہ بتاتی تھیں کہ عبداللہ بہت کم عمری میں بولنے لگے تھے، ابا میاں (ڈاکٹر عبدالعلی صاحبؒ) کے پاس لیٹے رہتے اور مزے مزے کی باتیں کرتے، ان کو دیکھ کر ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوتیں، کبھی کبھی ان کی باتوں اور ان کی خدمت سے بہت خوش ہو کر فرماتے کہ یہ میرا اتالیق ہے۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی نظر عنایت

شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کا معمول تھا کہ وہ لکھنؤ کے قیام میں

ہمیشہ ڈاکٹر عبد العلی صاحبؒ کے گھر میں قیام فرماتے تھے، برادر معظم کی ولادت کے بعد جب حضرت تشریف لائے تو ڈاکٹر صاحبؒ نے تحنیک کی سنت ادا کروائی، عجیب بات ہے کہ والد ماجد مولانا سید محمد الحسنیؒ کو بچپن میں حضرت تھانویؒ کی گود میں دیا گیا تھا پھر انہی کے ذریعہ والد صاحبؒ کی بسم اللہ ہوئی تھی اور برادر معظم مولانا عبد اللہ حسنی صاحبؒ بچپن میں حضرت مدنیؒ کی گود میں دیئے گئے، اسی سال حضرت مدنیؒ کی وفات ہوگئی۔

تعلیم وتربیت

مولانا صرف چار ہی سال کے تھے کہ دادا کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا، اب ان کی تعلیم کا وقت آ گیا تھا، مولوی محمد سلیم صاحبؒ کا ان کی مکتبی تعلیم کے لیے انتخاب ہوا جو والد صاحبؒ کے بھی استاذ رہ چکے تھے اور خاندان کے اکثر بزرگوں نے ان سے پڑھا تھا، شرافت واخلاص کا پیکر تھے، بڑی دلسوزی کے ساتھ انہوں نے تعلیم شروع کرائی، قرآن مجید ان کے یہاں مکمل ہوا، پھر قریب کے مکتب میں ابتدائی درجات کی تعلیم حاصل کی اور دار العلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ ہوگیا جس سے خاندان کا تعلق تین پشتوں کا تھا، دار العلوم میں داخلہ سے پہلے ایک عرصہ تک ڈاکٹر ہارون رشید صدیقی سے بھی تعلیم جاری رہی جو گھر کے نیچے ہی قائم مکتبۂ اسلام کے انچارج تھے اور بڑا مخلصانہ تعلق رکھتے تھے، اب بھی ان کی محبت وشفقت کا وہی سلسلہ جاری ہے جو خاندان کے بچوں کے ساتھ شروع میں تھا، اپنی کمزوری کے باوجود وہ بڑی مستعدی کے ساتھ دار العلوم کے شعبۂ دعوت وارشاد میں اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

مولانا کی کل تعلیم دار العلوم ندوۃ العلماء ہی کی ہے، شروع سے اخیر تک انہوں نے وہیں پڑھا، ۱۹۷۷ء میں ان کی فراغت ہوئی، حدیث کی منتہی کتابیں انہوں نے مولانا عبد الستار صاحب اعظمیؒ سے پڑھیں جو اس وقت دار العلوم میں شیخ الحدیث تھے، حدیث ہی سے انہوں نے اختصاص بھی کیا، تعلیم کے آخری دور میں کئی مہینے

انہوں نے حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحبؒ سے بھی استفادہ کیا، وہ اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ مولاناؒ کے گھر حاضر ہوکر باقاعدہ بخاری شریف کا درس لیتے تھے، مولاناؒ نے باقاعدہ تینوں کے ذمہ الگ الگ شروحات کا مطالعہ لازم کیا تھا، برادر معظم کے ذمہ علامہ عینی کی عمدۃ القاری تھی جس کو وہ بڑے اہتمام سے دیکھ کر جاتے تھے، فراغت کے بعد یا اس سے کچھ پہلے کچھ عرصہ انہوں نے مدرسہ فرقانیہ جاکر تجوید سیکھنے کا بھی اہتمام کیا اور اس کی ان کو باقاعدہ سند بھی حاصل ہوئی اور دستار بھی ملی۔

تعلیم کے آخر دور میں محدث شام علامہ عبدالفتاح ابوغدہ پندرہ روز کے لیے ندوہ تشریف لائے جو منتہی طلبہ ان کے بہت قریب رہے اور انہوں نے علامہ موصوف سے بھرپور استفادہ کیا ان میں مولانا بھی تھے، ان کی شفقت ومحبت کا گہرا اثر پڑا اور رخصت ہوتے وقت بعض طلبہ ضبط نہ کرسکے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء سے تدریسی وابستگی

فراغت کے بعد حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے حکم سے وہ ندوہ ہی سے وابستہ ہوگئے، تدریس کا سلسلہ شروع ہوا اور الرائد سے بھی وابستگی ہوگئی جس میں مضامین لکھنے کا کام بھی سپرد ہوا، راقم سطور اس وقت بہت کم عمر تھا مگر یاد ہے کہ برادر معظم کبھی کبھی اپنے شاگردوں کی دعوت بھی کرتے تھے جن میں خاص طور پر ملیشیا کے طلبہ ہوتے تھے، ان میں ایک تعداد ایسے طلبہ کی ہوتی جو مولانا سے عمر میں بڑی ہوتی، وہ بیس سال کی عمر میں ہی مدرس ہوگئے تھے، تدریس سے ان کو مناسبت بھی تھی اور اس کے لیے بڑا اہتمام کرتے تھے، اس ابتدائی دور کے طلبہ جن میں بہت سے آج علماء ودعاۃ ہیں مولانا کا تذکرہ بڑی محبت وعقیدت سے کرتے ہیں۔

والد ماجد کا انتقال

تدریس کو شروع کیے ہوئے ابھی دو سال ہی ہوئے تھے کہ ان پر غم کا پہاڑ ٹوٹ

پڑا، اچانک والد ماجد مولانا سید محمد الحسنی صاحبؒ کا وفات کا سانحہ پیش آیا اور چند گھنٹوں میں سب کچھ ہو گیا، حضرت مولاناؒ سفر پر تھے، واپس تشریف لائے تو تدفین ہو چکی تھی، برادر معظم سامنے آئے لپٹا لیا اور آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی، اب وہ ہی گھر کے بڑے تھے، البتہ حضرت مولاناؒ کی سرپرستی سب کے لیے باعث تسکین تھی، انہوں نے گھر کو سنبھالا، تدریس کا معاوضہ وہ لیتے نہیں تھے، الرائد سے کچھ الاؤنس ملتا تھا اور کچھ آمدنی مطب سے ہوتی تھی جو ہمارے گھر میں پشتوں سے قائم تھا اور اس وقت اس میں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب بیٹھا کرتے تھے جن کا والد صاحبؒ سے بڑا گہرا تعلق تھا۔

والد صاحبؒ کے انتقال کے بعد کا زمانہ کچھ تنگی ترشی میں بھی گزرا، کبھی کبھی والدہ مرحومہ کو بڑی دشواری ہوتی تھی، برادر معظم اس کو محسوس کرتے تھے اور کہیں سے کچھ نہ کچھ انتظام کر لیتے تھے، والدہ بڑی غیرت مند خاتون تھیں، قرض لینا بھی ان کو گوارہ نہیں ہوتا تھا، ان کو اپنے فرزند کی احتیاط معلوم تھی پھر بھی ہمیشہ تحقیق کرتیں کہ کہاں سے انتظام کر کے لائے ہو، اطمینان ہونے پر ہی اس کو استعمال میں لاتیں، ان کو یوں بھی دنیا کا کوئی شوق نہیں تھا، نہ کھانے کا، نہ پہننے کا، اپنے معمولات کی بڑی پابند تھیں، فجر بعد کی تلاوت کا ناغہ ہم نے کبھی نہیں دیکھا، جب تک رہیں ہمارے گھر میں کھانے سونے کا نظام درست رہا، ان کے بعد برادر معظم نے یہ ذمہ داری سنبھال لی تھی، وہ ہمیشہ رات کو جلدی سونے کی تاکید کرتے تا کہ فجر کی نماز میں کوتاہی نہ ہو اور تہجد پڑھنے والوں کو دشواری نہ ہو۔

ہم بھائیوں کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری

والد ماجدؒ کے انتقال کے بعد ہم دونوں بھائیوں کی تعلیم و تربیت کا انھوں نے پورا ذمہ لے لیا، والد صاحبؒ کے سامنے بھی وہ ہم لوگوں کی فکر رکھتے تھے، برادر معظم عمار صاحب کا حفظ خود انہوں نے ہی شروع کرا دیا تھا، اور اب تو وہی ہمارے ولی تھے، ہماری تعلیم انہوں نے انوکھے انداز سے شروع کی، بجائے معہد میں داخل کرنے کے

انہوں نے ندوہ کے مختلف اساتذہ سے بات کی اور الگ سے ہمیں تعلیم دینے کا نظام بنایا، ہمیں لے جاکر مولانا مرتضی صاحب کی نگرانی میں بٹھایا جو ایک طرح سے خاندان ہی کے بزرگ تھے، ہمارے پھوپھا مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ کے بڑے مخلص اور چاہنے والے دوست تھے، حضرت سے والہانہ تعلق تھا، گھر کے بچہ بچہ سے ان کو پیار تھا، ہم دن بھر وہیں رہ کر تعلیم حاصل کرتے، خود مولانا مرتضی صاحبؒ نے فارسی پڑھائی، ان کے علاوہ مولانا عبدالغفار صاحبؒ نگرامی نے صرف ونحو اور بعض دوسرے اساتذہ نے اور کتابیں۔ برادر معظم نے یہ نظام تعلیم قدیم طرز تعلیم سے لیا تھا گرچہ بعض حضرات نے اس کو زیادہ مفید نہیں سمجھا لیکن برادر معظم اسی کو تربیت وتعلیم کے لحاظ سے مفید سمجھتے تھے اور ان کا یہ تجربہ مفید ہی ثابت ہوا، برادر معظم کو تعلیم سے زیادہ تربیت کی فکر رہتی تھی اسی لیے انہوں نے ہم پر بڑی پابندیاں لگا رکھی تھیں، عباسیہ ہال جو پہلے کتب خانہ بھی تھا وہاں سے ہمیں سیدھے گھر آنا ہوتا تھا، کسی طالب علم سے گفتگو کرنے کی بھی اجازت نہیں تھی، ایک مرتبہ ہم اپنی کاپی بھول گئے باہر نکلے تو ایک طالب علم سے کچھ اسی سلسلہ میں گفتگو کرنے لگے، برادر معظم نے نہ جانے کہاں سے دیکھ لیا، بعد میں اس پر بھی ڈانٹ پڑی، دو سال کی تیاری کے بعد انہوں نے ہم کو ہشتم معہد میں داخل کرایا، پھر ہشتم عربی تک پوری نگرانی اسی طرح رکھی، عالیہ رابعہ تک نہ ہم نے بورڈنگ کی شکل دیکھی تھی نہ کینٹین کی، اس کے جو فوائد ہوئے وہ ہم جانتے ہیں، برادر معظم کے احسانات تو بے شمار ہیں، اس احسان کو بھی ہم عمر بھر نہیں بھول سکتے۔

والد صاحبؒ مرحوم کو تقریر سے بالکل مناسبت نہیں تھی، اس کمی کو وہ بہت محسوس کرتے تھے اور برادر معظم کے لیے ان کو اس کی بڑی فکر تھی، وہ یہ ضرور پوچھتے تھے کہ تم نے تقریر کی یا نہیں، والد صاحبؒ کے زمانہ میں انہوں نے یہ سلسلہ شروع کر دیا تھا، ندوہ میں جمعیۃ الاصلاح کے اسٹیج سے تو انہوں نے شاید ہی کبھی تقریر کی ہو وہ خود کہتے تھے کہ رٹ کر تقریر کرنا ہمیں یاد نہیں لیکن اندر کے فکر وجذبہ نے ان کے اندر تقریر کا

ملکہ پیدا کر دیا، شروع میں مولانا محمد عارف صاحب سنبھلی ندویؒ اکثر اپنے ساتھ لے جاتے اور تقریر کراتے پھر سلمان بھائی کے ساتھ دوروں کا سلسلہ شروع ہوا اور جا بجا تقریریں کرنی پڑیں، مولانا ابوالعرفان خاں صاحبؒ کو بھی برادر معظم سے بڑی مناسبت تھی، بعض طویل سفروں میں وہ ان کو ساتھ لے گئے، اس طرح ان کو خطابت سے مناسبت پیدا ہو گئی، ہمارے محلّہ کی مسجد میں بھی اس دور کے شہر میں رہنے والے منتہی درجات کے طلبہ ہر ہفتہ جمع ہوتے تھے اور مذاکرہ وتقریر کا سلسلہ رہتا تھا، میرے پھوپھی زاد بھائی مولانا سید سلمان حسینی ندوی اور برادر معظم کے علاوہ مولانا خالد صاحب غازیپوری، مولانا افتخار صاحب اور بعض دوسرے حضرات اس میں شریک ہوتے تھے، لیکن اصل چیز جس نے ان کے اندر خطابت کا جوہر پیدا کیا وہ امت کے لیے ان کی تڑپ ہے، لگتا ہے یہ چنگاری ان کو اپنے نامور دادا مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے مل گئی تھی، جن کا دردوسوز امت کے لیے مشہور ہے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی خدمت میں

حضرتؒ کے ساتھ برادر معظم نے بہت سفر کیے، ہندوستان کے دوروں میں وہ بہت ساتھ رہے اور بیرون ملک کے بھی دو تین سفر حضرت کے ساتھ ہوئے، حضرت سے ان کو بچپن سے محبت ومناسبت تھی اور یہ طبعی بات تھی جس زمانہ میں ہمارے گھر کے سب لوگ رمضان میں بھی لکھنؤ میں رہتے تھے، اس وقت بھی وہ والد صاحبؒ سے اجازت لے کر تکیہ حضرتؒ کے پاس وقت گذارنے آجاتے تھے، حضرتؒ کو بھی ان کے حال پر بڑی شفقت وعنایت تھی، اکثر افطار میں جب کہ ان کا بچپن تھا، حضرت ان کو اپنے پاس بٹھا لیتے اور اپنا بچا ہوا ان کو کھلاتے، یہ محبت بڑھتی ہی گئی، حضرتؒ نے ان کی پوری تربیت کی، ادھر ان کی عقیدت ومحبت میں بھی اضافہ ہوتا گیا، وہ اکثر کہتے تھے کہ جتنے میں نے سفر کیے اور علماء ومشائخ کو دیکھا اتنی ہی ابا جان کی عظمت بڑھتی گئی۔

حضرت مولاناؒ نے برادر معظم کو رمضان المبارک میں درس حدیث کا حکم دیا اور

فرمایا کہ تہذیب الاخلاق کو سامنے رکھ کر درس دیا جائے، آپ اس وقت ندوہ سے فارغ ہی ہوئے تھے اور ان کو اس میں ذرا تکلف تھا مگر حضرت تاکید فرماتے اور روز پوچھتے بالآخر برادر معظم کو شروع کرنا پڑا، تقریباً ۳۵ رسال یہ سلسلہ جاری رہا۔

حضرت کا اعتماد اتنا بڑھ گیا تھا کہ آس پاس کے جلسوں میں جہاں جانا مشکل ہوتا اکثر برادر معظم کو بھیج دیتے اور تکیہ کی مسجد میں جمعہ کی امامت ان ہی کے سپرد تھی، جس دن حضرت کی وفات ہوئی ہمیں بلا کر وفات سے چند منٹ پہلے بھی فرمایا کہ عبداللہ سے کہہ دینا کہ جمعہ کی نماز وہی پڑھائیں، عیدین کی نماز حضرت ہی پڑھاتے تھے، جب کمزوری بڑھی تو اس کی امامت بھی حضرت نے برادر معظم ہی کے حوالہ فرمادی۔

سلوک وتصوف

سلوک وتصوف سے ان کو شروع ہی سے مناسبت تھی اور وہ اس کو خاص طور سے دین کا کام کرنے والوں کے لیے ضروری سمجھتے تھے، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کی خدمت میں سہارنپور کی حاضری ہر رمضان کو ہوتی تھی، حضرت مولاناؒ کے ساتھ ہی زیادہ تر یہ سفر ہوتا تھا، اسی ایک سفر میں حضرت نے شیخ سے فرمایا کہ عبداللہ آپ سے بیعت ہونا چاہتے ہیں، کھانے کا وقت ہوا اور لوگ اٹھنے لگے تو شیخ نے برادر معظم کو تنہائی میں بٹھا لیا اور بیعت لی اور خصوصی توجہ فرمائی، شیخ کا جلد ہی وصال ہو گیا تھا، اس لیے سلوک وتربیت کا تعلق حضرت مولاناؒ سے رہا، آخر میں حضرت نے بڑے انشراح کے ساتھ اجازت بیعت مرحمت فرمائی، اس لیے پہلے ہی متعدد بیعت ہونے والوں سے فرمادیتے کہ عبداللہ سے رابطہ رکھنا۔

حضرت مولاناؒ نے آخر دور میں بخاری شریف سننے کی خواہش ظاہر فرمائی اور اس کے لیے مولانا ہی کا انتخاب فرمایا، کئی سال یہ سلسلہ جاری رہا اور وہ ندوہ کے قیام میں بخاری شریف کے چند صفحات پڑھتے، کہیں حضرت مولاناؒ کچھ وضاحت بھی فرماتے جاتے، رائے بریلی کے قیام میں برادر معظم کی جگہ پر اس ناچیز کو یہ شرف حاصل

ہوتا، حضرتؒ کی معذوری کا سلسلہ کئی ماہ رہا، اس میں وضو کرتے وقت حضرت خاص طور پر ان کو بلواتے اور پاؤں دھلوانے کی خدمت ان سے لیتے، کسی دوسرے سے یہ خدمت لینا ناگوار ہوتا اس لیے برادر معظم بھی اس زمانے میں سفر وغیرہ سے احتیاط کرتے تاکہ یہ خدمت وہی انجام دیں۔

حضرتؒ کی وفات کے بعد حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ کو سب نے اپنا سرپرست بنالیا، مولانا خاص طور پر اہتمام کرتے تھے کہ کوئی کام ان کی اجازت اور انشراح کے بغیر نہ کریں، متعدد مرتبہ ایسا ہوا کہ انہوں نے کوئی رائے قائم کی مگر جب مولانا کی رائے اس سے ہٹ کر معلوم ہوئی تو فوراً انھوں نے اپنی رائے سے رجوع کرلیا۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ کی وفات جمعہ کے دن ہوئی، اس کے ایک ہی گھنٹہ بعد برادر معظم نے جمعہ پڑھایا، اس کی تقریر وخطبہ میں انہوں نے جس استقامت کا ثبوت دیاوہ بھی ایک مثال ہے۔

امت کے لیے فکرمندی اوردلسوزی

حضرت مولاناؒ کے بعد تیرہ سال وہ اس دنیا میں رہے، یہ پوری مدت انہوں نے امت کے لیے فکرمندی اور دل سوزی میں گذاردی، ان کی زندگی کے چار نمایاں عنوانات ہیں، ان کی سب سے بڑی خصوصیت افرادامت کی فکراوران کی اصلاح کی کوششیں ہیں، یہ سلسلہ ان کی تدریس کے زمانہ ہی سے شروع ہوگیا، سب سے پہلے ان کو گھر کے افراد کی فکر تھی، دینی معاملات میں مداہنت ان کو ذرا گوارہ نہیں تھی، گھر میں کسی ایسے عزیز کا ٹھہرنا بھی ان کو گوارہ نہیں ہوتا تھا جو نماز کا پابند نہ ہو، ایسا بھی ہوا کہ اگر کسی نے نماز نہیں پڑھی تو انہوں نے صاف کہہ دیا، دین کے لیے ان کو کسی ملامت کی پرواہ نہیں ہوتی تھی، جو بات غلط ہوتی اس پر نکیر کرتے یا کم ازکم اظہار ناراضگی کرتے اور ماحول کو بہتر بنانے کی فکر میں لگے رہتے۔

دارالعلوم کے طلبہ کی بھی ان کو بڑی فکر رہتی تھی، وہ چاہتے تھے کہ یہ طلبہ دعوت کے مشن کو لے کر کھڑے ہوں، اور مختلف میدانوں میں کام کریں، ان کی اصلاح کی بھی فکر کرتے، طریقہ کار بھی بتاتے، مسائل کو بھی حل کرتے اور دکھ درد میں شریک رہتے، ادھر چند سالوں سے طلبہ کا بہت رجوع تھا، عصر بعد کی مجلس میں کثرت سے طلبہ آتے اور ان کو بڑا فائدہ پہنچتا، متعدد اساتذہ بھی اصلاحی تعلق رکھتے اور مشورہ لیتے رہتے۔

مسلمانوں کی اخلاقی بدحالی پر وہ غمگین رہتے تھے اور اپنی تقریروں میں اور مجلسوں میں اس کی طرف توجہ دلاتے، اہل محلہ کی خاص طور پر فکر کرتے، ان کی دینی رہنمائی کے ساتھ ساتھ ان کی ضرورتوں کا بھی خیال کرتے اور حالات معلوم کرتے رہتے اور ہر ممکن مدد فرماتے تھے، ان کی فکر و تڑپ کا دائرہ صرف مسلمانوں تک محدود نہیں تھا بلکہ ان کو اس سلسلے میں وراثت نبوت حاصل تھی، وہ ایک ایک انسان کے لیے کڑھتے تھے، اس کی ہدایت کے لیے فکر مند رہتے تھے، کبھی کبھی اپنے مخصوص حاضر باشوں سے اس کا اظہار بھی ہو جاتا تھا، اور آخری چند سالوں میں وہ جس طرح دعوتی مشن کو لے کر کھڑے ہوئے اور ہندوستان کے مختلف علاقوں کے انہوں نے دورے کیے، لوگوں کو کام کے لیے تیار کیا اور میدان بھی بنایا اور افراد سازی بھی کی، یہ ان کی اسی تڑپ کا نتیجہ تھا جو اللہ نے ان کے سینے میں ودیعت کر دی تھی۔

مردان کار کی تربیت اور افراد سازی کا کام

خود کام کر لینا قدرے آسان ہوتا ہے لیکن افراد سازی کا کام اور مختلف میدانوں کے لیے ان کو تیار کرنا بہت مشکل کام ہے، یہ برادر معظم کی وہ خصوصیت ہے جس میں کم لوگ ان کے شریک ہوں گے، ان کو اللہ نے جوہر شناس نگاہ عطا فرمائی تھی، وہ ندوہ میں بھی اور سفروں میں بھی مختلف افراد پر نگاہ رکھتے، پھر ان کا انتخاب کر کے ان کو کاموں میں لگاتے، کسی کو دعوت کے کاموں میں لگاتے، تو کسی کا کسی علمی کام کے لیے انتخاب کرتے، کسی کو انتظامی کام سپرد فرماتے، بہت سے ایسے افراد جن سے کوئی توقع

نہیں کی جا سکتی تھی، انہوں نے ان سے بڑے بڑے کام لیے اور ان کو تربیت و اصلاح کا ذریعہ بنایا۔

اخفائے حال

مولانا کی تیسری بہت نمایاں خصوصیت خود نمائی سے اجتناب ہے، انھوں نے بڑے بڑے کام کیے اور کروائے لیکن نام و نمود سے دور رہے، وہ بڑے مصنف نہیں تھے لیکن مصنف گر تھے، خطابت کے وہ شہسوار نہیں تھے لیکن نہ جانے کتنے خطباء انھوں نے تیار کر دیے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جو درد اللہ نے ان کو دیا تھا وہ نہ جانے ان کی صحبت و اخلاص سے کتنے دلوں میں منتقل ہوا، کتنے اللہ کے بندے وہ ہیں کہ ان کے ہاتھ میں ہاتھ دینے سے ان کی دنیا بدل گئی۔

سراپا درد و محبت

چوتھی بڑی خصوصیت مولانا کی یہ تھی کہ وہ سراپا درد و محبت تھے، ایسے ایسے لوگوں کو انہوں نے گلے لگایا جن کی طرف نگاہ کرنے کے بھی لوگ روادار نہیں ہوتے، ان کی محبت نے نہ جانے کتنے دلوں کی دنیا بدل ڈالی، اور کتنے وہ لوگ جو اپنی حالت سے مایوس ہو چکے تھے ان کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی، انھوں نے سب کچھ کیا مگر کس نے دیکھا؟ ہاں! جس ذات کے لیے انہوں نے کیا یہ سب اس کے خزانہ میں جمع ہوا اور ان شاء اللہ وہ وہاں اس کا مزہ اٹھا رہے ہوں گے، البتہ ان کی وفات نے آنکھیں کھول دیں، تعزیت میں آنے والوں نے جو تفصیلات بیان کیں اس پر حیرت بھی ہوئی اور مسرت بھی، حیرت اس بات پر کہ وہ سب کچھ کر گئے اور ان کے سگے بھائیوں اور گھر والوں کو بھی اس کا علم نہ ہوا، اور مسرت اس بات پر کہ انھوں نے اپنی محبت و اخلاص سے اپنے نامور بزرگوں کی یاد تازہ کر دی، اور ان کے جنازہ نے ان کی مقبولیت و محبوبیت لوگوں کو دکھا دی۔

آخری دورہ مہاراشٹر میں جو بڑا کامیاب اور اثر انگیز رہا اور اس کی روداد بھی ان شاء اللہ عزیز گرامی قدر مولوی سعود الحسن ندوی غازی پوری کے قلم سے سامنے آئے گی، جو شریک سفر تھے، اور ''کاروان انسانیت'' کے عنوان سے یہ روداد مرتب کی ہے، عزیز القدر عبداللہ سلمہ پرتا بگڈھی نے بتایا کہ ایک دن تہجد کے وقت کہنے لگے کہ اللہ کا بڑا فضل ہے اس نے بڑا کام لیا، مگر الحمد للہ ہمارے گھر والوں کو بھی اس کا علم نہیں ہے۔

سراپا دعوت

ایک سچے داعی کے لیے یہ چار وہ خصوصیات ہیں جن سے اس کام میں جان پیدا ہوتی ہے، ان کی زندگی خاص طور پر اخیر سالوں میں سراپا دعوت بن گئی تھی، ان کی صرف یہی دھن تھی اور یہی ان کا اوڑھنا بچھونا بن گیا تھا، تہجد سے لے کر دیر رات تک اسی کے لیے دعا کرتے، اسی کی فکر میں رہتے، اور اسی کے لیے تدابیر اختیار کرتے، دعوت کے کام کرنے والوں کو دیکھ کر ان کے اندر طاقت پیدا ہو جاتی تھی، ان کو دین میں داخل ہونے والوں سے بڑی توقعات تھیں اور وہ کہا کرتے تھے کہ نیا خون ہے، اس سے ان شاء اللہ امت میں جان پیدا ہو جائے گی، ان کو نہ سونے کا خیال رہ گیا تھا اور کھانے کا، شاید وہ دیکھ رہے تھے کہ وقت کم اور کام زیادہ ہے، عزیزی عبداللہ سلمہ نے یہ بات بھی بتائی کہ وہ اخیر میں دعا میں یہ بھی کہنے لگے تھے کہ یا اللہ کچھ مہلت مل جائے اور تو یہ کام اور پھیل جائے، کبھی جوش میں کہتے کہ وقت کم ہے کام زیادہ!

گفتگو کرنے کا بڑا سلیقہ اللہ نے ان کو دیا تھا، ان کی تقریر بڑی حکیمانہ اور پُر مغز ہوتی تھی، مثالوں سے بات سمجھانا اور مسائل کو حل کرنا ان کی بڑی خصوصیت تھی، انھوں نے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مواعظ و ملفوظات کا بڑا مطالعہ کیا تھا، ان کی تقریروں میں وہ رنگ چھلکنے لگا تھا، بعض مرتبہ آیات واحادیث کی روشنی میں ایسے نکتہ کی بات کہہ جاتے کہ حیرت ہوتی، اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑا رسا ذہن عطا فرمایا تھا، درس کے دوران بھی دل کو لگتی ایسی باتیں کہتے تھے جن میں حکمت و

موعظت کا بڑا سامان ہوتا تھا۔

اللہ نے ان کو تعبیر کا بھی بڑا ملکہ عطا فرمایا تھا، اس کی شہرت دور دور ہوگئی تھی، اور لوگ ٹیلیفون پر کثرت سے خواب کی تعبیر بھی دریافت کرتے تھے، دعوت کا کام کرنے والوں میں کسی نے خواب دیکھا کہ ایک بہت بڑے بزرگ ان سے کہہ رہے ہیں کہ کام تیز کردو لیکن داڑھی منڈوادو، ان صاحب نے صبح ہی فون کیا اور داڑھی منڈوانے کا ارادہ کرنے لگے، مولانا نے کہا: ٹھہر جائیے! خواب پر غور کیجیے، داڑھی منڈوانے کا وہ مطلب نہیں جو آپ نے سمجھا، داڑھی منڈوانے کا مطلب یہ ہے کہ کام خوب کیجیے مگر اس کو خوب چھپائیے، اس کی تشہیر نہ کیجیے، اور لوگوں کو بتائیے نہیں۔

ایک صاحب نے کہا کہ میں نے اللہ کے رسول ﷺ کو انگریزی لباس میں دیکھا، فرمایا کہ اللہ کے رسول ﷺ سے مراد اسلام اور مسلمان ہیں، اور آپ ﷺ پر جو لباس نظر آرہا ہے اس سے مراد انگریزی تہذیب ہے جو مسلمانوں پر چھائی ہوئی ہے۔

دینی وروحانی ترقی کے لیے وہ دو چیزوں سے اجتناب کو بہت اہمیت دیتے تھے، اور ان کو محرومی کا ذریعہ فرماتے تھے: ایک حرام مال، دوسرے بے ادبی۔ وہ کہتے تھے کہ حرام مال کا ذرہ بھی اگر پیٹ میں چلا جائے تو وہ سب کچھ گندا کر دیتا ہے، اور برکت اٹھ جاتی ہے، خود ان کا اس سلسلہ میں حال یہ تھا کہ وہ عام طور پر لوگوں کی دعوتوں سے پرہیز کرنے لگے تھے، مدرسوں میں اگر کھانا بھی پڑتا تو اپنی اور اپنے رفقاء کی طرف سے اس کا معاوضہ مدرسہ میں داخل کر دیتے، وہ کہتے تھے کہ مدارس میں بے برکتی کا سب سے بڑا سبب یہ حرام ومشتبہ مال ہے۔ اسی طرح بے ادبی کو وہ بڑی محرومی کا ذریعہ سمجھتے تھے، اللہ والوں کے بارے میں ان کی طبیعت بڑی حساس تھی، کوئی اگر ان کے بارے میں کوئی نامناسب تبصرہ کر دیتا تو ان کو سخت ناگوار ہوتا، اور وہ ضرور اس پر نکیر کرتے تھے۔

ان کا ذہن صحیح اسلامی فکر میں ڈھلا ہوا تھا، انھوں نے متقدمین اور متاخرین کی

کتابوں کا کھلے ذہن سے مطالعہ کیا تھا، اور اکثر وہ کہتے تھے کہ ان کتابوں میں بہت سے ایسے مسائل کا شاندار حل موجود ہے جن میں ذہن اُلجھتے ہیں، ان کا خیال تھا کہ مختلف مصنفوں کی کتابوں سے ایسے ایسے اقتباسات جمع کردیے جائیں جن کا مطالعہ ایک عالم کے لیے ضروری ہے، خود ان کا یہ ارادہ بھی تھا مگر زندگی نے وفا نہ کی، حضرت مجدد صاحبؒ کے مکتوبات سے بھی انھوں نے اسی فکر کو سامنے رکھ کر منتخبات جمع کیے تھے، اور عصر بعد کی مجلس میں ان کو متعدد مرتبہ پڑھوایا بھی تھا، ان شاء اللہ جلد وہ منتخبات شائع کیے جائیں گے۔

ہندوستان کے مصنفین میں وہ متاخرین میں سے وہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، علامہ انور شاہ کشمیریؒ، علامہ سید سلیمان ندویؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا عبد الباری ندویؒ، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، مولانا عبد الماجد دریابادیؒ اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے بہت قائل تھے، اور فرماتے تھے کہ ہمارے علماء اگر ان حضرات کی کتابیں پڑھ لیں تو ان کی فکر درست ہوجائے اور ذہن صاف ہوجائیں۔

لکھنؤ میں عصر بعد کی مجلس کا سلسلہ سالوں سے چل رہا تھا، ہر طبقہ کے لوگ اس میں شریک ہوتے، علماء طلبہ سے لے کر عصری تعلیم یافتہ، عامی اور غیر پڑھے لکھے ہر طرح کے لوگ اپنے اپنے مسائل لے کر عمومی مجلس میں حاضر ہوتے تھے، بہت سے دلوں کو اپنے درد کا درماں یہیں سے مل جاتا، اس کے علاوہ خصوصی ملاقاتوں کا سلسلہ دیر رات تک جاری رہتا، لوگ ان میں اپنے اپنے مسائل پیش کرتے اور مولانا بڑی محبت سے حکمت کے موتی لٹاتے اور لوگ مطمئن ہوکر واپس جاتے۔

اوصاف وخصوصیات

تلاوت واوراد اور ذکر کا ان کا مستقل معمول تھا، سفر وحضر میں اس کا اہتمام فرماتے تھے، فجر بعد دیر تک چہل قدمی کرتے اور ذکر میں مشغول رہتے، اخیر سالوں

میں لوگوں کی آمد ورفت اتنی بڑھ گئی تھی کہ اکثر چہل قدمی کے بعد مجلس کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا، اس میں ناشتہ کا وقت ہو جاتا، فارغ ہو کر ندوہ کی تیاری کرتے۔

ناشتہ اور کھانے میں مہمانوں کا بڑا خیال رکھتے، ان کا دستر خوان وسیع تھا، روزانہ دو چار مہمانوں کا رہنا عام بات تھی، صبر و برداشت کی طاقت ان کی بہت بڑھ گئی تھی، لوگ وقت بے وقت آتے، بے ضرورت ہی دیر دیر تک بیٹھے رہتے کہ ہم لوگ اس کو محسوس کرتے تھے، مگر برادر معظم کا حال یہ تھا کہ کبھی اُف بھی زبان پر نہ آتا، ان کے ان کریمانہ اخلاق سے نہ جانے کتنے لوگوں کی کایا پلٹ ہوئی اور انھوں نے نئی زندگی شروع کی۔

ان کی دعوت وفکر کے مختلف میدان تھے، ایک طرف تحریک پیام انسانیت کا کام تھا، جس کی انہوں نے پورے ملک میں صور پھونک دی، لوگ اس کی ضرورت کو محسوس کرنے لگے اور اس کے بڑے بڑے جلسے مختلف علاقوں میں کیے گئے، پھر غیر مسلموں میں اسلام کے تعارف کے لیے ان کے خدمات بڑی ٹھوس اور بنیادی ہیں، اس کے لیے انہوں نے لٹریچر بھی تیار کرایا، افراد بھی تیار کیے، مختلف صوبوں میں وہاں کی علاقائی زبانوں کی اکیڈمیاں قائم کروائیں اور لٹریچر کو مختلف زبانوں میں منتقل کرنے کی طرف توجہ دلائی، اور یہ سب کام بڑے خفیہ طریقہ پر ہوتا رہا، اور اس طرح وہ پورے ملک میں اس کی اندر ہی اندر ایک فضا سی بن گئی۔

افراد سازی میں وہ ایک طرف فکر کی پختگی اور ذہن کی بالیدگی پر خاص توجہ دیتے تو دوسری طرف باطنی اصلاح کی ان کے یہاں بڑی اہمیت تھی، انہوں نے دونوں حیثیتوں سے افراد تیار کیے، اور اس کے لیے مستقل کوشش میں مصروف رہے، ملاقاتوں میں بھی اور خطوط کے ذریعہ بھی وہ رہنمائی کا کام کرتے رہے، فون کو بھی انہوں نے اس کا ذریعہ بنایا، کثرت سے لوگ فون کرتے اور دلی جذبات و کیفیات بیان کرتے اور مشورہ لیتے، اور وہ نرمی، بشاشت سے جواب دیتے رہتے، انہوں نے

پوری زندگی دعوت واصلاح میں گذاری، لیکن حضرت مولاناؒ کی وفات کے بعد تیرہ سال اسی طرح گذارے کہ پھران کو اپنی صحت کی بھی فکرنہیں رہی، بس صرف ایک ہی چیز کی دھن تھی کہ کس طرح پیغام ایک ایک فرد تک پہنچ جائے اور کس طرح مختلف صلاحیت رکھنے والے افراد کو دعوت واصلاح، تعلیم اور تصنیف وتحقیق کے کاموں میں لگا کران کو امت کے لیے مفید بنایا جائے۔

علالت کا تسلسل اور وفات حسرت آیات

حضرت مولاناؒ کی وفات کے بعد دوسرے ہی سال حضرت کے جانشین حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب مدظلہ کے ہمراہ مولانا نے جنوبی افریقہ کا ایک دعوتی وعلمی سفر کیا، سفر سے واپسی پران کی علالت کا سلسلہ شروع ہوا، بخار آیا پھراس کی شدت بڑھتی گئی، اس کے اترنے میں وقت لگا، اس کے نتیجہ میں کمزوری اتنی بڑھ گئی کہ مہینوں اس کا اثر رہا، اس کے بعد ذیابطیس کی بیماری لگ گئی، جس نے کمزور کر کے رکھ دیا، مگر وہ اپنے کاموں میں اسی طرح لگے رہے، گذشتہ سال ہی پورے قافلہ کے ساتھ حج پر تشریف لے گئے، اس میں اہلیہ کے علاوہ گھر کے مزید چھ افراد تھے، پورا سفر بڑی خیر وبرکت کے ساتھ پورا ہوا، وہاں بھی ان کا دعوتی مشن جاری رہا، بیانات بھی ہوئے، بیعت ہونے والوں کا سلسلہ بھی رہا، اور اجازت حدیث بھی لوگوں نے لی، جن میں بعض عرب بھی شامل تھے، مشائخ وعلماء سے ملاقاتوں کا سلسلہ بھی رہا، قیام کے آخری دنوں میں حرم کا مجمع اتنا کم ہوگیا کہ حجر اسود کا بوسہ لینا ملتزم پر پہنچنا اور حطیم میں نماز پڑھنا آسان ہوگیا، برادر معظم نے اس سے خوب فائدہ اٹھایا، اور خوب طواف کیے، اور گھر والوں کو کرائے، وہاں سے واپسی کے بعد وہ اور طاقت کے ساتھ دعوتی مشن میں لگ گئے۔

۲/ مارچ/۲۰۱۲ء کو مہاراشٹر کا بڑا کامیاب دورہ ہوا، بعض بعض جلسوں میں دس دس ہزار کا مجمع ہوتا تھا، ہزاروں غیر مسلم شریک ہوئے، اور انھوں نے اپنے بڑے تاثر کا اظہار کیا، اسی سفر سے مرض وفات کا آغاز ہوا، غالباً ناگپور میں رات کو پشت کے

بائیں طرف شدید تکلیف ہوئی، جو رات بھر رہی، لیکن اس میں بھی ان کے معمولات جاری رہے، انہوں نے اس کی پرواہ نہیں کی، واپسی کے بعد بھی اسی طرح مشغولیات رہیں، تکلیف بڑھتی گئی، دم کرنے سے کم ہو جاتی تھی، مگر رات میں کروٹ لینا مشکل ہو گیا، اور نیند کم ہوگئی، اسی میں رمضان کا مبارک مہینہ آ گیا، تکیہ دائرہ شاہ علم اللہؒ میں رمضان کے معمولات شروع ہو گئے اور انہوں نے مرض کو دوسروں پر پوری طرح ظاہر نہیں کیا، رمضان کے بعد تکلیف اتنی بڑھی کہ ندوہ میں درس کا سلسلہ موقوف کرنا پڑا اور کاندھلہ تشریف لے گئے، سحر کا اندازہ تھا، مگر وہ بیماری کی شکل بنتی جا رہی تھی، کاندھلہ میں آرام ہوا، واپسی پر مرادآباد میں اہل تعلق نے زبردستی چیک اپ (Check Up) کرایا تو الٹرا ساؤنڈ (Ultrasound) سے پتہ چلا کہ بائیں طرف کوئی گانٹھ ہے، اس سے اہل تعلق کی تشویش بڑھی، اصرار پر بمبئی کا سفر ہوا، ہر طرح کے معائنے ہوئے اور ڈاکٹروں نے سخت تشویش ظاہر کی، برادر معظم کے سامنے ساری باتیں آتی رہیں، مگر زار ونزار بدن کے اندر معلوم ہوتا تھا کہ صبر واستقامت کا کوئی پہاڑ ہے، دوسرے پریشان ہوتے، وہ سب کو سکون دلاتے اور اللہ کی ذات پر بھروسہ کرنے کی تلقین کرتے اور ایمان و یقین کی ایسی باتیں کرتے کہ اس سے حاضرین کے ایمان میں اضافہ ہوتا، محب ومکرم مولوی خالد بیگ ندوی جنہوں نے خدمت وفکر میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، ایک مرتبہ کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو جلد شفا دے تا کہ اتنا بڑا کام جو پھیلا ہوا ہے اسی طرح چلتا رہے، فرمانے لگے: کام کسی پر منحصر نہیں ہوتا، کام ہمارے بعد بھی انشاء اللہ ہوتا رہے گا، بمبئی کے پورے قیام میں لوگ آتے رہے اور مولاناؒ کی اصلاحی گفتگو کا سلسلہ جاری رہا، عید الاضحیٰ سے ایک روز پہلے واپسی ہوئی، تکیہ میں قیام ہوا، مگر تکلیف میں کوئی افاقہ نہیں تھا، ہومیو پیتھک علاج شروع ہوا، یونانی دوائیں بھی چلتی رہیں، علاج کے لیے کئی سفر بھی ہوئے، بیچ بیچ میں ذرا سکون بھی ہو جاتا تھا مگر مرض بڑھتا گیا، عید الاضحیٰ کے بعد سے غذا برائے نام رہ گئی، پورے پورے دن میں دو چار چمچہ یا

دوایک پیالی کوئی مشروب لے لیتے تھے، اس کے نتیجہ میں کمزوری بڑھتی گئی، مگران کی حمیت وعزیمت کا حال یہ تھا کہ جب تک جاسکے مسجد جاتے رہے، کمزوری بہت بڑھ گئی تو قیام گاہ میں جماعت کے ساتھ اہتمام سے ہرنماز پڑھنے لگے لیکن نماز کھڑے ہوکر پڑھتے حالانکہ اٹھنے میں شدید تکلیف ہوتی تھی، جب اٹھنا ناممکن ہوگیا تو بیٹھ کر نماز پڑھنے لگے جس کا سلسلہ وفات تک جاری رہا، بیٹھنے میں بھی جب تکلیف ہونے لگی تو ہم لوگوں نے بہت کہا کہ لیٹے لیٹے نماز پڑھ لیں لیکن کسی صورت میں راضی نہیں ہوئے، نہ بیٹھ کر نماز پڑھنا چھوڑا، نہ جماعت چھوڑی، یہاں تک کہ اسپتال کے ایک ہفتہ کے قیام میں بھی اس پر عمل رہا، جس دن وفات ہوئی اس دن بھی فجر کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کی اور ساڑھے نو بجے کے قریب قرآن مجید سننے لگے، تقریباً ایک گھنٹہ اسی میں گذرا اور ساڑھے دس بجے سے پہلے پہلے روح پرواز کرگئی، ایک ہچکی سی آئی، حاضرین نے سورہ یٰسین شروع کی کسی نے کلمہ طیبہ کا ورد شروع کیا بس یٰسین شریف ختم ہوئی اور انہوں نے آخری سانس لی، إنا للہ و إنا إلیه راجعون۔

بیماری کے تین مہینے انہوں نے جس ثبات واستقامت کے ساتھ گذارے اس کی مثال ملنی مشکل ہے، کبھی ایک حرف بھی شکایت کا زبان پر نہیں آیا، وفات کی رات تک جب کسی نے پوچھا: طبیعت کیسی ہے؟ فرمایا ماشا اللہ بہتر ہے۔ اور انتقال سے ایک دوروز پہلے ہی اہلیہ سے فرمایا کہ الحمد للہ کی ایک تسبیح روز پڑھا کرو۔ اپنی حالت پوری طرح سمجھنے کے بعد بھی کبھی انہوں نے مایوسی ظاہر نہیں ہونے دی، البتہ دوسال سے بعض باتیں ان کی ایسی ہوتی تھیں جن سے لگتا تھا کہ ان کو اپنے وقت کے قریب ہونے کا احساس ہے لیکن وہ مایوسی کی باتیں کرکے اہل تعلق کو غمگین دیکھنا نہیں چاہتے، اور نہ یہ چاہتے تھے کہ لوگ ان کی بیماری میں مشغول ہوکر اپنے کام چھوڑ دیں، لوگ آکر بیٹھ جاتے تو ان کو یہی مشورہ دیتے کہ اپنا اپنا کام کریں، بے ضرورت وقت ضائع نہ کریں، فون پر دور دور سے اہل تعلق آنے کی اجازت چاہتے تو ان کو بھی منع کردیتے

اور فرماتے کہ وہیں رہ کر دعا کریں اور اپنے اپنے کام میں لگے رہیں۔

نماز بیٹھ کر پڑھتے تو ان کو شدید تکلیف ہوتی، حضرت مولانا افتخار الحسن کاندھلوی دامت برکاتہم سے ملاقات میں فرمایا کہ نماز کے لیے دعا کردیں کہ وہ سکون سے ہو جایا کرے، جہاں تک ہوسکا زبان سے ذکر و دعا میں لگے رہے، جب بولنا بھی مشکل ہوگیا تو ذکر خفی جاری رہا اور ہر ہر سانس سے لفظ اللہ ادا کرتے رہے، خود بھی ایک روز عزیزی عبداللہ سلمہ سے فرمانے لگے کہ ذکر خفی کی مشق اب کام آرہی ہے، آخر میں راقم سطور نے خود ان کی سانسوں میں ذکر کو صاف محسوس کیا، ہر سانس کے ساتھ لگتا ہے کہ اسم جلالہ ادا ہو رہا ہے۔

ان کو نماز باجماعت کا اہتمام ہمیشہ رہا، شدید بیماری کے تین مہینہ میں ان کی کوئی نماز جماعت سے نہیں چھوٹی، شدید تکلیف کے باوجود جمعہ کے لیے مسجد تشریف لے جاتے رہے، صرف آخری جمعہ کو جب کہ معذوری اس حد تک ہوگئی تھی کہ پیر ہلانا بھی مشکل ہوگیا تھا، جمعہ کی نماز کے لیے نہ جاسکے مگر پوچھتے رہے کہ جانے کی کوئی صورت ہو تو بتاؤ مگر ظاہر ہے یہ ممکن نہ تھا، سب ساتھی بدل بدل مختلف مسجدوں میں جمعہ پڑھ آئے، وہی ایک نماز تھی جو ان کو تنہا ادا کرنی پڑی، اس آخری جمعہ کو حجام کو بلایا، حجامت بنوائی، کپڑے بدلوائے، اور حسب استطاعت جمعہ کی تیاری کی، مگر کمزوری اتنی بڑھ چکی تھی کہ مسجد جانا ممکن نہ تھا، محبین و اہل تعلق یہ سب خدمت انجام دیتے، اور خدمت میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے میں کوشش میں رہتے، اس کیفیت کو دیکھ کر سحر نرسنگ ہوم کے مالک ڈاکٹر غوث صاحب کہنے لگے، کہ اصل بادشاہت تو یہ ہے کہ دلوں پر حکومت ہو، یہ چیز اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں ہی کو دیتا ہے۔

سنتوں کا اہتمام ہمیشہ رہا، بیماری کے زمانہ میں بھی اگر غلطی سے کوئی موزہ اتارتے وقت پہلے دائیں پیر کا اتارنے لگتا تو کمزوری کے باوجود پاؤں کھینچنے لگتے اور حسب مقدور تنبیہ بھی فرماتے، مہمانوں کا اکرام مزاج میں داخل تھا، سخت بیماری میں بھی یہ اہتمام رہا، سحر نرسنگ ہوم کے ایک ہفتہ کے قیام میں آنے والوں کا تانتا

بندھ گیا، بولنا مشکل تھا، مگر ہر آنے والوں کے لیے ہاتھ بڑھا دیتے اور مصافحہ کرتے اور خیریت پوچھتے۔

بیماری کے دنوں میں سب سے زیادہ خدمت عزیز القدر میاں عبداللہ پرتا بگڈھی سلمہ نے کی، جن کو برادر معظم سے بڑی عقیدت و محبت تھی، برادر معظم بھی ان کا ایسا خیال رکھتے تھے جیسے کوئی فرزند کا کرتا ہے، اسلام لانے کے بعد ہی سے وہ برادر معظم کے ساتھ رہنے لگے، پھر سفر و حضر کے رفیق بن گئے تھے، اللہ تعالیٰ ان کے ایمان و صحت و عمر میں برکت عطا فرمائے۔ ان کے علاوہ عزیزان گرامی مولوی نظار الاسلام ندوی اور مولوی رضوان نستار ندوی نے بھی خدمت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، اخیر میں عزیزان مولوی جمال احمد ندوی اور شفیق سیتا پوری نے بھی بڑی خدمت کی، اللہ تعالیٰ ان سب چاہنے والوں اور خدمت کرنے والوں کو جزائے خیر عطا فرمائے، بعض اہل نسبت بزرگوں نے یہ بات کہی کہ ان دنوں میں مولاناؒ پر اللہ کی خاص رحمت ہے اور ان کا قرب بڑھتا جا رہا ہے، اس وقت جو بھی مولاناؒ کی خدمت کرے گا اللہ تعالی اس کو بھی اپنی خاص رحمت میں لے لیں گے۔

آخری رات راقم بھی ساتھ میں رہا، تقریباً ہر ہر گھنٹے پر زم زم طلب فرماتے اور خلاف معمول آدھی ایک پیالی پی بھی لیتے، حالانکہ دو دنوں سے کسی چیز کا آدھی پیالی پینا بھی بہت مشکل ہو گیا تھا، یہ دیکھ کر اطمینان ہو رہا تھا کہ ماشاء اللہ طبیعت میں افاقہ ہے مگر دو تین دنوں سے ایک نئی بات یہ دیکھنے میں آرہی تھی کہ بار بار سامنے دیکھتے اور ہاتھ بڑھانے لگتے کہ کسی کا استقبال کر رہے ہیں، پوچھنے پر کوئی جواب نہ دیتے، سب کچھ ہونے کے بعد بھی دل یہ کہتا تھا کہ شاید ٹھیک ہو جائیں گے، مگر اللہ کا فیصلہ یہی تھا، اور شاید یہی وجہ تھی کہ جو کام سالوں میں ہوتا ہے، وہ اس کو مہینوں میں کر رہے تھے، لگتا تھا کہ وہ بہت جلد سب کچھ کر کے اپنے مالک کے حضور میں پہنچ جانے کی تیاری میں ہیں، جو ہونا تھا وہ ہو گیا، خبر بہت تیزی کے ساتھ پھیل گئی، لوگ سحر نرسنگ ہوم کے سامنے جمع ہونے لگے، جنازہ خاتون منزل لایا گیا، وہاں بھی خبر ہو چکی تھی، ظہر بعد

غسل دیا گیا اور پہلی نماز جنازہ ندوہ میں ہوئی جو والد صاحب کے رفیق خاص مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی نے پڑھائی، ازدحام اتنا تھا کہ میدان پورا بھرا ہوا تھا، شاید عرصہ دراز کے بعد اتنا مجمع دیکھنے میں آیا ہوگا، مغرب بعد رائے بریلی روانگی ہوئی اور تکیہ پر رات تقریباً دس بجے حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ کی اقتدا میں نماز جنازہ ادا کی گئی اور حضرت سید احمد شہیدؒ کے دادا حضرت سید محمد ہدیٰ کے پہلو میں تدفین عمل میں آئی، اس طرح دعوت واصلاح کا وہ ماہتاب غروب ہو گیا جس سے ہزاروں لوگوں نے راستہ پایا اور وہ اپنی منزل کو پہنچے۔

رائے بریلی میں بھی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے جنازہ کے علاوہ اتنا بڑا ازدحام نہیں دیکھا گیا، لوگوں کی کثرت کی وجہ سے جنازہ مسجد کے صحن میں رکھنا پڑا، مٹی دینے والوں کا سلسلہ گھنٹوں چلتا رہا، پھر آنے والوں کا جو سلسلہ شروع ہوا تو وہ تادم تحریر جاری ہے، لوگوں نے جس طرح اپنے تعلق اور محبت کا مظاہرہ کیا اس سے ان کی ایسی محبوبیت ومقبولیت سامنے آئی جو خاصان خدا کا خاصہ ہے اور یقیناً یہ ان کی امت کے لیے درد وفکر اور کڑھن کا نتیجہ تھا جو اللہ تعالیٰ نے ودیعت فرمائی تھی، جانے والا چلا گیا مگر اپنے پیچھے ایک مشن چھوڑ گیا، انہوں نے دعوت دین کا جو پورے ملک میں کام کیا اور اس کی بنیادیں جس طرح کھڑی کردیں وہ سب کام کرنے والوں کو دعوت فکر وعمل دے رہی ہیں، یہ چنگاری ان کے اندر مولانا ڈاکٹر عبدالعلی صاحب سے منتقل ہوئی جن کو اس کام کا بڑا جذبہ تھا، اس کے لیے انہوں نے بعض افراد کو لگایا بھی تھا اور خود بھی غریبوں کی بستیوں میں تشریف لے جاتے ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے اور ان کو قریب کرنے کی کوشش کرتے، اس زمانہ کے متعدد کلمہ پڑھنے والے ہیں جو بعد میں ترقی کر کے مختلف مناصب تک پہنچے۔

پسماندگان

مولانا نے دو غمزدہ بھائیوں کے علاوہ اہلیہ اور ایک فرزند چھوڑا، بیماری ہی کے

زمانہ میں انہوں نے بڑے اہتمام سے فرزند کے حفظ قرآن کی تکمیل پر اہل تعلق کو جمع کیا، خود وہ بستر سے اتر کر بیٹھے اور حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ نے ختم کی مناسبت سے دعا کرائی اور برادر معظم نے بڑی خوشی کا اظہار کیا، اللہ تعالیٰ عزیز از جان محمد میاں سلمہ کو اپنے اسلاف کا جانشین بنائے اور طویل عمر عطا فرمائے، ہدایت و سعادت کے لیے قبول فرمائے، اہلیہ صاحبہ کو صبر جمیل عطا فرمائے اور فرزند کو ان کی اور تمام خاندان والوں کی آنکھوں کا نور بنائے۔ اور جن لوگوں کو ان کے ذریعہ ہدایت ملی اور جو ان کے دامن تربیت سے وابستہ تھے انھیں اوج کمال کو پہنچائے اور ان سب کو ان کے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے۔

ذخیرۂ حسنات

ایصال ثواب کا جو اہتمام کیا گیا وہ بھی شاید و باید ہی ہوتا ہے، بیسیوں عمروں کی اطلاع ملی، طواف بے شمار ہوئے، تلاوت قرآن مجید اور صدقات وخیرات کا اہتمام ہر جگہ کیا گیا، یقیناً یہ سب چیزیں ان کے لیے ذخیرہ حسنات ہیں اور سب سے بڑھ کر خود ان کا درد و سوز جو شاید اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ عزیز ہے، ان کی ترقی درجات کا ذریعہ ہوگا، متعدد مبشرات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے اور یقیناً جو اللہ کا ہو جاتا ہے اللہ اس کا ہو جاتا ہے، اللہ تعالیٰ برادر معظم کے درجات کو بڑھاتا جائے اور ان کے شروع کیے ہوئے کاموں کو ان کے لیے صدقہ جاریہ فرمائے اور پوری دنیا خاص طور پر ہندوستان میں اس کو ہدایت وسعادت کا ذریعہ فرمائے اور اس کے لیے مخلصان کار عطا فرمائے۔